# مختصر
# تاریخ ادب اُردو

بعد مزید ترمیم و اضافہ

پروفیسر ڈاکٹر سید اعجاز حسین صاحب
ایم اے ڈلٹ
صدر شعبۂ اُردو الہ آباد یونیورسٹی

آزاد کتاب گھر کلاں محل دہلی

# عرضِ حال

اُردو پڑھتے پڑھاتے وقت اکثر یہ کمی محسوس ہوئی کہ اس زبان میں تاریخ ادب پر کوئی ایک ایسی کتاب نہیں جو اس کی ابتدائے آفرینش سے آج تک کا حال بتا سکے کوئی کتاب امیر و داغ کے واقعات تک پہنچتے پہنچتے خاموش ہو جاتی ہے اور اگر کوئی چند قدم آگے بڑھتی بھی ہے تو موجودہ دور کے سرکاروں کا ذکر کیا ہے شعراء کی بھی خاصی تعداد یہ انفرادی حیثیت سے کوئی تبصرہ و تنقید نہیں ہوئی اور شاید ایسی تو اس وقت تک کوئی کتاب ہی نہیں تو تاریخی لحاظ سے سرکاری کے سلسلہ میں موجودہ دور کے طرز تحریر وغیرہ پر روشنی ڈال سکے

اس کمی کی تکمیل صرف انٹرمیڈیٹ اور بی اے کے طلبا تک محدود نہ تھی ایم اے کے طلبا نے بھی بارہا تکلیف کے ساتھ اسی بات کو کہا بلکہ سچ پوچھئے تو اور خاص طبقوں میں بھی اس قلت کا تذکرہ اکثر زبان اور قلم سے ہو رہا ہے اسی کمی کو پورا کرنے کے لیے میں نے قلم اٹھایا' میری کامیابی، ناکامیابی' کتاب کی خوبی و خرابی کا فیصلہ بالکل پڑھنے والوں کی رائے پر ہے۔ مجھے کسی بات پر اصرار نہیں نہ کچھ بتانا ہے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ جس کمی کو پورا کرنے کی میں نے کوشش کی تھی وہ پورے طور پر آپ کی خدمت میں پیش کر سکا اور اس احساس پر مسرت بھی ہے لیکن اس کی حسرت بھی رہ گئی کہ اختصار کی وجہ سے بہت سی ایسی باتوں کو نظر انداز کرنے پر مجبور کر دیا جس کے لکھنے کے لئے بہت جی چاہتا تھا

اُردو زبان کے مختلف اور ارتقا کے متعلق مختلف نظریے جو مختلف ارباب قلم نے مختلف کتابوں کو دیکھتے ہوئے کہا ہے کہ مجھے خود تسلی نہیں ہوئی اور سچ پوچھئے تو میں بھی طرح کے متعلق کسی قطعی نتیجہ پر اس وقت تک نہیں پہنچا تھا جب اس کتاب کا ابتدائی حصہ پریس بھیجا گیا اگر ممکن ہوا تو دوسری دوسری تصنیف کا انتظار فرمائیے جو اُردو زبان کی ابتدا و طرح اور ارتقا کے لئے

مخصوص وکی شاید وہ کسی فیصلہ کن نتیجہ پر پہنچنے کے لئے سہارا دے سکے یہاں اس امر پر کسی تفصیلی بحث کی گنجائش نہیں

اس مختصر تاریخ ادب اردو میں اختصار کا پہلو حالات زندگی لکھتے وقت اور تنقید کلام کے موقع پر بھی مدنظر رہا ہے تنقید میں قریب قریب ہر جگہ اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ مصنف کی کوئی امتیازی خصوصیت نظر انداز نہ ہو لیکن بات کو بڑھایا بھی نہ جائے اگر ممکن ہو تو پارہ کو جملہ میں اور جملہ کو چند لفظوں میں پر معنی طریقہ سے بیان کر دیا جائے بعض انگریزی داں طبقہ میں اردو ادب کی تاریخی و تنقیدی کتابوں پر یہ بھی اعتراض تھا کہ اردو والے تنقید کے وقت چند الفاظ چن لیتے ہیں اور ہر شاعر یا ناول نویس کے کلام پر ترتیب بدل کر وہی الفاظ لکھ دیتے ہیں گویا یہاں امتیازی خصوصیت ہے ہی نہیں یہ اعتراض سراسر بالکل صحیح ہے سراسر بالکل غلط، بعض کتابیں ایسی ہیں کہ جن کو پڑھ کر ان مصنفین کی انفرادی حیثیت کا اندازہ کر سکتے ہیں لیکن بعض ایسی بھی ہیں جن سے اس قسم کا کوئی اندازہ نہیں ہوتا میں نے غالباً ہر موقع پر اس کا خیال رکھا ہے کہ ہر مصنف کی امتیازی خصوصیت نمایاں ہو جائے

یہ کتاب اب سے دو سال پہلے شائع ہو چکی ہوتی مگر لوگوں کے حالات زندگی کی فراہمی میں اتنی دقتیں پیش ہوئیں کہ شاید کتاب لکھنے میں اتنی مصیبتوں سے دوچار نہیں ہونا پڑا خود بھی خط لکھے دوسروں سے بھی لکھوائے مگر بہت کم حضرات نے اتنی زحمت گوارا کی کہ اپنے حالات زندگی لکھ کر دے دیتے مجھے شاید اس کی شکایت کم ہوتی کہ حالات زندگی لوگوں نے دینا پسند نہیں کئے اس کی خیر ہے ان کو اختیار ہے، دقت تو یہ ہوتی تھی کہ لوگ تحریری و زبانی برابر وعدہ کرتے تھے کہ انشاء اللہ بہت جلد سوانح عمری بھیج دوں گا مگر یہ "انشاء اللہ" بھی "وعدۂ فردا" ثابت ہوا اور مجھے اسفار میں اس قدر زحمتیں اٹھانا پڑیں یہ تحریر اتنا تلخ ہوا کیا کہ ان رکھ کر یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ جن حضرات کے حالات زندگی بہت آسانی سے مل جاتے ہیں ان کی سوانح عمری لکھی جائے مگر اس سلسلہ میں ان حضرات سے ندامت کے ساتھ معافی کا خواستگار ہوں جن کو میں نے سوانح عمری بھیجنے کی زحمت نہیں دی اور کتاب میں بھی نہیں لکھ سکا

مورخ ادب کے کلام کی ترتیب میں کوئی التزام نہیں رکھا گیا جس مصنف کے متعلق مواد

جمع ہوتا گیا پریس میں بھیج دیا گیا بعض ایسے شعراء کا ذکر لکھنے سے رہ گیا ہے جن کے متعلق مجھے لکھنا چاہیئے تھا مگر افسوس ہے کہ باوجود تلاش کے اُن کا کلام اتنی مقدار میں دستیاب نہ ہو سکا کہ رائے قائم کرنے کے لئے کافی ہوتا اگر ممکن ہوا تو آئندہ ایڈیشن میں انشاء اللہ تلافی کر دی جائے گی فی الحال معذور سمجھ کر مجھے معاف کر دیا جائے

تحریر سے یہ معلوم ہوا کہ تاریخ لکھنا شاید ایک آدمی کے بس کی بات نہیں مجھے ایسے چند خاص احباب و کرم فرما کا ثمرہ احسان ہوتا ہے جن میں ایک ذات تو ایسی ہے کہ جس کے ابرِ کرم کی بارش سے اکثر میری کشتِ اُمید کو سرسبز ہونے کے لئے زیرِ مارمت ہوتا ہے صاحب علی صاحب قبلہ میرے لئے صرف صدرِ شعبۂ اُردو ہی نہیں بلکہ استاد و شفیق بزرگ بھی ہیں جن کے لئے میری رہ نمائی فرض ہو یا نہ ہو مگر اُن کی طبیعت کسی حال میں یہ گوارا نہیں کر سکتی کہ ان کے امکان میں ہو اور راہِ بہبودی دوری میں میرے ہاتھ ادب کو تعرض ہو جائے اس کتاب کے سلسلہ میں جب کبھی میں نے کسی امداد کی درخواست کی ہے بہاں فراخ دلی اور ہمت افزائی کے ساتھ آپ نے توجہ فرما کر میری مشکل حل کرنے کی کوشش کی ہے آپ کی ذات اور دل قدر کتاب "تاریخ ادب در زبانِ اُردو" سے میں نے جو فائدہ اُٹھایا ہے اُس کا بے حد ممنون ہوں

اسی سلسلہ میں ایسے دوست پروفیسر رگھوپتی سہائے صاحب فراق کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جن کی معرفی فن تنقید کی معلومات نے میرے زیرِ تک کتاب میں اصولِ تنقید کے لحاظ سے بہت کچھ دلکشی میں اضافہ کر دیا ہے موصوف نے ہر موقع پر جب کبھی میں نے تکلیف دی ہے نہایت ہی حد درجہ پیشانی و کشادہ دلی کے ساتھ لبیک کہا اُن کی قیمتی رائے اور دوستی کا اعتراف نہ کرنا میرے لئے ممکن نہیں عالباً آپ کا یہ احسان میں کبھی بھول نہ سکوں گا

ایک بزرگ کا شکریہ ادا کر چکا ایک بزرگ کے دوست کی عنایتوں کا بھی ذکر کر چکا ایک مشکل سوال میرے لئے یہ ہے کہ اپنے چھوٹوں کا شکریہ کیونکر ادا کروں اول تو دنیا نے کوئی طریقہ اس کا مقرر نہیں کیا اگر کیا بھی تو میں نے سیکھا نہیں اور پھر دوسری دقت

یہ ہے کہ جن لوگوں کا شکریہ ادا کر رہا ہے ان کی عیور طبیعت یہ بھی تو گوارا نہیں کرتی کہ میں شکریہ ادا کروں مگر میرا ضمیر مجھے مجبور کرتا ہے کہ ان لوگوں کا کم سے کم ذکر تو کر ہی دوں۔ میرے چند عزیز شاگرد جن کو اب دوست بھی سمجھنا چاہیے، اس تصنیف میں ہر وقت میرا ہاتھ بٹاتے رہے۔ سید حامد حسن صاحب بلگرامی ایم اے، سید وقار عظیم صاحب ایم اے، سرج اسکالر اور سید حشام حسین صاحب بی اے جس محنت و محبت کے ساتھ اس کتاب کے لیے جاں فشانی اٹھاتے رہے وہ صرف قابل قدر ہی نہیں بلکہ میرے لئے مایۂ ناز بھی ہے۔ ان کی سعادت مندی و قابلیت اور ادبی شغف کو دیکھ کر بے ساختہ دل سے دعا نکلی ہے کہ خدا ہر استاد کو ایسے شاگرد نصیب کرے۔ ان لوگوں نے نہ صرف پروف ہی پڑھا بلکہ مواد بھی اکٹھا کیا اور جا بجا مضمون کی ترتیب دیئے۔ ان تمام باتوں کا احساس خود ہی جگہ جگہ پر ایک شکریہ ہے۔ اب میں ان کی خاطر سے اگر شکریہ یا اس قبیل کا کوئی لفظ بھی استعمال کروں تو پڑھنے والے میرا مطلب خود سمجھ لیں گے۔

آج اردو ادب کے ہر مورخ کو تہ دل سے اس کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ اس دلچسپ مگر دشوار کام میں وہ اپنے پیش رو متعدد تذکرہ نویسوں اور ان کے بعد اردو ادب کے پہلے مورخین و نقادوں کا ممنون احسان ہے۔ مجھے بھی فرض شناسی مجبور کرتی ہے کہ اس سلسلہ کے اہل قلم کا دل سے شکریہ ادا کروں کیونکہ جس طرح ادب اسی روایات و سرمایۂ قدیم کا سہارا لے کر آگے بڑھتا ہے اسی طرح تنقید و تاریخ ادب بھی اپنے پہلے کے مواد و مثال کو پیش نظر رکھ کر ہی سے لے کر لی ہے۔

نیمیں۔ الہ آباد
۱۴ نومبر ۱۹۴۱ء

اعجاز حسین

# فہرست مضامین

## حصۂ نظم


| | | |
|---|---|---|
| ۱ عرض حال | | ۳ |
| باب ۱ | | |
| ۲ رہاں کی ابتدا | | ۱۱ |
| ۳ شاہ میراں جی | | ۲۱ |
| ۴ شاہ رہاں الدین جانم | | ۲۲ |
| ۵ ۔ نصرتی | | ۲۲ |
| ۶ ہاشمی | | ۲۳ |
| ۷ سیوا | | ۲۴ |
| ۸ قطب شاہی دور | | ۲۴ |
| ۹ محمد قلی قطب شاہ | | ۲۵ |
| ۱۰ ۔ وجہی | | ۲۶ |
| ۱۱ محمد قطب شاہ | | ۲۷ |
| ۱۲ ۔ شوقی | | ۲۷ |
| ۱۳ ۔ عبداللہ قطب شاہ | | ۲۷ |
| ۱۴ غواصی | | ۲۸ |
| ۱۵ ابن نشاطی | | ۲۹ |
| ۱۶ ابوالحسن تانا شاہ | | ۲۹ |
| ۱۷ فائز | | ۲۹ |
| ۱۸ بحری | | ۳۰ |
| ۱۹ ۔ اشرف | | ۳۱ |
| ۲۰ ولی | | ۳۱ |
| ۲۱ دکن کی ابتدائی خدمات | | ۳۵ |
| باب ۲ | | |
| ۲۲ شمالی ہند | | ۴۳ |
| ۲۳ رحیم | | ۴۴ |
| ۲۴ فائز دہلوی | | ۴۵ |
| ۲۵ آبرو | | ۴۶ |
| ۲۶ ناجی | | ۴۸ |
| ۲۷ مضمون | | ۴۹ |
| ۲۸ یک رنگ | | ۵ |
| ۲۹ آزرد | | ۵۱ |
| ۳۰ عمدۃ الملک امیر خاں انجام | | ۵۳ |
| ۳۱ دور کی خصوصیات | | ۵۵ |
| باب ۳ | | |
| ۳۲ حاتم | | ۵۸ |
| ۳۳ مضمون | | ۶۰ |

۲۴ مظہر جانِ جاناں ۶۲
۲۵ دور کی خصوصیات ۶۵
باب ۴
۲۶ سودا ۶۶
۲۷۔ درد ۷۱
۲۸ سوز ۷۳
۲۹ حسن ۷۴
۳۰۔ میر ۷۵
۳۱ یقین ۷۹
۳۲۔ دور کی خصوصیات ۸۱
باب ۵
۳۳ جرأت ۸۴
۳۴۔ انشاء ۸۷
۳۵ مصحفی ۸۹
۳۶۔ اثر ۹۲
۳۷۔ دور کی خصوصیات ۹۳
باب ۶
۳۸ نظیر اکبر آبادی ۹۵
باب ۷
۳۹ ناسخ ۹۹
۵ آتش ۱۱
۵۱۔ دیا شنکر نسیم ۱۵
۵۲ نصیر ۱۸
۵۳ ذوق ۱۹
۵۴ غالب ۱۱۲
۵۵ مومن ۱۱۵
۵۶۔ دور کی خصوصیات ۱۱۷
باب ۸
۵۷ امیر ۱۱۸
۵۸۔ داغ ۱۲۱
۵۹۔ حالی ۱۲۲
۶ دور کی خصوصیات ۱۲۵
باب ۹
۶۱ مرثیہ ۱۲۶
۶۲ دبیر ۱۲۸
۶۳ انیس ۱۲۹
باب ۱
۶۴ دورِ جدید ۱۳۲
۶۵ آزاد ۱۳۳
۶۶۔ حالی ۱۳۵
۶۷۔ اسمٰعیل ۱۳۷
۶۸ سرور ۱۴
۶۹ سورج نرائن مہر ۱۴۲
۷۰۔ لوت رائے نظر ۱۴۴
۷۱ اکبر ۱۴۶
۷۲ شاد ۱۴۸

۷۳ نظم طباطبائی ۱۵۰

باب ۱۱

دورِ حاضر

۷۴ عزیز ۱۵۵
۷۵ رواں ۱۵۶
۷۶ ۔ چکبست ۱۵۸
۷۷ ۔ اقبال ۱۶۰
۷۸ حسرت موہانی ۱۶۳
۷۹ فانی بدایونی ۱۶۶
۸۰ ۔ ناصری ۱۶۸
۸۱ ۔ صائمس ۱۷۲
۸۲ اثر ۱۷۶
۸۳ ۔ خلیل ۱۷۷
۸۴ ۔ جوش ۱۷۹
۸۵ صفی لکھنوی ۱۸۲
۸۶ تاقب لکھنوی ۱۸۵
۸۷ ۔ طریف ۱۸۷
۸۸ آزرد ۱۸۹
۸۹ ریاض ۱۹۲
۹۰ اصغر ۱۹۶
۹۱ جگر ۱۹۹
۹۲ ساحل دہلوی ۲۰۱
۹۳ یاس ویگانہ ۲۰۵
۹۴ ۔ فراق ۲۰۸
۹۵ مخدوم ۲۱۰
۹۶ اسد رائس ملا ۲۱۲
۹۷ ۔ حفیظ جالندھری ۲۱۴
۹۸ ۔ سیماب ۲۱۵
۹۹ ۔ مظفر واسطی ۲۱۷
۱۰۰ ۔ مختار ۲۱۸
۱۰۱ ۔ روش ۲۲۰
۱۰۲ ۔ احسان دانش ۲۲۱
۱۰۳ اختر شیرانی ۲۲۳
۱۰۴ فیض ۲۲۵
۱۰۵ علی سردار جعفری ۲۲۷
۱۰۶ ۔ احمد ندیم قاسمی ۲۲۹
۱۰۷ واثق ۲۳۱
۱۰۸ موجودہ دور کی خصوصیات ۲۳۳


## حصۂ نثر


باب ۱

۱۰۹ ۔ ترکی تاریخ ۲۳۷
۱۱۰ ۔ فورٹ ولیم کالج ۲۴۱
۱۱۱ ۔ مرزا علی لطف ۲۴۲
۱۱۲ ۔ میر امن دلّو لال جی ۲۴۴
۱۱۳ میر میر علی انسؔ ۲۴۵

۱۱۴ سید حیدر بخش حیدری ۲۴۶

۱۱۵ بہاری چند لاہوری } ۲۴۸
۱۱۶ مرزا کاظم علی حیران }

۱۱۷ مظہر علی خاں ولا ڈپٹی کلکٹر ۲۴۹

باب ۲

فورٹ ولیم کالج سے باہر

۱۱۸ فقیر محمد خاں گویا ۲۵

۱۱۹ مرزا رجب علی بیگ سرور ۲۵۲

۱۲۰ غالب ۲۵۳

۱۲۱ ماسٹر رام چندر ۲۵۴

۱۲۲ غلام امام شہید ۲۵۵

۱۲۳ غلام غوث بیخبر ۲۵۶

باب ۳

شرکی نثر

۱۲۴ سرسید ۲۶

۱۲۵ محسن الملک ۲۶۳

۱۲۶ چراغ علی ۲۶۴

۱۲۷ آزاد ۲۶۶

۱۲۸ ذکاء اللہ ۲۶۹

۱۲۹ حالی ۲۷

۱۳۰ سید علی بلگرامی ۲۷۲

۱۳۱ شبلی ۲۷۳

باب ۴

مقالات وصحافت

۱۳۲ عبدالماجد دریابادی ۲۷۸

۱۳۳ سید سلیمان ندوی ۲۸

۱۳۴ خواجہ حسن نظامی ۲۸۲

۱۳۵ ابوالکلام آزاد ۲۸۶

۱۳۶ نصیر حسین خیال ۲۸۸

۱۳۷ ظفر علی خاں ۲۹

باب ۵

۱۳۸ تنقید ۲۹۳

۱۳۹ حکمت ۲۹۴

۱۴۰ عبدالحق ۲۹۶

۱۴۱ نیاز ۲۹۷

۱۴۲ مسعود حسن ۲۹۹

۱۴۳ محی الدین زور ۳۰۱

۱۴۴ احتشام حسین ۳۰۳

۱۴۵ عبدالستار شادانی ۳۰۵

۱۴۶ آل احمد سرور ۳۰۷

۱۴۷ وقار عظیم ۳۰۹

۱۴۸ ممتاز حسین ۳۱۱

باب ۶

ناول

۱۴۹ نذیر احمد ۳۱۴

۱۵ سرشار ۳۱۷
۱۵۱ تمرّد ۳۲۰
۱۵۲ سجاد حسین ۳۲۳
۱۵۳ رسوا ۳۲۵
۱۵۴ راشد الخیری ۳۳
باب ۷
۱۵۵ مخمر السامہ ۳۳۳
۱۵۶ پریم چند ۳۳۵
۱۵۷۔ سدرشن ۳۳۸
۱۵۸ سجاد حیدر یلدرم ۳۴
۱۵۹ سلطان حیدر جوش ۳۴۲
۱۶۰ محوی ۳۴۳
۱۶۱ خلیل قدوائی ۳۴۵
۱۶۲ علی عباس حسینی ۳۴۷
۱۶۳ اعظم کریوی ۳۵
۱۶۴ اختر رائپوری ۳۵۲
۱۶۵ کرشن چندر ۳۵۴
۱۶۶ سعادت حسن منٹو ۳۵۶
باب ۸
۱۶۷ مزاحیہ افسانے ۳۵۹
۱۶۸ لیطرس ۳۶
۱۶۹ عظیم بیگ چغتائی ۳۶۳
۱۷۰ فرحت اللہ بیگ ۳۶۵
۱۷۱ رشید احمد صدیقی ۳۶۶
۱۷۲ ملّا رموزی ۳۶۸
۱۷۳ شوکت تھانوی ۳۷۰
۱۷۴ کنھیا لال کپور ۳۷۱
۱۷۵۔ اختتام ۳۷۵

(۱)

# زبان کی ابتدا

دو یا کئی زبانوں کے میل جول سے کبھی کبھی ایک نئی زبان پیدا ہو جاتی ہے مگر دو چار سال میں نہیں بلکہ صدیوں میں اُردو زبان بھی اس قاعدے سے مستثنیٰ نہیں عربی فارسی اور ہندوستانی زبانوں کے باہمی اختلاط سے اس کا وجود ظہور میں آیا

ہندوستان میں آریہ قوم تقریباً ۱۵۰ قبل مسیح آئی یہاں ڈراوڈی قوم کا غلبہ تھا جو اُن سے بہت پہلے ہندوستان آچکے تھے آریاؤں نے ڈراوڈوں کو دھکیل کر پیچھے کر دیا اور اُن کو مغلوب کر کے ۱۵۰ قبل مسیح تا ۶۰ قبل مسیح شمالی ہندوستان میں پنجاب سے بنگال تک پھیل گئے ہندوستان میں پہلے ہی سے مختلف علاقوں میں محلہ بولیاں تھیں آریہ لوگ جب تک محدود علاقہ میں رہے اُن کی زبان اپنی جگہ پر قائم رہی لیکن جیسے جیسے وہ پھیلتے گئے زبان میں فرق آتا گیا کچھ آب و ہوا کی وجہ سے کچھ دوسری زبانوں کے میل جول سے تلفظ اور الفاظ میں رد و بدل ہوتا گیا یہاں تک کہ اصلی زبان کی مرکزی حیثیت بہت کم رہ گئی ۶۰ قبل مسیح تک کوشش ہوئی کہ زبان کو منظم کر کے ایک حیثیت دے دی جائے اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے اصول یہ رکھا گیا کہ مقامی تعصبات سے الگ ہو کر صرف ایسے الفاظ کو ٹکسالی بنایا جائے جو سب جگہ رائج ہوں اس اصول پر کاربند ہو کر لوگ ایک خاص ٹکسالی زبان استعمال کرنے لگے اور یہ زبان پاک صاف ہو کر سنسکرت کہلائی سنسکرت کو بڑا عروج ہوا مگر ترقی کے ساتھ ساتھ اس میں ادبیت اتنی زیادہ آتی گئی

کہ عوام سے الگ ہو کر خاص طبقہ کی چیز ہو کر رہ گئی اور یہی سبب خاص طور سے اس کے زوال کا بھی ہوا دوسرا سبب اس کے زوال کا یہ ہوا کہ گوتم بدھ اور مہاویر والے اپنے اپنے مذہب کی ترویج مقامی بولیوں میں کی عوام نے ان کے عقائد اور طریقوں کو بہت پسند کیا مذہب کا سہارا پا کر عوامی زبانیں جیسے پالی اور پراکرت مقابلہ کرنے لگیں ہندو مذہب کے پرستار اپنی زبان یعنی سنسکرت کی حفاظت پر تلے رہے لگے نتیجہ یہ ہوا کہ سنسکرت عوام سے بالکل الگ ہو کر صرف ایک طبقہ کی زبان ہو گئی۔ ہندوستان کے عوام کی زبان شروع ہی سے ایک مخلوط زبان تھی تھوڑے سے فرق کے ساتھ مختلف خطوں میں مقامی زبانیں رائج تھیں اور وہ برابر چلتی رہیں ان زبانوں کو پراکرت کہتے تھے ہم کو پراکرت کا پہلا نمونہ ۲۵ قبل مسیح اشوک کی لاٹوں میں ملتا ہے یا پھر بدھ یا جین مت والوں کی مذہبی کتابوں میں نظر آتا ہے اسی پراکرت سے ادبی شکل کا نام پالی ہے جس کو بدھ مذہب کے ماننے والوں نے فروغ دیا اس وقت کہ جب اس پر سنسکرت (متھرا اور اس کے اردگرد کے علاقہ کی زبان) کا اثر پڑ چکا تھا سنسکرت کے ساتھ پراکرت کا بھی پہلو بہ پہلو ارتقا ہوا اور ہر قسم کی دوہوں اور راجیوتوں کی فتوحات کے ذریعہ سے دوآبہ کی زبان بھی ترقی کرتی رہی

سنسکرت کی طرح بعض بعض پراکرتیں بھی کبھی کبھی اپنی ادبی حیثیت اختیار کر لیتی تھیں کہ عوام اُن کے استعمال سے گریز کرنے لگتے تھے اور پھر ایک ملی جلی زبان کو ایک خاص انداز میں پیش کر کے ایک نئی زبان تیار کر لیتے تھے جس میں وہ اپنا مفہوم آسانی سے ادا کر سکتے اسی طریقہ پر ایک زبان اُپ بھرنش کا بھی وجود ہوا چنانچہ جب عوام نے ادبیات سے نکل کر اپنے طور پر ایک ملی جلی بولی کا استعمال شروع کیا تو اس کو اہل زبان حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے اور اس کا نام اپ بھرنش رکھا جس کے معنی بگڑی زبان[1] کے ہیں

---

[1] تاریخ زبان اُردو (ڈاکٹر مسعود حسین۔ ص ۴۵، ص ۸۳)

اپ بھرش عوام کی رہنمائی میں بڑھتی رہی بالآخر اس میں زندگی کے آثار دیکھ کر تعلیم یافتہ طبقہ بھی ان کی طرف مائل ہوا ہندوستان کی دوسری زبانوں سے بھی اس کا اثر لیا خاص طور پر گجراتی، مراٹھی اور اردو آج کی لوبان اس سے زیادہ متاثر ہوئیں راجیوں کے سیاسی اقتدار کی وجہ سے اس کو بھی اتنا فروغ ہوا کہ ۸۰۰ء سے لیکر ۱۱۰۰ء تک اردو آج کی تو ریاستی اب بھرش تمام شمالی ہندوستان کی ادبی زبان بن گئی موجودہ اردو ماڈرن بولی (۹) اپ بھرش سے نکلی اس کے وجود میں وہ اپ بھرش کا رفرما ہوئی جو دلی، مرٹھ اور ان کے گرد و نواح میں بولی جاتی تھی۔ اسی زبان کی جسم دی ہوئی مغربی ہندی ہے جو مسلمانوں کی آمد سے پہلے پنجاب میں رائج تھی

۷۱۱ء کا زمانہ ایسا ہے کہ جس کے بعد افغانستان کے راستہ سے برابر مسلمان اور شاہ ہندوستان پر حملہ آور ہوئے ان کا مرکز زیادہ تر پنجاب رہا اس سے پہلے محمد بن قاسم نے ۷۱۲ء میں سندھ پر قبضہ کر کے اپنی حکومت قائم کر لی تھی وہاں عربی و فارسی کے الفاظ برابر استعمال ہونے لگے تھے محمود غزنوی وغیرہ کے زمانے میں اور اس کے بعد بھی الفاظ کی رد و بدل ہوتی رہی عربی و فارسی الفاظ ہندوستانی کی زبانوں میں اور عربی و فارسی میں ہندوستانی زبانوں کے الفاظ بڑی تیزی سے بڑھتے گئے جس کا نتیجہ نکلا کہ لوگ ایک دوسرے سے قریب ہوتے گئے نئی زبان کا دائرہ وسیع تر ہوا گیا یہاں تک کہ فارسی اور ترکی کے شعراء ہندوستانی زبان میں شعر کہنے لگے جیسا کہ خواجہ مسعود سعد سلمان جن کا انتقال ۱۱۲۵ء اور ۱۱۳۰ء کے درمیان ہوا ہے علاوہ ترکی و فارسی زبانوں کے ہندوستانی زبان کے بھی شاعر تھے جن کا ہونا محمد عوفی اور امیر خسرو کی کتابوں سے ملتا ہے جو کہ خواجہ مسعود سعد سلمان کے کلام کا نمونہ دستیاب نہیں ہو سکا اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انہوں نے ہندوستان کی کس زبان میں شعر کہے ہیں لیکن قیاس یہ ہے کہ غالباً لاہوری زبان رہی ہوگی لاہور کے بجائے

دہلی کو دارالسلطنت بنانے پر اس وقت تک کے لسانیاتی اور دختہ کو بھی ترجمہ کرنا پڑا
اب ۱۲۰۶ء میں جب قطب الدین ایبک نے دہلی کو دارالسلطنت بنایا تو یہاں
کی زبان بجائے لاہوری کے دہلوی تھی جو کمی زبانوں سے متاثر ہو کر ایسی ایک نفرادیت
مسلمانوں سے قبل راجپوتی عہد میں قائم کر چکی تھی وہ نہ تو خالص بھاشا تھی نہ خالص کھڑی
بولی بلکہ اس عہد کی قدیم اپ بھرنش سے روایات میں جکڑی ہوئی زبان تھی جس پر
راجستھانی اور برج بھاشا کا اثر نمایاں تھا

ہندوستان کی حد بولیوں کی پیدائش صحیح معنوں میں ابھی تک نہیں ہوئی تھی
اس لئے سولہویں صدی سے زیادہ پرانے نمونے نہیں مل سکے لیکن یہ ماننا پڑتا ہے
کہ اسی دہلوی زبان کی بنیاد پر اردو کا وجود قائم ہوا جو زیادہ تر اپ بھرنش کا اثر لئے
ہوئے تھی یہاں سے مسلمان فارسی آمیز بیجاپی بولتے ہوئے دہلی آئے دہلی میں اور
اس کے آس پاس ان کی مڈبھیڑ کئی بولیوں سے ہوئی ہے آس پاس کے علاقوں میں
ایک طرف پرانی کھڑی بولی اور دوسری طرف پرانی ہریانی بولی جاتی تھی جو کہ کسی زمانے
میں مشرقی بیجاپی زبان خود انہیں دونوں بولیوں کے ریراتر پیدا ہوئی تھی اس لئے
نئی بولنے والوں کو برج بھاشا کی نسبت کھڑی بولی اور ہریانی سے زیادہ
قریب دکھائی دی انہوں نے ان کی صوتیات اور صرف و نحو کو بیجاپی سے ملتا جلتا
پایا اس قرب کی وجہ سے ان کی نظر انتخاب برج بھاشا کے بجائے انہیں بولیوں پر
پڑی جسے وہ بہت جلد بولنا سیکھ گئے دہلی بار بار ایک جگہ سے ہٹ کر دوسری
جگہ آباد ہوتی تھی چنانچہ شاہجہاں کے وقت میں دہلی کئی میل ہٹ کر شمال میں بسائی
گئی تھی جس کی آبادی آگرہ کے آنے والوں سے بھی بسی تھی ان آنے والوں کی بولی
برج بھاشا تھی اس لئے برج بھاشا کا اثر اس نئی بولی پر زیادہ پڑا نتیجہ یہ ہوا کہ

---

لہ تاریخ زبان اردو مصنفہ ڈاکٹر مسعود حسین

کہ اُردو سے پنجابی کا اثر روز بروز کم ہو گیا لہجے بدلنے لگا اور ہندوستانی کا اپنا معیار اس وقت قائم ہوا جب وہ ایک طرف بدل۔ لٹا گڈی کے بجائے بادل لوٹا گاڑی استعمال کرنے لگی

محمود غزنوی کے زمانے سے ہندوستان کے بعض الفاظ ہم کو فارسی کے مستند شعراء کے یہاں ملنے لگتے ہیں مثلاً فردوسی نے ایک شعر میں کوتوال کا لفظ استعمال کیا ہے جو خالص ہندی لفظ ہے "کوٹ" اور "والا" سے مرکب ہے (کوٹ = قلعہ اور والا کا مخفف والی بمعنی مالک)۔

محمود غزنوی کے لڑکے سلطان مسعود غزنوی کے زمانہ کا فارسی شاعر منوچہری کے یہاں "لنگھس" اور حکیم سنائی کے یہاں "یانی" کا لفظ شعر میں آیا ہے۔ اسی طرح پرتھوی راج کے زمانے میں بھی ہندی شعراء کے یہاں سے ثمار عربی و فارسی الفاظ ملنے لگتے ہیں لیکن الفاظ کے علاوہ جملے بہت کم ملتے ہیں کوئی ایسی چیز نہیں لکھی ملتی جو مسلسل عبارت کے ساتھ اس نئی زبان کا نمونہ پیش کر سکے صوفیوں اور سادھوؤں کے اقوال البتہ کہیں کہیں ملتے ہیں امیر خسرو کا اس زبان میں اشعار کہنا تو تسلیم کیا جا سکتا ہے اس لئے کہ انھوں نے اپنی فارسی مثنویوں میں ہندی زبان، ہندی اشیاء کی دل کھول کر تعریف کی ہے اور علاوہ اس کے خود ایک جگہ لکھا بھی ہے کہ میرا ایک دیوان ہندی میں بھی ہے لیکن یہ دیوان نایاب ہے کسی نے دیکھا نہیں جو اشعار، پہیلیاں، مکرنیاں ان سے منسوب کی جاتی ہیں وہ محل گفتگو ہیں کوئی تاریخی ثبوت نہیں ملتا کہ یہ کلام واقعی امیر خسرو کا ہے اس لئے اس کو پرانی اردو کا نمونہ سمجھنا خطرہ سے خالی نہیں بہرحال الفاظ اور فقروں کے نمونے ہمیں محمود غزنوی، پرتھوی راج وغیرہ کے مصنفین اور بزرگان دین کے فیض سے برابر ملتے آتے ہیں جن کی بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک نئی زبان روز بروز نمایاں ہوتی جا رہی تھی۔

اس زبان کی ترویج میں فوجیوں کا بھی بہت کچھ حصہ ہے یہ نئی زبان ابتدا میں برج بھاشا اور کھڑی بولی اور راجستھانی سے مل کر چلتی ہے لیکن بعد میں کھڑی بولی پر زیادہ سے زیادہ زور دیتی ہے اس زور کا بڑا سبب فوجیوں کا ملک میں پھیلنا تھا سلاطین دہلی کی فوج میں بھرتی انبالہ، کرنال، حصار اور دہلی کے جنوب میں میوات کے علاقہ سے کی جاتی تھی[1] گریرسن نے انھیں اصلاع کی ہندوستانی (کھڑی بولی) کو معیاری اور ادبی اردو سے قریب تر بتایا ہے یہ زبان فوجیوں کی آمد و رفت سے ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پھیل رہی تھی اور اس کی اہمیت و عزت تیزی سے بڑھ رہی تھی دہلی کی مرکزیت اور اس کے تمدن کا اثر تمام ہندوستان پر ہو رہا تھا اس کا تمدن، اس کی تہذیب سارے ملک میں وقعت سے دیکھے جاتے تھے اس کی زبان کو بھی لوگ دیسی سے سیکھنے اور بولنے کی فکر کرتے تھے ہندوستان میں گوتم بدھ ہی کے زمانے سے مذہبی مبلغوں نے اپنے خیالات کی اشاعت ملک کی عام فہم زبانوں میں کی تھی، اس وقت بھی سلاطین دہلی کے زمانے میں بھی صوفیائے کرام اور دوسرے بزرگان دین کا یہی رویہ رہا چنانچہ علاوہ اور لوگوں کے لسانی تحریک میں ہم کو سب سے زیادہ مدد کبیر داس کی تحریک اور شاعری سے ملتی ہے

کبیر داس کا زمانہ ۱۴۴۰ء سے ۱۵۱۸ء تک ہے کبیر داس کے کلام میں کھلی ہوئی زبان ملتی ہے جس میں کھڑی بولی برج بھاشا، راجستھانی اور کبھی کبھی پنجابی کے اثرات نمایاں ہیں غرض کہ اس نئی زبان یعنی اردو کا ارتقا عوام کے ہاتھوں ہوتا رہا۔ ہندوستان کی مختلف مروجہ زبانوں کو سمیٹ کر ایک نیا جامہ تیار ہو رہا تھا گویا بقول ڈاکٹر مسعود حسین کثرت میں وحدت کا نقش ابھر رہا تھا کبیر کے یہاں بھی بے شمار دیہاتی و ہندی الفاظ اور محاورے مل جاتے ہیں کبیر کی تقلید لسانی گرو نانک نے

---

[1] بحوالہ تاریخ زبان اردو مصنفہ ڈاکٹر مسعود حسین ص ۵۳

بھی کی چنانچہ ان کے یہاں بھی فارسی و عربی الفاظ و فقرہ بہت کافی تعداد میں ملتے ہیں یہاں بھی گرامر کا ڈھانچہ وہی ملتا ہے جو کبیر کے یہاں پایا جاتا ہے کھڑی بولی کے اسماء و افعال اور ضمائر بے تکلف استعمال کئے گئے ہیں اور بعد میں اسی کی گرامر پر زور دے کر اردو کا ڈھانچہ تیار ہوا اس لئے ہم اس نتیجے پر پہونچتے ہیں کہ اردو زبان نہ برج بھاشا سے ہی نہ پنجابی سے بلکہ مخلوط زبانوں سے متاثر ہو کر کھڑی بولی پر اس نے اپنی بنیاد قائم کی یہ نئی زبان اپنی مقبولیت کی وجہ سے برابر ترقی کرتی رہی یہاں تک کہ جب بابر ہندوستان آیا تو یہ زبان ایک صورت اختیار کر چکی تھی ممکن ہے کہ اس کے ہمراہی شروع شروع اس زبان کو نہ سمجھے ہوں لیکن بابر نے اپنی دلچسپی کا ثبوت بہت جلد دیدیا اور اس نے ایک شعر اسی زبان میں کہہ دیا

محکا نہ ہوا کچھ ہوس ملک و موتی
فقرا بلیغہ بس بولغو ستو یانی ورتی

یہ زبان اپنی افادیت کو لے کر آگے بڑھ رہی تھی بابر کے بعد ہمایوں کے دربار میں بھی اسی کا چرچا تھا لیکن اکبر کے وقت میں اس کی ترقی کو صدمہ پہنچا کیونکہ اکبر نے اپنی حکومت کا مرکز بعض مصلحتوں سے زیادہ تر آگرہ کو رکھا جہاں برج بھاشا اور راجستھانی بولیوں کا اثر تھا اور چونکہ منتھرا میں مذہب کی وجہ سے برج بھاشا کا تنہا اثر تھا اور یہ علاقہ آگرہ سے قریب تھا اس لئے اس نئی زبان کی نشو و نما میں برج بھاشا اور راجستھانی سد راہ ہوئیں اسی زمانے میں شاہی محلوں میں راجپوت رانیاں تھیں دربار میں ہندی سنگیت کا زور تھا اور سنگیت کی اصطلاحات اور زبان پر برج بھاشا کا غلبہ تھا اس لئے بھی برج بھاشا کا اثر تیز ہوتا گیا چنانچہ اکبر سے جو دوہے منسوب کئے گئے ہیں وہ بھی برج بھاشا میں ہیں اور پھر اسی کے سپہ سالار عبدالرحیم خانخاناں

نے برج بھاشا میں سورداس کی شاعری کی کہ وہ آج بھی اس زبان کے بہت بڑے شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ جس کہ اس دور میں برج بھاشا کا اتنا زور ہوا کہ کھڑی بولی جو اسے یاؤں رکھ رہی تھی کچھ دنوں کے لئے دب گئی لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ کھڑی بولی سطحوں سے اوجھل ہو گئی تھی وہ اس عرصے میں بھی اپنا کام کر رہی تھی سورداس کے لئے یہ مثال کافی ہے کہ اکبر ہی کے عہد میں گنگ کوی نے ۱۵۷۲ء میں "چندر چھند ورنن کی مہیما" کھڑی بولی میں لکھی اس کتاب کا ایک اقتباس یہیں کر دینا مفید مطلب ہوگا اس سے مثال ملاحظہ ہو[1]

"اکبر شاہ جی عام کھاس (خاص) میں تکیہ (تخت) اوپر وراجمان ہوئے ہے اور عام کھاس بھرے لاہے جس میں تمام امراء آئے کورنش بجائے جہاد کر کے اپنی اپنی ٹھاک پر بیٹھ جاکر بیٹھے اپنی اپنی مسل سے جن کی بیٹھک ہیں سو رسم کے رہے من رسم کی لوبیں بکڑے بکڑے کھڑے تاسیم (تعظیم) میں رہے"

اس اقتباس میں فارسی عربی اور سنسکرت کے الفاظ کے مل جول کے علاوہ گرامر کی قابل غور ہے۔ اب ہم زبان کی پیدائش پر غور کرتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کھڑی بولی متوسطی ایسی طرح سے پیدا ہوئی اور برج بھاشا کے ساتھ ساتھ اپنی ارتقائی منزل طے کر رہی تھی بلکہ برج بھاشا سے کچھ قبل ہی وہ سلاطین دہلی کے ابتدائی عہد میں ایک ساتھ شکل اختیار کر لیتی ہے اکبر کے زمانے سے اس کھڑی بولی کو صدمہ پہونچتا ہے برج بھاشا کو زور حاصل ہوتا ہے سنسکرت کے الفاظ زیادہ آنے لگتے ہیں تاہم جہاں اسی ماحول میں پیدا ہوئی ہے جب شاہ جہاں نے آگرہ چھوڑ کر دلی آباد کی تو دہلوی زبان کو پھر عروج ہوا کیونکہ یہاں وہی زبان رائج تھی جس کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں یعنی کھڑی بولی جس پر تھوڑا بہت اثر برج بھاشا، پنجابی، راجستھانی

---

[1] ہندی ساہتیہ کا اتہاس ص ۳۳۶ بحوالہ تاریخ زبان اردو (مسعود حسین ص ۱۴۲)

کا بھی تھا لیکن بایں ہمہ کھڑی بولی کو نمایاں حیثیت حاصل تھی اور عوام میں اُسی کا غلبہ تھا اور اب شاہ جہاں کے آنے سے اس کا زور اور زیادہ ہو گیا غالباً اسی وجہ سے اُردو کو شاہ جہاں سے زیادہ قرب سمجھ کر شاہ جہانی اُردو کہا جاتا ہے دہلی کی فضا میں اس وقت کھڑی بولی اسا قدم جما رہی تھی گو برج بھاشا بھی آگرہ سے دہلی گئی لیکن رفتہ رفتہ اس کا اثر کم ہو گیا اور کھڑی بولی کو عروج حاصل ہوتا گیا کھڑی بولی نے اب بھرتی کی قدیم ادبی روایات اور پرانی اقدار کا جوا اپنے سر سے اُتار پھینکا اس وقت کے کئی ایک ہندی لکھنے والوں کی زبان کے نمونے ایسے ملتے ہیں جن میں ہوا ہے سن کر کرتا ہے ہوتا ہے دیکھتا ہیں وغیرہ کو دیکھ کر ہی ہندوستانی کا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ یہ زبان تیزی کے ساتھ مقبولیت حاصل کر کے برج بھاشا کو بھی پیچھے ڈھکیل دیتی ہے اور مغل دربار کے زمانے میں اس زبان کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے اور اس کا نام اُردوئے شاہی بھی کہیں کہیں ملنے لگتا ہے۔

اب مسلمان شعراء نے عبدالرحیم خانخاناں کی طرح برج بھاشا کی شاعری کو ترک کر کے اسی اُردوئے شاہی کو اپنانا شروع کیا برج بھاشا اور فارسی دونوں کو اس نئی زبان نے پیچھے کر کے اپنا قدم آگے بڑھایا۔ دلی کے آنے سے بھی پہلے یہاں اس نئی زبان نے شعر و شاعری کے لئے زمین ہموار کر دی تھی۔ یہ زبان عام طور سے یہاں بول چال اور لکھنے پڑھنے والے حلقوں میں رائج ہو گئی تھی

شمالی ہندوستان میں تو اُردو زبان کا بیج اس طرح بویا گیا جیسا کہ آپ دیکھ چکے ہیں مگر دکنی ہند میں کچھ اس سے مختلف طور پر اُردو کی نشو و نما میں کام ہوا علاؤالدین خلجی کے زمانہ سے دکن پر شمال کے بادشاہوں کے حملے شروع ہو گئے تھے آمد و رفت کا سلسلہ بھی جاری ہو گیا تھا ۱۳۲۹ء میں محمد تغلق نے شہر دیوگیر

کو ایسا دار السلطنت بنا لیا یہ شہر اس کو اتنا پسند آیا کہ اُس نے حکم دے دیا کہ ہر شخص دہلی سے دکن چلا جائے شاہی حکم تھا ہر شخص محصور تھا قریب قریب ساری آبادی دہلی کی دکن منتقل ہو گئی دہلی کے لوگ اپنے جان و مال کے ساتھ اپنی نئی زبان بھی لیتے گئے اس نئی زبان کا اثر اس تیزی سے ہوا کہ شمالی ہند بھی راہِ ترقی میں پیچھے رہ گیا دکن والوں نے اس زبان کو اپنے یہاں کی بولیوں میں شامل کر کے دکنی اُردو کا سا ماب کھول دیا عوام و خواص اس میں دلچسپی لینے لگے یہاں بھی بزرگانِ دین کی مدد سے اس زبان کو فروغ حاصل ہوا ان بزرگوں نے اپنے خیالات کی اشاعت اور مذہب کی تبلیغ اسی نئی زبان میں کی جس سے نئی زبان کو مقبولیت کا اور سہارا مل گیا یہ زبان یہاں کچھ اس تیزی سے بڑھی کہ باوجود اس کے کہ شمالی ہند کے مقابلے میں یہ بہت بعد میں آئی تھی مگر وہاں سے زیادہ یہاں کامیاب ہوئی چنانچہ دکن میں اُردو کے تحریری نمونے اسی وقت سے ملنے لگتے ہیں جب شمالی ہند میں کہیں کوئی ادبی کارنامہ نہیں دکھائی دیتا دکن میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ اس زبان میں بھی دور سے ملنے لگتا ہے چنانچہ بندہ نواز خواجہ گیسو دراز جو فیروز شاہ تغلق کے عہد میں گلبرگہ آئے ان کے تین رسالے تصوف کے متعلق اب تک موجود ہیں (۱) معراج العاشقین (۲) ہدایت نامہ (۳) رسالہ سہ بارہ زبان کا نمونہ ان کی ایک کتاب معراج العاشقین سے ملاحظہ فرمائیے۔

"اے عزیز دو اصلان حد اسوں ملنا حدا ہونا یو دونوں بھی ہیں تو یاں یہ سوں معراج کو جبر دے کر بندے کو سرفراز کر۔"

اسی دور میں ان کے علاوہ ان کے پوتے عبداللہ حسینی بھی اہلِ قلم تھے انھوں نے بھی شاطالعشق کا دکھنی ترجمہ لکھا ہے اور اس کی شرح بھی لکھی ہے

اسی دور کا ایک اور مشہور شاعر نظامی بھی ہے جو سلطان احمد شاہ ثالث بہمنی

کے زمانے میں سلطان کا درباری شاعر تھا اس کی مثنوی کدم راؤ پدم اس کی یادگار ہے بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد دکن میں پانچ سلطنتیں ہو گئیں مگر اس وہاں کی اشاعت کا سلسلہ برابر جاری رہا ہر عہد میں ہم کو ممتاز شعراء اور نثر نگار نظر آتے ہیں چنانچہ فہرست اتنی لمبی چوڑی ہے کہ سب کا ذکر کرنا اس جگہ ناممکن ہے۔ ہم صرف خاص خاص ادیبوں کا ذکر یہاں کریں گے تاکہ آپ کو دکن کی ادبی خدمات کا کچھ اندازہ ہو سکے

# شاہ میراں جی

اسے وقت کے بزرگ صوفی ہے اُن کا انتقال ۹۰۲ھ میں ہوا آپ کے مریدوں کا حلقہ نہایت وسیع تھا وعظ و نصیحت میں عموماً دکنی زبان استعمال کرتے تھے جو عام طور سے یہاں بولی اور سمجھی جاتی تھی کئی ایک تصانیف آپ کی یادگار ہیں جن میں سے بعض کے نام حسب ذیل ہیں۔ ان کی نثر کی کتابوں کا ذکر حصہ نثر میں آئے گا یہاں ان کی نظموں کے تین مجموعوں کا ذکر کیا جاتا ہے

خوش نامہ:۔ ۱۱۷ شعر کی ایک مثنوی ہے (۲) خوش نغز ۷۲ شعر کی چھوٹی سی مثنوی ہے (۳) شہادت الحقیقت میراں جی کی سب سے زیادہ اہم اور طویل نظم ہے اس میں ۵۶۳ بند ہیں تصوف سے متعلق ہے اسلوب بیان اور زبان نہایت سادہ اور سلیس ہیں

شاہ میراں جی کی نظموں کا موضوع تصوف ہے۔" ان کے کارنامے اگرچہ ادبی حیثیت سے زیادہ اہم نہیں لیکن لسانی نقطۂ نظر سے بے حد وقعت حاصل ہے[1]"

---

[1] اُردو نثر پارے

# شاہ بُرہان الدین جانم

شاہ میراں جی کے فرزند اور خلیفہ تھے باپ کی طرح صوفی اور صاحب علم تھے ۹۹۰ھ میں انتقال ہوا کئی ایک تصنیفات ان کی یادگار ہیں جن میں سے خاص خاص حسب ذیل ہیں

وصیت الہادی　ایک مثنوی ہے جس کا موضوع تصوف ہے

رمز الواصلین
لسارت الذکر } ان دونوں میں تصوف کے مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے

ارشاد نامہ :- اس میں ڈھائی ہزار اشعار ہیں صوفیانہ اصطلاحات کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے نظم کا زیادہ حصہ مکالمہ کی صورت میں ہے۔

شاہ برہان الدین جانم کی کتابوں کا موضوع زیادہ تر تصوف ہے لیکن کبھی کبھی انھوں نے دوہرے اور غزلیں بھی کہی ہیں اس لئے اپنے باپ سے زیادہ باذوق شاعر سمجھے جا سکتے ہیں طرز بیان کے لحاظ سے بھی ان کے کلام میں میراں جی کے کلام سے زیادہ سادگی ہے حتی الوسع فارسی اور عربی الفاظ کو استعمال کرنے سے احتراز کیا ہے[1]

# نصرتی

محمد نصرت نام اور نصرتی تخلص تھا اورنگ زیب نے جب بیجاپور فتح کیا تھا (۱۰۹۷ھ) تو یہ موجود تھے نصرتی کا باپ اپنے وقت کے لوگوں میں بہت باوقار و بااثر تھا

---

[1] دکن میں اردو (بار سوم) ص ۱۴۷

چنانچہ نصرتی کی تعلیم و تربیت شاہی محل میں ولی عہد سلطنت علی عادل شاہ کے ساتھ ہوئی جب علی عادل شاہ بادشاہ ہوا تو نصرتی کو ملک الشعرا کا خطاب عطا ہوا

نصرتی کی یہ تصنیفوں کا پتہ چلتا ہے

گلشن عشق :۔ اس میں کنور مہوہر اور مہ مالتی کا قصہ نظم کیا گیا ہے

علی نامہ علی عادل شاہ کے واقعات کے علاوہ چند قصائد بھی اس میں شامل ہیں

تاریخ اسکندری

نصرتی کے کلام پر تنقید کرتے ہوئے نصیر الدین صاحب ہاشمی فرماتے ہیں کہ "نصرتی کی مثنویاں اور قصائد کے دیکھنے سے اس کی قادر الکلامی کی کھلی تصدیق ہوتی ہے گلشن عشق میں انسانی جذبات اور حیات کی جس عمدگی سے ترجمانی کی گئی ہے اس کی کہیں اور نظیر نہیں ملتی اس کے کلام کی رنگینی اور تشبیہ و استعارات کی ندرت واقعی قابل داد ہے[1]"

## ہاشمی

سید میراں نام تھا ہاشمی تخلص بعض تذکروں میں اس کا سنہ استقال ۱۶۸۸ء اور بعض میں ۱۶۹۷ء ہے[2] سہ ماہ اور اوا ہے

ہاشمی نے غزلوں پر بھی طبع آزمائی کی ہے چنانچہ اس کا ایک دیوان غزلوں کا بھی ہے اس کے علاوہ ہاشمی نے مرثیہ بھی کہا ہے

اس کی ایک مثنوی یوسف زلیخا بہت مشہور ہے جس کو مصنف "دکن میں اردو" نے دیکھا ہے یہ کتاب ۱۶۹۹ء میں ختم ہوئی اس کا ایک نسخہ حرمس کے کتب خانہ

---

[1] دکن میں اردو [2] اردو شہ پارے

میں اور ایک اسماعیدیہ جسمیں دہلوی کے سب حالات میں محفوظ ہے

## سیوا

یہ ایک خاص پایہ کے شاعر تھے ان کا وطن گلبرگہ تھا سنہ ۱۶۸۰ء میں انھوں نے فارسی روضۃ الشہدا کا اردو زبان میں ترجمہ کیا مرثیہ پر بھی طبع آزمائی کی ہے جس نے ان کی شہرت میں چار چاند لگا دیئے اسی دور میں ایک اور شاعر رام راؤ تھے، جو مرثیہ گو تھے اور شاہی امرا میں داخل تھے

## قطب شاہی دور

سلطان قلی قطب شاہ اس خاندان کا پہلا بادشاہ تھا سنہ ۹۱۶ھ میں اس نے اپنی خود مختاری کا اعلان کیا اس کے بعد اس کو قتل کر کے اس کا بیٹا جمشید تخت پر بیٹھا اس کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا سبحان خواجہ نابالغ تخت پر بٹھایا گیا ان بادشاہوں کو سیاست اور حکومت سے مہلت نہ دی کہ اردو کی طرف التفات کرتے اور کوئی کارنامہ اپنی یادگار میں چھوڑ جاتے حالانکہ پہلا بادشاہ یعنی سلطان قلی قطب شاہ نہایت ہی علم دوست اور قابل آدمی تھا مگر ابھی تک یہ پتہ نہیں چلا کہ اس وقت کسی نے اردو نظم پر طبع آزمائی کی ہو

اردو کا پتہ اس خاندان کے چوتھے بادشاہ یعنی ابراہیم قلی قطب شاہ کے زمانہ سے شروع ہوتا ہے جس نے تیس سال تک نہایت تدبر کے ساتھ سلطنت کی یہ بادشاہ علم پروری اور خوش اخلاقی میں شہنشاہ اکبر سے کم نہ تھا ہندوؤں سے

اُسے بھی اُنس تھا اکثر مہایب ممتاز عہدوں پر مہدو مامور تھے اس کے دربار میں اہلِ کمال کا مجمع رہتا اور لوگ ادبی شغل میں مصروف رہتے اس زمانہ میں اُردو کی خاطر خواہ ترقی ہوئی

# محمد قلی قطب شاہ

قطب شاہی خاندان میں محمد قلی قطب شاہ غالباً سب سے زیادہ اور بلند پایہ بادشاہ گزرا ہے اس کا دورِ حکومت ۳۱ سال تک یعنی ۹۸۸ھ سے ۱۰۲۰ھ تک رہا اس کے دورِ حکومت میں سلطنت کو ہر طرح کا فروغ ہوا وہ خود ایک زبردست شاعر تھا اس کے کلام کا دخیرہ مہایب وافر ہے جس کو اس کے بھتیجے اور جانشین سلطان محمد قطب شاہ نے اس کے مرنے کے بعد ۱۰۲۵ھ میں مرتب کیا اور ۱۹۴۱ء میں ڈاکٹر زور کی حدمد ترتیب سے ادارۂ ادبیاتِ اُردو حیدرآباد نے شائع کر دیا ہے

محمد قلی قطب شاہ کا اسلوبِ بیان نہایت سادہ اور عبارت سلیس ہے اس کی شاعری مقامی خصوصیات سے مملو ہے ہندوستان کے رسم و رواج اور تہواروں پر اس نے کافی نظمیں کہیں یہاں کے میووں ترکاریوں پرندوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا اس کے کلام پر ہندی شاعری کا گہرا اثر معلوم ہوتا ہے اس کی غزلوں میں لطافت اور عاشقانہ عنصر بہت کافی ہے۔

کلیاتِ قلی قطب شاہ میں ہم کو مثنوی قصیدہ ترجیع بند مرثیے۔ غزل سب ہی اصنافِ سخن ملتے ہیں جن کے مطالعہ سے اس کی قادر الکلامی اور شاعرانہ صلاحیتوں کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

# وجہی

وجہی ابراہیم قطب شاہ کے زمانہ میں پیدا ہوئے اس قطب شاہ کا زمانہ حکومت ۹۵۰ھ ہجری سے ۹۸۰ھ ہجری تک ہے انھوں نے بچپن ہی سے شاعری شروع کر دی تھی اور ایسی مشق بہم پہنچائی کہ آخر وقت تک اپنے دور کے بڑے کامیاب شاعر سمجھے جانے لگے وجہی نے غالباً کسی اُستاد کے سامنے زانوئے ادب نہ تہہ کیا وجہی کی دو کتابیں قطب مشتری اور سب رس بہت مشہور ہیں قطب مشتری ایک مثنوی ہے جس میں بادشاہ قطب کی تعریف اور اس کے عشق کی داستان بڑی خوبی سے قلمبند کی گئی ہے مثنوی ۱۰۱۸ھ ہجری میں کہی گئی چنانچہ وجہی کا کہنا ہے کہ

تمام اس کیا دس بارہ منے　　سنہ ایک ہزار ہور اٹھارہ منے

انجمن ترقی اُردو نے اس مثنوی کو شائع کر دیا ہے یہ مثنوی دکن کی ملہار یا مثنویوں کے ہم پلہ نہیں لیکن اس لحاظ سے کہ بادشاہ وقت کی محبت کی کہانی ہے ایک طرح سے ہم تاریخی حیثیت رکھتی ہے اس کے علاوہ اس مثنوی سے اس زمانہ کی طرز معاشرت، دنیا کا اچھا خاصا اندازہ ہو جاتا ہے اس مثنوی کی ضخامت تقریباً ۵۰۰ ہزار اشعار کی ہے اس مثنوی کے علاوہ وجہی نے غزل اور رباعی پر بھی طبع آزمائی کی ہے

سب رس وجہی کی بڑی اہم کتاب ہے جس دل کے پیرایہ میں تصوف کے مسائل نہایت خوبی سے ایک قصہ کے پیرایہ میں قلم بند کئے گئے ہیں انسانی حد ہدایت کی کس کس اس کتاب میں نہایت خوبی سے پیش کی گئی ہے اُردو میں غالباً رمزیہ اسرار بیان کی پہلی تصنیف ہے یہ کتاب بھی چھپ چکی ہے نصیر الدین ہاشمی کی رائے ہے کہ یہ کتاب غالباً وسہلی دین گجراتی کی تالیف کا ترجمہ ہے جس کو وجہی نے ۱۰۴۵ھ ہجری میں مرتب کیا

# محمد قطب شاہ

سلطان محمد قلی قطب شاہ کا بھتیجا تھا ۱۰۲۰ھ سے لے کر ۱۰۳۵ھ تک اس نے بادشاہت کی چچا کی طرح یہ خود بھی بڑا علم دوست اور اہلِ کمال کا سرپرست تھا خود بھی شعر کہتا تھا یہ دو دیوان اب تک موجود ہیں ایک فارسی میں ہے اور ایک اُردو میں محمد قطب شاہ کے کلام میں بھی لطافت و سادگی کافی ہے اس نے بھی رباعی و غزل وغیرہ پر طبع آزمائی کر کے اپنی قادر الکلامی کا ثبوت دیا ہے

# شوقی

ان کا نام حسن تھا اور شوقی تخلص۔ ان کی بھی دو کتابیں اب تک موجود ہیں پہلی ایک رزمیہ مثنوی ہے اس کا نام ظفر نامہ نظام شاہ ہے جو ایک مشہور جنگ کی تاریخ ہے یہ جنگ والی وجیانگر رام راج اور دکن کے مسلمانوں میں ہوئی تھی اس مثنوی سے اُس وقت کے تاریخی اور معاشرتی حالات کا بھی اندازہ ہوتا ہے

ان کی دوسری کتاب کا نام "میرمانی نامہ سلطان محمد عادل شاہ" ہے یہ مثنوی ایک عاشقانہ انداز میں ہے جس میں بادشاہِ وقت یعنی محمد عادل شاہ کی شادی کا تذکرہ ہے

# عبداللہ قطب شاہ

اس نے تقریباً پچاس سال تک حکمرانی کی یعنی ۱۰۳۵ھ سے ۱۰۸۳ھ تک حکومت

کا سلسلہ جاری رہا اس کے زمانہ میں اُردو ادب کا آفتاب دکن میں نصف النہار تک پہنچ گیا تھا یہ بادشاہ نہایت زبردست عالم اور شاعر تھا اس کا بھی کلام اس خاندان کے اور بادشاہوں کی طرح فارسی اور دکھنی زبان میں موجود ہے اس کا تخلص عبداللہ تھا اس کا کلام زبان کے لحاظ سے اس کے پیشرو محمد قطب شاہ سے زیادہ صاف ہے لیکن تخیل میں محمد قلی قطب شاہ کی شاعری سے کم رتبہ ہے امیر خسرو کی طرح کبھی کبھی عبداللہ کے کلام میں بھی فارسی عبارت اُردو کے ساتھ دست دگریباں نظر آتی ہے کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو

گفتم کہ اے پری توں ہے فتنۂ زمانہ
گفتا کہ راست گفتی اے گھس بھرے سجانا
گفتم کہ درجہاں یا لیلیٰ ہوائی ہے توں
گفتا کہ من جو مجنوں پائیں ہو تجھ دوانا

# غواصی

یہ بھی سلطان محمد قطب شاہ کے وقت میں ایک ممتاز شاعر تھے ان کی دو کتابیں مشہور ہیں ایک کا نام "سیف الملوک و بدیع الجمال" ہے یہ مثنوی ۱۰۳۵ھ میں لکھی گئی اس میں تخمیناً دو ہزار اشعار ہیں اور دوسری مثنوی کا نام "طوطی نامہ" ہے اس میں یا ہزار اشعار ہیں یہ ۱۰۴۹ھ میں ختم ہوئی

غواصی نے غزل اور مرثیے بھی لکھے ہیں ان کے کلام میں ہندی الفاظ زیادہ پائے جاتے ہیں کلام سادہ اور تصنع سے پاک ہے مگر کافی دلکش ہے

# ابن نشاطی

اس نشاطی بھی اس دور کے مشہور شاعر ہیں ابتدا میں یہ نثر نویس تھے رفتہ رفتہ نظم میں بھی طبع آزمائی کرنے لگے جو ان کے حیاتِ جاودانی کا باعث ہوئی پھول س ان کی وہ مثنوی ہے جس پر ان کو بجا طور پر ناز ہو سکتا ہے یہ تصنیف ۱۰۷۶ھ کی ہے زبان و بیان کے لحاظ سے یہ نہایت قابل قدر مثنوی ہے رسوم و طرز معاشرت کو جابجا بڑی خوبی سے بیان کیا گیا ہے

# ابوالحسن تاناشاہ

تاناشاہ نے قریب سترہ سال تک بادشاہت کی ۱۰۹۸ھ میں اس کے ساتھ قطب شاہی خاندان کا چراغ ہمیشہ کے لئے گل ہو گیا وہ خود بھی شاعر تھا اور اس کے عہد میں اردو کے اور بھی شاعر تھے لیکن تاناشاہ کا کلام کسی کتاب کی صورت میں ابھی تک دستیاب نہیں ہو سکا۔ محی الدین قادری زور تحریر فرماتے ہیں کہ اس کی معزولی اور قید کی تکالیف نے اس کی شاعری کو نہ تو ابھرنے ہی دیا اور نہ اس کی کچھ شہرت ہی ہوئی[1]

# فائز

تاناشاہ کے دور کے شاعر ہیں ان کو ادب سے فطری شغف تھا ان کی ایک مثنوی

---

[1] اردو شہ پارے ص ۱۱۶

"رموز شاہ و رموز امرا" نہایت دلچسپ اور دلکش ہے اُن کے کلام میں ہندی کے بجائے فارسی الفاظ اور ترکیبیں کافی تعداد میں ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تانا شاہ کے عہدِ حکومت میں فارسی کا دخل دکنی زبان میں کافی ہو گیا تھا۔

# بحری

ان کا نام قاضی محمود تھا چونکہ باپ کا نام بحرالدین تھا اسی وجہ سے بحری تخلص کیا بحری کے سوانح حیات پردۂ راز میں ہیں باوجود تحقیق و جستجو کے ابھی تک ان کی زندگی کے متعلق ان حالات سے زیادہ کچھ نہیں معلوم ہو سکا جو ان کی تصانیف "مس لگن" وغیرہ کے دیباچے سے اخذ کئے جا سکتے ہیں

(۲) نصرت آباد کے نواح میں موضع گوگی کے رہنے والے تھے ۱۶۸۴ء میں بیجاپور جانے سے بیجاپور کی تباہی پر حیدرآباد کا رُخ کرنا پڑا

(۳) بحری ولی کے ہمعصر تھے ان دونوں کے کلام میں زبان و بیان کی مشابہت پائی جاتی ہے بحری نے سنسکرت الفاظ ولی سے زیادہ استعمال کئے ہیں بحری روس دل صوفی رنگ تھے اس لئے تصوف کی اصطلاحات ان کے یہاں کثرت سے ہیں۔

(۴) بحری نے اپنے اشعار میں اعتراف کیا ہے کہ وہ فنِ شاعری اور اصطلاحاتِ سخن سے واقف نہ تھے کسی استاد فن عالم یا شاعر سے استفادہ نہ کیا تھا لیکن پھر بھی بقول ڈاکٹر حفیظ سید صاحب وہ شاعرانہ حیثیت سے کسی طرح بھی ولی و نصرتی سے کم نہ تھے اس کے باوجود بھی وہ غیر معروف رہے حفیظ سید صاحب نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے اول تو بحری نے اپنی عمر کا زیادہ حصہ گوگی میں گزارا جہاں وہ شاعر کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک خدا رسیدہ بزرگ کی حیثیت سے مشہور تھے وہ زیادہ تر مذہبی

دکنی یا بیجاپوری میں نظم کرتے تھے [illegible] ہے کہ اور مشہور شعرا کی طرح ان کو شاہی سرپرستی نہ ملی [illegible] جوانی کی شہرت کا سہارا [illegible] ولی

[illegible] ایسی یادگار چھوڑی ہیں ایک دیوان غزلیات، دوسری مثنوی [illegible] تیسری مثنوی بگاب نامہ۔

## اشرف

اشرف ایسے دکن کے بہت مشہور شاعر ہیں ان کی ایک مثنوی جس کا نام "سنگ نامہ" ہے اور جس میں حضرت علی کی لڑائیوں کا ذکر ہے برٹش میوزیم میں موجود ہے مصنف نے اس کا سنہ تصنیف ۱۱۲۵ھ م ۱۷۱۳ء کتاب کے خاتمہ پر بیان کیا ہے۔

اشرف نے مرثیے بھی کہے ہیں جن میں جذبات اور مطرب نگاری کو نہایت خوبی سے مدنظر رکھا ہے

اگر سوں ماتم شہ کے جلا ہے جس بدن میرا
برنگ برق خرمن سوز دل ہے ہر سخن میرا
ہوس گلگشت رضواں کی کرے کیوں عندلیب دل
محبت کی گلی میں سایہ دیں کے ہے وطن میرا

## ولی

ولی اورنگ آباد کے رہنے والے تھے ان کا انتقال ۱۱۱۹ھ ہجری میں ہوا یہ اسے دکن کے سب سے زیادہ مشہور شاعر تھے اک زمانہ میں خیال تھا کہ اردو کے

پہلے شاعر ہیں جن کا کلام دیوان کی صورت میں مل سکا ہے لیکن یہ خیال اب غلط ثابت ہو گیا اس لئے کہ محمد قلی قطب شاہ کا کلیات بھی مل گیا ہے اور چھپ بھی گیا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ تقریباً سو سال پہلے ولی کے مرا ہے اس لئے فی الحال اولیت کا سہرا اسی کے سر ہے

ولی اپنے وقت کے سب سے زیادہ مشہور شاعر ہوئے ہیں ان کا احسان صرف دکن تک محدود نہ تھا بلکہ شمالی ہند کو بھی ان کی ذات سے فائدہ پہنچا ولی کو سیر و سیاحت کا کافی شوق تھا چنانچہ اورنگ زیب کے عہد حکومت میں دکن سے دلی آئے تھے سورت اور احمد آباد بھی گئے تھے

کلیات ولی کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ولی قریب قریب اُردو کے ہر صنف شاعری پر قادر تھے غزل، قصیدہ، رباعی، مسمط، قطعہ، ترجیع بند، مثنوی کے علاوہ کچھ چیزوں پر اور بھی ولی نے طبع آزمائی کی ہے جس کے متعلق عبدالحق صاحب لکھتے ہیں "کہ قدیم زمانے میں بعض اصناف سخن ایسی رائج تھیں جو اب نہیں جیسے ثلاثی، چار در چار، بار گشت، اور قریب قریب ہر صنف شاعری کو ولی نے نہایت خوبی اور کامیابی سے برتا ہے۔

غزلوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ولی کے یہاں غزل کے علاوہ اخلاقی مضامین وغیرہ موجود ہیں گو باتیں عموماً سیدھی سادی ہوتی ہیں مگر جہاں مضمون آفرینی کرتے ہیں وہاں تخیل کی گہرائی قابل دید ہوتی ہے خاص کر ان مقامات پر جہاں تصوف کے نکات بیان کرتے ہیں چونکہ خود صوفی منش تھے اور برسوں خانقاہوں میں رہ کر درس معرفت حاصل کر چکے تھے اس لئے معنویت کے ساتھ پُر لطف طریقے سے رموز و حقائق قلم بند کرتے ہیں جس سے غزل میں ایک جان سی آجاتی ہے ولی کی زبان عموماً صاف و شیریں ہے پُرانے اور مانوس الفاظ کے استعمال سے کہیں کہیں اُلجھن

ضرور ہوتی ہے لیکن اس کا شکوہ بیکار ہے بلکہ قابل داد بات تو یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ اتنے پرانے زمانے میں تھے انھوں نے فارسی کی خوبصورت ترکیبوں اور ہندی اور فارسی کے مستعمل الفاظ کی آمیزش سے اپنے کلام کو اس طرح آراستہ کیا ہے کہ دلکشی اور صفائی ہر جگہ نمایاں ہے یہاں تک کہ بعض اشعار پر دھوکا ہوتا ہے کہ شاید آج کے کہے ہوئے ہیں

ولی کی غزلوں میں خارجی پہلو زیادہ ہے لیکن برجستگی اور کیف کی وجہ سے بیان میں مزہ کا فی رہتا ہے چونکہ صاحب معرفت تھے لہٰذا دل کے سوز و گداز کا اثر کلام میں بھی نمایاں ہے اور سادگی بیان کی وجہ سے تاثیر دو بالا ہو جاتی ہے

ان کی تشبیہات و استعارات میں جدت ہے اور غالباً اس جدت کے لئے انھیں دقت بھی نہ اٹھانی پڑی ہوگی اس لئے کہ زبان ابتدائی حالت میں تھی یہاں سے چاہتے ہوں گے نئی چیزیں لے آتے رہے ہوں گے معشوق کی بعض اداؤں کا خیال کر کے اس کو بانکے پٹھان کہہ دیا ہے اس کی مثال اردو شاعری میں کم ملے گی اور یہیں سے اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ صاحب کمال معمولی سی چیز کو موقع سے ملا کر غیر معمولی بات پیدا کر دیتا ہے۔

ولی کے قصائد پر نظر ڈالنے سے حیرت ہوتی ہے کہ اس عہد میں جب زبان ابتدائی حالت میں تھی کیونکر انھوں نے اتنے زوردار قصیدے کہے ہوں گے جتنی خوبیاں قصیدے میں ہونی چاہئے وہ سب ہی موجود ہیں شوکت الفاظ بھی ہے زور بھی ہے اور مشکل ردیف کے ہوتے ہوئے روانی بھی ہے ان کے قصائد میں محاکاتی عنصر بھی جوانی کے راہ قلم سے ہوئے ہیں ولی نے دلی میں آکر یہاں کی زبان کا اتنا اثر لیا کہ دکھنی زبان اور محاورات کو کم کر کے دہلی کی زبان اور

محاورہ کو اپنے کلام میں جگہ دیا شروع کیا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی الفاظ اور مقامی اثرات جو اُردو زبان میں آ رہے تھے وہ کم ہونے لگے اور فارسی الفاظ و تخیل زیادہ زور کے ساتھ اُردو میں داخل ہونے لگے چونکہ دہلی کے اس وقت کے شعرا ولی کے کلام سے متاثر تھے اس لئے انھوں نے بھی یہی رنگ اپنی شاعری کو دیا نتیجہ یہ ہوا کہ طرز تخیل اور طرز بیان دونوں میں فارسی کا اثر غالب ہو گیا ولی کے آنے سے پہلے ہی شمالی ہند میں اُردو زبان اور شعر کا چرچا عام ہو گیا تھا یہاں بزم سخن پہلے ہی سجی تھی ولی کی آمد نے اس بزم میں تازگی پیدا کر دی دکنی اُردو شعرا کے گزرنے کے بعد ضروری ہے کہ شمالی ہند کے اُردو ادیبوں کا بھی تذکرہ کیا جائے چنانچہ اب یہاں سے ہم شمالی ہند کے شعرا کا تذکرہ پیش کریں گے

# دکن کی ابتدائی خدمات

دکن میں زبان نے جس طرح ترقی کی اس کا مختصر ذکر کر دیا گیا اس کی تفصیل میں زیادہ ٹرنا تحصیل حاصل ہے زبان سے ادب کی طرف رجوع ہوتے وقت ہمیں دکن کی جو ادبی خدمات نظر آتی ہیں ان کا اعتراف کرنا ادبی ناانصافی ہوگی لیکن اس مختصر کتاب میں دکن کے سارے شاعروں اور ادیبوں کا مفصل ذکر بھی قریب قریب غیر ممکن تھا، اس لیے ہم نے چند مخصوص شعرا کو لے کر ان کی ادبی خدمات کا مختصر ذکر کیا اس کے بعد اب یہ زیادہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مجموعی تبصرہ کے طور پر ان اصناف شاعری کا ذکر کر دیں جس کی دکن میں ترقی ہوئی

اردو میں شروع سے اب تک جن اصناف کا عموماً رواج رہا ہے ان میں غزل، قصیدہ مثنوی اور مرثیہ زیادہ نمایاں ہیں غزل ایسی چیز ہے جس پر قریب قریب ہر شاعر نے طبع آزمائی کی قصیدہ کم لوگوں نے کہا مثنویاں کافی تعداد میں لکھی گئیں مرثیوں کی رفتہ رفتہ کافی اصلاح ہوگئی یہاں لیے کے بعد کہ غزل اردو کے قریب قریب ہر شاعر نے کہی اور اس میں فارسی کے شاعروں کی تقلید بھی کی، دکن کی غزلوں پر کوئی تفصیلی تبصرہ ہو سکا ہے اس لیے کہ ان میں ہمیں کوئی خاص بات نہیں ملی سوائے اس کے کہ دکنی دور کی غزلوں پر مقامی تخیل زیادہ نمایاں ہے قصیدہ نگاری کی دکن میں بھی کمی ہے صرف نصرتی ایک ایسا شاعر ہے جسے ایک بلند پایہ قصیدہ گو کہا جا سکتا ہے۔ اس لیے محض ایک شاعر کی وجہ سے قصیدہ نگاری کی کسی تفصیلی بحث کی گنجائش نہیں

صرف اتنا لکھ دینا کافی ہے کہ دکن میں قصیدوں کی بھی مہتمم بالشان داغ بیل پڑ چکی تھی
دو خاص چیزیں جو اس سے زیادہ توجہ کی محتاج ہیں مثنوی اور مرثیہ ہیں ان کا
ذکر اس لئے ضروری ہے کہ پڑھنے والوں کو اندازہ ہو جائے کہ شمال میں آنے سے پہلے
ان دو چیزوں نے دکن میں کتنی ترقی کر لی تھی
مثنوی جس طرح شمال کے شاعروں میں سے کوئی ایک بھی ایسا مشکل سے ہوگا
جس نے غزل نہ کہی ہو اسی طرح دکن کے شاعروں میں مشکل ہی سے کوئی ایسا شاعر ملے گا
جس نے مثنوی نہ لکھی ہو یہی وجہ ہے کہ دکن کی مثنویوں میں ہر قسم کی مثنویاں موجود ہیں
ان میں ایسی مثنویاں بھی ہیں جو صرف مذہب سے تعلق ہے اور صوفیانہ مسائل سے
پُر ہیں مثال کے لئے میراں جی شمس العشاق اور شاہ برہان الدین جانم کی مثنویاں
پیش کی جا سکتی ہیں ان میں ایسی مثنویاں بھی ہیں جن میں صرف حسن و عشق کے قصے اور
وارداتِ قلب کی داستانیں دہرائی گئی ہیں ایسی مثنویاں ایک دو نہیں پچاسوں ہیں
مثال کے لئے عواصی کی سیف الملوک و بدیع الجمال حیدری کی ماہ پیکر طبعی کی
بہرام و گل اندام فائز کی رسوا شاہ و روح افزا عاجز کی قصۂ لال گوہر
شہ حسینیہ مثنویاں ہیں
یہی زمانہ ہے جس میں مختلف زبانوں کی بہترین مثنویاں اردو کے قالب میں ڈھالی
گئیں یوسف زلیخا فارسی کی مشہور مثنوی ہے ہاشمی اور ابن نے اسے اردو کا جامہ
پہنایا اسی عہد میں مثنویوں کی شکل میں سوانح عمریاں لکھی گئیں اور اس سے تاریخ
کا کام لیا گیا اس حیثیت سے نصرت کا علی نامہ اور مومن کا اسرارِ عشق بھی بہت
مشہور ہیں نام کی مثنویاں ہیں لیکن حقیقت میں وہ بڑے لوگوں کی سوانح عمریاں
ہیں اسے بھی چھوڑیئے یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ مثنوی کی ایک خاص خوبی یہ ہے
کہ وہ ایسے زمانے کے رسم و رواج اور طور طریق کی مکمل تصویریں کر ہمارے سامنے

آئے تاکہ جو کچھ ہم نے یہاں دیکھا ہے وہ سُن لیں، دکن کی مثنویوں میں کافی مثنویاں ایسی ہیں جو اس حیثیت سے بھی مکمل کہی جا سکتی ہیں۔ نصرتی کا علی نامہ ان میں سب سے نمایاں ہے ابن نشاطی کی مشہور مثنوی پھول بن گو ایک عشقیہ افسانہ ہے سلاست، روانی اور دوسرے فطری محاسن سے قطع نظر کرکے اسے اگر ہم صرف اسی نظر سے دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ یہ مثنوی اپنے زمانے کی طرز معاشرت، رسم و رواج اور سیاسی و سماجی حالات کا ایک بہترین مرقع ہے بعض مثنویاں ہمیں ایسی بھی ملیں گی جن سے ہم بہترین اخلاقی درس حاصل کر سکتے ہیں

یہاں تک جو کچھ بیان کیا گیا وہ کچھ زیادہ حیرت افزا نہیں معلوم ہوتا اس لئے کہ ادب جس دور سے گزر رہا تھا اس وقت اس نے کوئی مستقل شکل نہیں اختیار کی تھی اس لئے ہر صاحب نے اپنی مخصوص ذہنیت کے مطابق مختلف قسم کی مثنویاں لکھیں اور خزانۂ ادب کو مالا مال کیا اور مثنویوں کا یہ دور آئندہ آنے والے زمانے کے لئے بھی ایک مقدمہ بن گیا لیکن ان حیثیتوں کے علاوہ جو چیز ہماری نظر کو اور زیادہ تسخیر کرتی ہے وہ یہ ہے کہ انھیں مثنویوں کے بیچ بیچ میں ہمیں ایسے بیانیہ ٹکڑے مل جاتے ہیں جو مثنوی سے علیحدہ کرنے کے بعد ہمارے لئے مستقل نظموں کا دم دیتے ہیں جو حیرت صدیوں کے بعد ترقی کی شاہراہ سے گزر رہی ہے وہ اُردو کی ابتدائی کے بالکل ابتدائی دور میں شروع ہو چکی تھی۔ ان بیانیہ ٹکڑوں میں سے بعض ایسے ہیں جو کسی منظر کی تصویر ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں بعض ایسے ہیں جن میں کسی مخصوص مادی چیز کا تفصیلی لیکن شاعرانہ ذکر کیا گیا ہے بعض میں کسی خاص رسم کو ایسا موضوع بنا کر پیش کیا گیا ہے

موضوع اور مواد کے لحاظ سے ہم نے دیکھا کہ دکن کی مثنویوں میں مذہبی، فلسفیانہ، عاشقانہ، بیانیہ، رزمیہ اور رزمیہ سب طرح کی مثنویاں ہیں ان میں سے کچھ طبع زاد

ہیں اور کچھ ترجمے بعض میں کردار نگاری کے اچھے نمونے ہیں اور بعض میں جذبات کی فطری تصویریں کسی میں مناظرِ قدرت کی جھلک ہے اور کسی میں انسانی نفسیات و نگار کے فنی نمونے اس کے علاوہ جو چیز ہمیں زیادہ مسحور کرتی ہے وہ یہ ہے کہ ان مثنویوں میں سے بعض کی زبان اتنی صاف ہے کہ کچھ شعر صرف ایک آدھ لفظ بدل دینے کے بعد ہمارے زمانے کے کہے ہوئے معلوم ہونے لگتے ہیں اور بعض بغیر کسی تبدیلی کے بہت صاف اور بامحاورہ ہیں دو ایک نمونے دیکھ کر اس کا اندازہ کیجئے ؎

الٰہی دے مجھ رنگیں بیانی　　عطا کر مجھ کو یاقوتِ معانی
سخن کے در کا مجھ کو جوہری کر　　سخن سخنوں کو میرا مشتری کر [1]

عرب والوں کی سرگرم رزم تھا　　بیاباں اُن کو گلزارِ ارم تھا

کروں اُس دشت کی کیونکر صفت کو　　زباں پر کس طرح ڈالوں لغت کو
وہاں کی ریت سیرے کی کمی تھی　　وہاں کے کانٹے بھالوں کی انی تھی
وہاں کی گرد تھی مادوں کی دارو　　وہاں کی خاک تھی دورج کی مالو
وہاں کی باد تھی سوزیدہ صرصر　　وہاں کی کنکری تھی مشتعل اخگر

تو یہ اے سندھ دسا و دیں　　شجاعت کی ہے عصف کا کرسی تس

طمع اہلِ عرب کو کر لی ہے خوار　　کرے جگ میں بے قول دے اعتبار
طمع نام و ناموس کا کال ہے　　طمع سکھ کو جیوں کے کھر نچال ہے [2]

---

[1] مثنوی لال و گوہر عاجز　　[2] علی ناصر یصری

مرثیہ :- مرثیہ اُردو شاعری کی وہ صنف ہے جس کی بدولت ہماری شاعری آج دنیا کی ہر شاعری کی آسانی سے ہم پلہ کہی جا سکتی ہے اس نے اس صنف کو جتنی ترقی دی اتنی اُردو کی ساری زندگی میں بھی نہیں ہوئی تھی اب تک عام طور پر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ جن چیزوں کی انتہا ایسی کے مراثی میں پائی جاتی ہے اس کی ابتدا بھی یہاں ہی ہوئی تھی لیکن موجودہ تحقیق کچھ اور کہتی ہے۔ اس کے برعکس جو چیزیں مثال کے مرثیہ گوئی میں ایسی انتہائی منزلوں کے ساتھ موجود ہیں ان کی داغ بیل دکن میں پڑ چکی تھی ہم اپنے اس بیان کو مختلف مثالوں سے واضح کرنے کی کوشش کریں گے

کسی صنف سخن میں کوئی قسم کا کمال پیدا کرنے سے پہلے شاعر جس چیز کی طرف سب سے پہلے توجہ کرتا ہے وہ ادب ہے دکن کے مرثیوں کے بالکل ابتدائی دور میں مرثیہ گوئی بالکل ایک نئی چیز سمجھی جاتی تھی اس لئے اس میں پڑھنے والوں کو کوئی خاص بات نظر نہیں آتی تھی لیکن عزلت کے زمانے سے اس روش میں تبدیلی ہوئی اور سب کے دل پر عزلت کے ان مصرعہ کا اثر پڑا کہ ع

تمام مضمون مرثیہ کہنے سوں جیو ہنا بھلا

جو لوگ غزل کی کلی میں مرثیہ کہتے تھے انھوں نے اسے مختلف طریقوں سے اپنی حیثیت دینے کی کوشش کی کہیں رنگینی کو جگہ دی اور کہیں تغزل کو ہمیں صرف مطلب یہاں کو مثلاً ہے

آج عمما کہا میں تیں کے گل　　کہہ دل چاک میں سمن کے گل
غم زدہ سنبل و ہیراں ہیں لہ　　مرکس و لالہ یاسمن کے گل

---

لہ روکی

ماہِ محرم میں دیکھو حسن کا ہوا مال آتا　　تارے گگن کے گونہ کے سہرا حوصلہ کوں ملا تیا
کیسا ستم کا باندھکر روکھ کا اُٹھا کوں لگا ہے　　حیرت کی چوکی کے اوپر انجھواں سو تن نہلا تا

روتی اور سیاق کے مرثیوں کے یہ شعر شعر ہیں، لعل اور رنگینی کی اچھی مثالیں ہیں

کی مرثیہ کا دوسرا اہم حروائس کی حدیات نگاری ہے فطرتِ انسانی کا جتنا گہرا مطالعہ انہوں نے کیا اس کا مقابلہ کرنا کوئی آسان کام نہیں دکنی کے مرثیوں کو دیکھ کر یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ان میں حدیات نگاری کی اچھی مثالیں موجود ہیں سعرت شہر ہا لنے کے نیز ہم سے یوں نظم کیا ہے

تجھ کو گئی کا کر تھس　　اٹھ لگا موں کھو رکھیں
تجھ کو ڈھونڈھوں دیس دیس سونا تیرا بالنا
دکھ کو کیسا ہوسا ہیں، غم کی دھونی حالوں میں
کرس مجھ کو کھرے ہیں، سونا تیرا بالنا

عادل کے مراثی میں حدیات نگاری کی ایک مثال ملاحظہ ہو ؎

اب میں حیدر لاؤں کسے پیاسی لگاؤں کسے
دودھ پلاؤں کسے ہے ہے فلک کیا کیا
نکلی ہیں جب از وطن کسی ہوئی تھی شکن
گم ہوئے سارے رن ہے ہے فلک کیا کیا

اُردو کے مرثیوں میں فطرتِ انسانی کی جو مصوری کی گئی ہے وہ ہندوستان کے ماحول

؎ سیدن

سے زیادہ منا رہے ہے انیس کے کلام پر اعتراض کرنے والے اس چیز کو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ بھی مثال کی ایجاد ہے لیکن ایسا نہیں ہے دکن کے مرثیوں کو دیکھنے سے ایسی مثالیں مل جائیں گی جن میں خود ہماری ملکی فطرت جلوہ گر ہے مثال کے لئے ہاشم کے ایک مرثیہ کا ٹکڑا ایسی ہے ؎

مالے اصغر کے نہیں ملائی رہی　　سونا یہ پالنا جھلاتی رہی
تھا ترس کا ٹھ کا تجھے ارماں　　لال جانا ترا سلاتی رہی
قاسم آ ملے جب بھائی کو　　یہ تماشا تجھے دکھاتی رہی

مرثیہ کا ایک خاص جزو سیرت نگاری ہے سیرت نگاری کے بیان کا بہترین طریقہ مکالمے ہیں مصنف اگر چاہے لفظوں میں کردار کی سیرت بیان کر دے تو اسے اپنی لطافت کی کمی سمجھا جائے دکنی مرثیوں میں یہاں سا یہ سیرت نگاری کی مثالیں موجود ہیں وہاں یہیں کہیں مکالموں کے ذریعے بھی اس کا پتا چلتا ہے ایک مثال لکھی جاتی ہے جس سے سیرت نگاری کا اندازہ ہو جانے کے علاوہ ایک خاص بات یہ ہوگی کہ مکالموں کا انداز بھی معلوم ہو جائے گا حضرت داعم لڑائی کو جاتے ہیں

علوے سس اُٹھ کے رن کوں چلا تب کہی بہن
دامن پکڑ کے لاج سوں اکھواں بھرے ہیں
مت چھوڑ کر سدھارو تم اس حال میں ہمیں
تم بس رہے گا ہائے یہ سوما بھوں سرا

حضرت قاسم جواب دیتے ہیں ؎

مجھ کوں نہیں ہے تیری جدائی کا اختیار
تیرے فراق ساتھ میں جاتا ہوں بے قرار
میں کیا کروں علاج نہیں حکم کردگار
حق سے کہا ہے رن میں مقرر رہن مرا

صرف دو بندوں سے مکالمہ کے حسن و سیرت نگاری کی بلندی ادبیت کی لطافت اور محاکات کی فطری جھلک کس قدر نمایاں ہو جاتی ہے محاکات کے لئے یہ مصرعہ۔

دامن پکڑے لاج سوں اٹھوالی کھڑے ہیں

ہم آج بھی اچھی سے اچھی مثالوں کے ساتھ ہر موقع پر پیش کر سکتے ہیں

روایات نظم کرنے کی ابتدا بھی دکن میں ہو چکی تھی لیکن اس کی بالکل غیر مکمل مثالیں ہمارے پاس ہیں اشرف کے ایک مرثیہ کا ٹوٹا ہوا انتخاب مثال کے لئے لکھا جاتا ہے ؎

یہ جھولے کی میں سانی تھی　　مالے اصغر کوں جھلاتی تھی
جب دولارا وہ بیدھڑ سوتا　　دودھ پیتے کو میں جگاتی تھی

جن میروں کی مثالیں مختصر طور پر دی گئیں ان سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اشرف روزی نظیر سندل ہاشم علی آقا اور رحیم کے مرثیوں میں جذبات، سیرت، مکالمہ، محاکات، روایات سب چیزیں اپنی ابتدائی شکل میں موجود ہیں اور نہیں کہا جا سکتا کہ ان کے شاعر اس سرزمین سے کبھی دکن کے مرثیہ گو نہیں ہیں۔

جب دکن کے متعلق اس کا عام طور پر یہ خیال تھا کہ اس کے ابتدائی دوروں میں اس کی کچھ خدمت نہیں اس کا ہم احسان مانتے پر مجبور ہیں کہ اس نے غزل، قصیدہ اور مثنوی اور مرثیہ کو ایک ایسے راستے پر لگا دیا جس کے زیادہ اچھے نمونے ہمیں مل سکیں آ کر ملے

دکن میں اردو ادب کے ارتقائی مراحل پر سرسری نظر ڈالنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ سماجی اس کے ساتھ اور ادب کا بھی جائزہ لیا جائے

(۲)

# شمالی ہند

## برہمن

برہمن کی جنم بھوم میں اختلاف ہے۔ کوئی لاہور بتاتا ہے کوئی آگرہ۔ سرتج موہانی رسالہ اردوئے معلیٰ ماہ اگست ۱۹۱۰ء میں لکھتے ہیں کہ برہمن اکبر آباد کے رہنے والے تھے "محاورۂ جاوید" سے بھی اُن کا وطن اکبر آباد ہی معلوم ہوتا ہے۔ حالاً لاہور میں قیام کرنے کی وجہ سے بعض لوگ اُن کو لاہوری سمجھتے ہیں جس کی تردید خود برہمن کی ایک عبارت سے ہو جاتی ہے۔

خان بہادر مرزا سلطان احمد صاحب نے رسالہ زمانہ دہلی ۱۹۳۱ء میں برہمن کے متعلق لکھا ہے کہ "شاہانِ معلیہ کی سلطنت میں سید رحمان برہمن لاہوری متصل خواجہ حیدر رحمان گویا لاہور کے دفتر میں ایک معزز عہدہ پر ممتاز تھا" "استاد چہار چمن" اُن کی تصنیف میں سے ہے۔ سید رحمان کو نظم کا بہت شوق تھا۔ مروج کتاب میں لکھتا ہے کہ

"اس بار مدرسہ دار السلطنت لاہور پر مقصد اصلاح آئے ہوا

دار امام خوبیہائے کہ دم حالات بہ قسمت اجادے می رسد سیدہ"

اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ برہمن کا اصلی وطن لاہور نہ تھا بلکہ سلسلہ ملازمت

---

لہ بحوالہ بہار کلس، کنتھر جلد اول۔

وہ لاہور آئے تھے بہرحال یہ یقینی امر ہے کہ برہمن اپنی علمی قابلیت کی وجہ سے شاہجہاں کے وقت میں ایک معزز عہدہ پر مامور تھے بعضوں نے داراشکوہ کا "پی" لکھا ہے اور بعضوں نے شاہجہاں کا خاص منشی بتایا ہے بہار گلشن کشمیر میں ایک جگہ لکھا ہے۔ کہ ۱۰۶۶ھ میں سعد اللہ خاں شیرازی وزیر سلطنت شاہجہانی نے انتقال کیا۔ اس وقت شاہجہاں کی مردم شناس نظر نے چندربھان کو انتخاب کیا اور خطاب "رائے رایاں" سے مزین کر کے قلمدان وزارت آپ کے سپرد کیا فارسی میں کئی ایک تصنیفات آپ سے یادگار ہیں

بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ داراشکوہ کے قتل کے بعد برہمن مارک الدنیا ہو کر بنارس چلے گئے اور وہاں ایشور بھگتی میں بقیہ عمر صرف کر کے ۱۰۷۰ھ میں راہی ملک بقا ہوئے۔

سرت موہانی اسی رسالے میں جس کا ذکر ابھی آچکا ہے رقمطراز ہیں کہ "اورنگ زیب شاہ عالمگیر کے زمانے میں ان پر (برہمن پر) نوازشات شاہی مبذول ہوتی رہیں اور ان کا بقیہ عمر اسی سامان رہا۔ آخر عمر میں نوکری سے استعفا دے کر بنارس میں سکونت اختیار کی اور ۱۰۷۳ھ میں انتقال کیا" کلام کا نمونہ بہت کم دستیاب ہو سکا ہے جو نقل کیا ہے ملاحظہ ہو۔

مدتے کس تنہا اندر ہمن کو لائے ڈالا ہے

نہ دلبر ہے نہ ساقی ہے نہ شیشہ ہے نہ پیالا ہے

جو یاں کے باغ میں رونق ہوئے تو کس طرح یاراں

نہ دریا ہے نہ مرواہے نہ سوسن ہے نہ لالا ہے

---

لہ صبیحہ جلد اول ص ۶۶۳
ع خمخانۂ جاوید

پیا کے ناؤں کی سمرن کیا چاہوں کروں کس سیں
نہ تسبی ہے نہ سمرن ہے نہ کنٹھی ہے نہ مالا ہے
پیا کے نام عاشق کوں قتل یا عجب دیکھے ہوں
نہ برچھی ہے نہ کرچھے ہے نہ خنجر ہے نہ بھالا ہے
رتن واسطے اشناں کے بھرتا ہے یگیا سبھی
نہ گنگا ہے نہ جمنا ہے نہ ندی ہے نہ نالا ہے

# فائز دہلوی

حال ہی میں ان کا دیوان پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی نے مرتب کر کے شائع کر دیا کہ ولی کے زمانے میں شمالی ہند میں بھی اردو کے شعرا موجود تھے جن میں فائز کی حیثیت صاحب دیوان ہونے کی وجہ سے ممتاز ہے فائز کا دیوان ۱۱۲۷ھ میں یعنی فرخ سیر کی سلطنت کے پانچویں سال میں مرتب ہو چکا تھا وہ ولی کے ہم عصر تھے۔

فائز کے حالات زیادہ نہیں معلوم ان کا نام صدر الدین محمد تھا اور ان کے والد کا نام محمد خلیل تھا خود بردست خاں کے نام سے مشہور تھے ان کے آباؤ اجداد اپنے وقت کے بادشاہوں کے یہاں ممتاز عہدوں پر مامور تھے۔ چنانچہ ان کے والد زبردست خاں عالمگیری عہد کے بیالیسویں سال میں ناظم اودھ مقرر ہوئے تھے اور بعد میں کبھی بنگال کے صوبے دار رہے اور کبھی اجمیر کے۔

فائز کے وطن کا پتہ قطعی طور پر معلوم نہیں لیکن جس انداز سے انھوں نے اپنے کلام میں دہلی کا ذکر کیا ہے اس سے خیال ہوتا ہے کہ وہ دہلی کے باشندے تھے

وہ نہایت ذی علم اور بہت سی کتابوں کے مصنف تھے نثر و نظم فارسی و اُردو دونوں میں ان کا قلم یکساں رواں تھا چنانچہ ان کی اُردو و فارسی کی جس تصنیف کا اب تک پتہ لگایا جا سکا ہے ان کی تعداد اُنیس (۱۹) ہے۔

آزر کا اردو دیوان ضخیم نہیں ہے صرف ستتر ۳۷ غزلیں ہیں لیکن نظمیں تعداد میں اس سے بہت زیادہ ہیں جو سب کی سب مثنوی کی شکل کی ہیں جس طرح وہ دہلی کے پہلے اردو غزل گو ہیں اسی طرح پہلے نظم گو بھی ہیں

آزر کے کلام میں غور و فکر کے عناصر نہیں پائے جاتے وہ سیدھی سادی باتوں کو نظم کرتے چلے جاتے ہیں ان کے کلام میں ایہام بہت کم ہے البتہ اور صنعتیں کافی ہیں ان کی غزلوں کا عام موضوع ظاہری حسن ہے یا مجازی محبت کلام میں معاملی خصوصیات بہت ہیں سوز و گداز، دردمندی جوش و حرارت کم ہے لیکن محبوب کی اداؤں کے بیان اور ان کی شوخی کے اظہار میں کبھی کبھی کلام میں گرمی پیدا ہو جاتی ہے۔

## ابرو

ان کا نام نجم الدین تھا شاہ مبارک لقب اور آبرو تخلص تھا سلسلۂ نسب شاہ محمد غوث گوالیاری سے ملتا ہے تاریخ ولادت کا پتہ نہیں چلتا گوالیار ہی میں پیدا ہوئے تھے لیکن بچپن ہی میں دہلی چلے آئے جہاں تعلیم و شعر گوئی حاصل کی سراج الدین علی خاں آرزو کے رشتہ دار تھے اور ان ہی سے مسودہ شعر و سخن کرتے تھے

تھوڑے عرصہ تک مارواڑ میں بھی رہے بہت خلیق و متواضع آدمی تھے ایک آنکھ کی بینائی جاتی رہی تھی ۱۱۶۵ھ (۱۷۵۲ء) میں پچاس برس کی عمر سے متجاوز ہو کر وفات پائی نہایت کہنہ مشق شاعر تھے اُس وقت ہر ایک ان کو استاد زمانہ

---

لہ ماخوذ از تاریخ ادب اردو مصنفہ رام بابو سکسینہ مترجمہ مرزا محمد عسکری

سمجھتا ہوا

کلام میں صفائی ضرور ہے مگر رعایت لفظی کا اس قدر حسن ہے کہ تخیل میں وسعت نہیں پیدا ہوتی الفاظ سادہ اور ملائم ہیں لیکن زمانہ حال کے لحاظ سے بہت سے ایسے ہیں جو تقتا اور سادہ ہیں سدا شعار مورخ کے لئے ملاحظہ ہوں

رتم اس مرد کی کھاتے ہیں قسم رند دل کی
تاب لاوے جو کوئی عشق کے جھوک جھوڑوں کی
قدر داں کس کے کہے ہیں اُسے دل مردہ
سا ورے چھوڑ کے جو جا رہ کرے گوروں کی
گا ٹھر کاٹی ہے مرے دل کی ہی انکھاں نے
وہ بلک ہیں بہ کترتی ہے مگر چوروں کی
لب سریں یہ سریں کے ہیں خطِ سیاہ
ڈار جھوٹی ہے متھائی پہ شکر خوروں کی
پلکیں سورج منیں جوں خط شعاع کے شعلے
دیکھ انکھوں منیں یہ لال جھلک ڈوروں کی
مادری سکہ تجی بر ہیں سحر لوٹہ دار
عقل چکر میں گئی دیکھ کے چھب موروں کی
آبرو کوں ہیں کم طرف کی صحبت کا دماغ
کس کو برداشت ہے ہر وقت کے مکھوروں کی

# ناجی

ان کا نام سید محمد شاکر تھا ناجی تخلص کرتے تھے محمد شاہ کے ایک وزیر عمدۃ الملک امیر خاں سے جو خود بھی شاعر تھے اور شاعر پرور بھی تھے یہ ان کے یہاں ملازم تھے جس وقت بادشاہ سے ہندوستان پر حملہ آوری کی اس وقت (سنہ ۱۷۳۹ء میں) اس قلم کے سپاہی نے میدان جنگ میں بھی قدم رکھا اور فوج کے ساتھ تباہی میں شریک دار رہا اس وقت کے حالات جو کچھ لکھے ہیں وہ تاریخی لحاظ سے بھی حرف بحرف صحیح معلوم ہوتے ہیں آدمی مصنف مزاج نے لشکر اور دربار کی جو حالت تھی اس کو مسجع لکھ دیا ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں محمد شاہی لشکریوں کی کیفیت بیان کرتے ہیں

لڑتے ہوتے تو برس میں اُن کو پیتے تھے
دعا کے روزے دانی دوا کے جینے تھے
تمرا میں گھر کی نکالی مرے سے پیتے تھے
لگا دو نقش میں ظاہر گویا کہ جیتے تھے
گلے میں ہمسلیاں بازو اُپر طلا کے نال

ناجی کی طبیعت میں شوخی اور تیزی بہت کافی تھی چنانچہ کلام میں بھی یہ رنگ نمایاں ہے میر تقی میر نے لکھا ہے کہ طبیعت کا مجال ہزل کی طرف زیادہ تھا اپنے مداح امیر کلاں سے لوگوں کو ہنساتے اور خود مسکراتے رہتے کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

دیکھ رہیں ترچھی کمر کی طرف ۔ پھر گیا مانی اسی گھر کی طرف
جس نے دیکھے مرے لب شیریں ۔ نظر اُس کی نہیں شکر کی طرف
ہے محال اُس کا دام میں آنا ۔ دل ہے ان سب سال کا زر کی طرف

تیرے رخسار کی صفائی دیکھ  حسن دانا نہیں ہنر کی طرف
حسن میں بانکپن رہے باقی
بد عمل جائیں گے سقر کی طرف

اپنے ہمعصروں کی طرح رعایت لفظی ناجی کو بھی بہت مرغوب ہے۔ تھوڑا بہت جو کچھ کلام دستیاب ہوا ہے اس میں قدم قدم پر اس رشک کا زور و شور نظر آتا ہے مثلاً

رنگ تیرا گندمی دیکھ اور بدن مخمل سا صاف
ہوش کھو کر آدمی بھولے ہیں ایسے خورد و خواب

اُس کے رخسار دیکھ جیسا ہوں  عارضی میری زندگانی ہے
انا الحق لو لگتا ہے اس کے رحم کا مسل
کٹاری آبدار اس شوخ کی مصور جانی ہے

## مضمون

شیخ شرف الدین نام تھا اور مضمون تخلص کرتے تھے اکبر آباد اصل وطن تھا مگر دلی میں سکونت اختیار کر لی تھی تمام عمر ریختہ ہی کہا۔ سلسلۂ نسب کئی واسطوں سے شیخ فرید الدین شکر گنج سے ملتا ہے جس کا اشارہ مضمون نے خود اپنے کلام میں کیا ہے ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

کروں کیوں نہ شکر لبوں کو مرید  کہ داد ہمارا ہے بابا فرید

اس زمانہ میں سراج الدین آرزو مسلم الثبوت اُستاد تھے گو وہ مضمون سے عمر میں

یک رنگ

چھوٹے تھے مگر "بزرگی بعقل است نہ بہ سال" کے مقولہ کو مدنظر رکھ کر یہ اپنا کلام آرزو کو اصلاح کے لئے دکھاتے تھے مضمون خود ایسے صاحب فن اور باکمال شاعر تھے کہ ان کے مرنے کے بعد سودا نے اظہار افسوس اور اقرار کمال ان الفاظ میں کیا

بہائیں اُٹھ گئیں یار و غزل کے خوب کہنے کی
گیا مضمون دنیا سے رہا سودا سو مستانہ

کلام اس وقت کے عام پسند رنگ یعنی صنعت مراعاۃ النظیر میں ڈوبا ہوا ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو کہیں کہیں کلام ابتذال کی حد تک پہنچ جاتا ہے مضمون کا انتقال ۱۷۴۷ء میں ہوا۔

کرے ہے دار بھی کامل کو سرتاج
ہوا منصور سے یہ نکتہ حل اہ

نہیں ہیں ہونٹ تیرے یاں سے سُرخ
ہوا ہے خون میرا آ کے لب پر

کیا سمجھ بلبل نے ماندھا ہے چمن میں آشیاں
ایک تو گل نے وفا اور تس یہ جورِ باغباں

میکدہ میں گر سرایا فعل نامعقول ہے
مدرسہ دیکھا تو واں بھی فاعل و معقول ہے

ملا کشتی میں آگے سے جو وہ محبوب جاتا ہے
کبھی آنکھیں بھر آتی ہیں کبھی جی ڈوب جاتا ہے

# یک رنگ

غلام مصطفےٰ خاں نام اور یک رنگ تخلص تھا مرزا جان جاناں مظہر کو کلام دکھاتے تھے محمد حسین آزاد فرماتے ہیں "بزرگوں سے سُنا اور تذکروں میں بھی دیکھا بڑے مشاق تھے اور اپنے وقت میں سب اُنھیں خوش فکر اور باکمال مانتے تھے اور لطف یہ ہے کہ تخلص کی طرح عالم آشنائی میں بھی یک رنگ دیکھتا ہے" اُمرائے محمد شاہی میں تھے

اور بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے تاریخ وفات و ولادت کا پتہ نہیں چلتا کلام کا نمونہ یہ ہے :-

بک رنگ پاس اور سخن کچھ نہیں بساط
رکھتا ہوں دو میں جو کہو تو مدد کروں
اُس زلف کا یہ دل ہے گرفتار بال بال
یک رنگ کے سخن میں خلاف ایک مو نہیں
نہ کہو یہ کہ یار جاتا ہے　　دل سے صبر و قرار جاتا ہے

کلام علوے تخیل سے خالی نہیں مگر استعارات کی بھرمار اس زمانہ کے لوگوں کی طبیعت کو خوش نہیں کر سکی ان کا ایک دیوان یادگار ہے جو لوگوں کو مذاق طبیعت کے لحاظ سے مجاز و حقیقت دونوں کا مزا دیتا ہے

# آرزو

سراج الدین علی خاں کے متعلق ہر تذکرہ نویس نے جو کچھ لکھا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی قابلیت اور علمیت کا سکہ ہر دل پر جما ہوا تھا ان کے کلام سے اُن کی قابلیت اور علمی تبحر کا پتا چلتا ہے سب تذکرہ نویس اس بات پر متفق ہیں کہ انھیں علم معقول و منقول ہر چیز پر عبور تھا لیکن ان سب باتوں سے زیادہ جس چیز کی تعریف کی جاتی ہے وہ ان کے ذاتی محاسن اور اخلاق و عادات ہیں اُن کی شیریں زبانی اور علم مجلس کا ہر شخص کا معترف ہے

اُن کے متعلق مجموعہ نغز میں حکیم قدرت اللہ خاں قاسم نے دو ایک لطیفے لکھے ہیں جن سے ان کی قابلیت اور شاعرانہ طبیعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ آزاد نے بھی عالماً یہ

لطیفے اسی تذکرے سے لیے ہیں

(۱) لطیفہ :- ایک دن کہیں مشاعرہ ہو رہا تھا سوداؔ نے حاجی محمد جان قدسی کے پند شعر اس طرح ترجمہ کر کے پڑھے گویا مضمون خود ان کا ہے بہت سے لوگوں کو معلوم ہو گیا مگر سوداؔ کی ہجو گوئی کے خوف سے لوگوں نے خاموشی اختیار کی جاں آرزو ضبط نہ کر سکے بہت لطف سے یہ شعر پڑھا ؎

شعر سوداؔ احادیثِ قدسی ہے لکھ رکھیں چاہیئے فلک یہ ملک

مرزا اختیار ہو گئے اُٹھ کر خاں آرزو کے گلے ملے بات گئی گزری ہوئی

(۲) لطیفہ :- ایک دن ایک نوجوان جاں آرزو کے سامنے سے ہو کر گزرے۔ جب یہ بچے تھے تو جاں آرزو سے ربط تھا اُنھوں نے سلام تک نہ کیا آرزو نے فوراً یہ شعر کہا ؎

یہ شان یہ غرور لڑکپن میں تو نہ تھا
کیا تم جوان ہو کے بڑے آدمی ہوئے

آرزو کا اُردو کلام کہیں نہیں ملتا بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اُنھوں نے اُردو میں بہت کم کہا تھا ان کے چند شعر مجموعۂ نغز سے لکھے جاتے ہیں[۱]

کھول کر بند قبا کو ملکہ دل غارت کیا
کیا حصارِ قلب دلبر نے کھلے بندوں کیا

آتا ہے ہر سحر اُٹھ تیری برابری کو
کیسا دل لگے ہیں دیکھو خورشیدِ خاوری کو

---

[۱] مجموعۂ نغز مطبوعہ دارالاشاعت پنجاب ص ۲۵ و ص ۲۶

رکھے سیہ پارۂ دل کھول آگے عندلیبوں کے
جمیں ہیں آج گویا پھول ہیں تیرے شہیدوں کے

ارر لف سیاہ تو بدل دھوم پڑی ہے
درخانۂ آئینہ گھٹا جھوم پڑی ہے

اس شعر کو آرزو سے منسوب کرنے میں کچھ تکلف ہوتا ہے البتہ مرزا سودا نے اسے دوسرے طریقے سے بیان کیا ہے اور غالباً وہی صحیح ہے۔ ؎

اس زلف سیہ فام کی کیا دھوم پڑی ہے
آئینہ کے گلشن میں گھٹا جھوم پڑی ہے

# عمدۃ الملک امیر خاں انجام

ان کا تخلص انجام تھا باپ اُن کے اُمرائے عالمگیری میں سے تھے، جو ایک زمانہ میں عالمگیر کی طرف سے کابل کے صوبہ دار تھے انجام محمد شاہی دور میں الہ آباد کے صوبہ دار تھے طبیعت میں مذاق سخن اور لطیفہ گوئی بہت تھی شاعر اچھے تھے فارسی اُردو دونوں میں شعر کہتے تھے ان کا ایک خاص احسان اُردو پر یہ ہے کہ اس زبان کی ترقی کے لئے ایسی نگرانی میں ایک انجمن بھی قائم کی جس میں دکن کے فصلا اور زبان دان شریک ہوتے، الفاظ و محاورات پر بحث ہوتی اور بڑے رگڑے جھگڑے اور چھان بین کے بعد اس انجمن کے دفتر میں الفاظ و محاورات درج ہوتے اور پھر سارے ہند میں اس کی نقل بھیجی جاتی اور دیگر اُمرا اسی امیر کی تقلید کو فخر سمجھتے۔" [1]

---

[1] خطبہ صدارت نواب نصیر حسین خاں

علمی لیاقت کے لحاظ سے بہت کم شاعر اس قابلیت کے گزرے ہوں گے وہ صرف عربی اور فارسی زبان پر عبور رکھتے تھے بلکہ سنسکرت اور بھاشا کے بھی اُستاد سمجھے جاتے تھے افسوس ہے کہ محمد شاہ کے ہاتھ سے انجام کا انجام اچھا نہ ہوا ایوانِ شاہی میں ۱۱۵۹ھ قتل کر دیئے گئے۔ گھر بھی ضبط ہوا اور ظلم یہ ہوا کہ ان کا نادر کتب خانہ بھی برباد ہوا۔ جس کے ساتھ قیامت یہ ہوئی کہ ان کا کلام بھی تلف ہو گیا۔ جو کچھ باقی رہ گیا اُس میں سے چند اشعار نمونہ کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں۔ زبان کی لطافت اسلوبِ بیان اور محاورات کے صرف میں ان کا کوئی معاصر مشکل سے دکھائی دیتا ہے۔

کیوں لایا ہیٹر میں مجھ سے یہ نادانی ہوئی
دخترِ رز بزم میں آ شرم سے پانی ہوئی
کل محیطِ عشق کے صدموں سے پائی مُفتی نجات
کشتیِ دل بے طرح کچھ آج طوفانی ہوئی
ٹک تو فرصت دے کہ ہو لیں رخصت اے صیاد ہم
مدتوں اس باغ کے سایہ میں تھے آباد ہم
مُنہ ترا تکتے ہیں سب اقلیمِ حسن و عشق کے
تو ہی بتلا دے کریں کس سے تری فریاد ہم
ساتھ اپنے سر کے تھا انجام یاسِ ملکت
شکر ہے تڑپے نہ زیرِ خنجرِ جلاد ہم

بعض اشعار ان کے اب تک لوگوں کے زباں پر جاری ہیں مثلاً

دور سے آئے تھے ساقی سن کے میخانہ کو ہم　　پر ترستے ہی چلے اب ایک پیمانے کو ہم
کیوں نہیں لیتا ہماری تو خبر اے بے خبر　　کیا ترے عاشق ہوئے تھے درد و غم کھانے کو ہم

# دور کی خصوصیات

جس دور شاعری کے مختلف شاعروں کا ذکر کیا گیا اس کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ ولی کے علاوہ اس میں کوئی ایسا شاعر مشکل سے تھا جس نے زبان اور ادب کی کوئی خاص خدمت کی ہو ولی کے بعد اس دور کے شعرا نے شاعری کو زیادہ ترقی نہیں دی بلکہ اگر بنظر انصاف سے دیکھا جائے تو بجائے ترقی کے یہ دور انحطاط اور زوال کا تھا ولی سے اب تک بھاشا کے الفاظ کے علاوہ خاص چیز جو اردو میں لانے کی کوشش کی تھی وہ بھاشا کی شاعری کے جذبات تھے اردو کی عاشقانہ شاعری میں خاص طور پر ان خصوصیات کا اثر بڑا ولی کے وہ شعر جو بھاشا کے جذبات سے متاثر ہو کر لکھے گئے ہیں بہت خوب ہیں ایک آدھ شعر سے اس کا اندازہ کیجئے ؎

برا گی جو کہائے ہیں اُنھیں گھر بار کر ما کیا
ہوئی جو گن جو گئی پی کی اسے سنسار کرنا کیا

ترے سن مجکوں اے ساجن نو یو گھر بار کرنا کیا
اگر تو ناچہے مجکوں تو یو سنسار کرنا کیا

سلوے سالو رے میتم رے موتی کی جھلکاں سے
کیا عقد ثریا کوں حراب آہستہ آہستہ

ولی کے بعد اس دور کے شاعروں نے ہندی کی تقلید تو کی لیکن جو چیز ہندی میں سب سے اچھی تھی اُسے چھوڑ دیا جذبات نگاری اور اس کے ادا کی پرواہ نہ کی

بلکہ ہر بات میں فارسی کی تقلید کرنے لگے اور لطف یہ کہ اس کے باوجود بھی زبان کو صاف کرنے کی طرف بہت کم توجہ کی حالات فارسی سے لئے مگر الفاظ وہی بھاشا کے استعمال کرتے رہے غیر مانوس متروک اسی طرح کام میں لاتے رہے اور یہ کام آئندہ والوں کے لئے چھوڑ دیا اس میں شک نہیں کہ دوسرے دور کے شاعروں نے اس کام کو بڑی خوبی سے انجام دیا

اس دور کی تیسری خصوصیت ایہام گوئی ہے جو ہندی کے دوہروں سے آئی اس نے میرے ہماری شاعری میں خرابیاں پیدا کرنی شروع کر دیں بے تکلفی اور سادگی کی جگہ ایہام نے لے لی اور سیدھی سادی بات کو دو معنی بنانے کی فکر میں شاعروں نے اثر و لطف کا سرمایہ اپنے ہاتھوں سے کھو دیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آئندہ آنے والوں نے اصلاح زبان کی طرف بہت توجہ کی لیکن اظہار کمال کے شوق میں ایہام گوئی کے چسکے سے وہ بھی نہ چھوٹ سکے

اس کے باوجود بھی اس دور کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ جہاں ان شاعروں نے لطف اور ایہام کو اپنا مطمح نظر نہیں بنایا وہاں کلام میں بے حد لطف اور اثر پیدا ہو گیا ہے سیدھے سادے جذبات آسان سے آسان الفاظ میں بیان کر دیئے ہیں اس لئے وہ پڑھنے والے پر اثر کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ مثلاً

حال کے زمانے کی سحر کیا زیادتی کہیئے
کہ اس ظالم کی جو ہم پر گھڑی گزری سو جگ بیتا

کچھ ٹھہرتی نہیں کہ کیا ہوگی　　اس دل بے قرار کی صورت

ہم نے کیا کیا نہ ترے عشق میں محبوب کیا　　صبر ایوب کیا گریۂ یعقوب کیا

میرا پیغام وصل اے قاصد
کہیو سب سے اُسے جُدا کر کے

اس کے علاوہ اس دور کے شاعروں کے یہاں تصوف کا رنگ نمایاں طور پر نظر آتا ہے اس لئے کہ فطرتاً اس دور کے شعراء صوفی تھے اور اس عہد کی فضا میں تصوف چھایا ہوا تھا

(۳)

# حاتم

ظہور الدین نام تھا اور حاتم تخلص مضمون ناجی اور آرزو کے ہمعصر تھے باپ کا نام ضیاء الدین تھا ۱۱۱۱ھ میں پیدا ہوئے جیسا کہ ان کے نام (ظہور) کے اعداد سے ظاہر ہوتا ہے اصل وطن شاہجہاں آباد ہے ایک جگہ کہتے ہیں ؎

دل یہاں پھرتا ہے حاتم کا عجب اشرف کے بیچ
گو وطن ظاہر میں اس کا شاہجہاں آباد ہے

ابتدا میں سپاہی پیشہ تھے جس کی بدولت نواب امیر خاں محمد شاہی کی سرکار میں ملازمت حاصل کی سرمادل علی شاہ کے تکیہ میں اکثر فقیر جمع ہوا کرتے تھے یہ بھی وہاں جانے اور برابر ایا دت گزارنے صحبت نے اثر کیا اور خود بھی ایک آزاد مست فقیر ہو گئے شاعری کا چسکا بچپن ہی سے تھا پہلے زمر تخلص کرتے تھے بعد میں حاتم ہو گئے قابلیت کا یہ حال کہ زمانے نے ان کو نہ صرف دہلی اسکول کا بانی قرار دیا بلکہ جگت اُستاد بھی تھا اُن کے شاگردوں کی فہرست پر جب نظر پڑتی ہے تو اس خیال کی ایک حد تک تائید بھی ہوتی ہے جس کا شاگرد سودا ایسا استاد ہو اس کو جگت استاد کہنا غلط ہے، صرف سودا ہی ان کے شاگرد نہ تھے بلکہ اور بھی ممتاز شعرا ان کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرتے تھے سعادت یار خاں رنگین، مانا لال مکند رائے فارغ وغیرہ حاتم کی خدمت میں اصلاح سخن کے لیے حاضر ہوتے اور فخر کرتے صحامت کے لحاظ سے حاتم کا کلام بہت بڑا ہے

جس میں قصائد رباعیات غزلیات سب ہی کچھ ہیں

آخر عمر میں اس ضخیم کلیات سے ایک چھوٹا دیوان مرتب کیا جس کا نام دیوان زادہ رکھا جس کے متعلق آزاد لکھتے ہیں کہ "وہ صاحبزادہ بھی پانچ ہزار سے زیادہ کا مال لعل میں دبائے بیٹھا ہے"

اس دیوان زادہ میں حاتم نے حمد الفاظ ترک کر دیئے ہیں جو ان کے دیوانِ قدیم میں پائے جاتے ہیں مثلاً ور بر اور وغیرہ کیونکہ یہ الفاظ اردو میں غیر مانوس نظر آتے تھے ان الفاظ کے استعمال سے بھی گریز کیا ہے جو اصلاً عربی تھے لیکن تلفظ اور ہجے کے لحاظ سے ہندی ہو گئے تھے مثلاً تسبیح کو تسی دیح کو بھی لکھنا حاتم نے صحیح نہیں سمجھا

تیسری اصلاح بھی ان کی قابلِ قدر ہے عربی و فارسی کے حروف جو اردو میں نہ تھے ان کو بھی نامناسب سمجھ کر ترک کر دیا مثلاً بیگانہ کو بگانہ دیوانہ کو دوانا۔ حاتم کے نزدیک اُردو میں لکھنا معیوب ہے مگر ان اصلاحات پر عرصہ تک عمل درآمد نہ ہوا یہاں تک میرے خود "دوانہ" وغیرہ استعمال کیا ہے لیکن ناسخ کے وقت میں ان اصلاحات پر پوری توجہ ہوئی

حاتم نے ہندی کے بھی ثقیل الفاظ اردو میں استعمال کرنے سے گریز کیا ہے۔ مثلاً ادھر کدھر وغیرہ ترک کر دیا مختصر یہ کہ حاتم نے فصاحت اور زبان کی صفائی کو بہت زیادہ مدنظر رکھا یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار میں روزمرہ اور فصاحت اور دل سے زیادہ ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ کبھی کبھی زائد الفاظ شعر میں استعمال کرتے ہیں۔

حاتم کا انتقال ۹۶ برس کی عمر میں ماہ رمضان ۱۲۰۰ھ میں ہوا اور دلی دروازہ کے باہر دفن ہوئے مصحفی کو اس سال وفات سے اختلاف ہے وہ ۱۱۹۶ھ میں ان کا مرنا بتاتے ہیں کلام کا نمونہ یہ ہے۔

اے خرد مند و مبارک ہو تمہیں فرزانگی ہم ہوں اور صحرا ہو اور وحشت ہو اور دیوانگی

دعاؔ

بے مروت بے وفا بے دید بے آشنا — آشناؤں سے نہ کرے رکھی وہ بے گانگی
ملک دل آباد کیوں کر ہے حاتم کا خراب — اے مری بستی اجڑتی آتی ہے تجھے ویرانگی

رہ گئی درد سر ہوئی حاتم
کب ملے گا مجھے پیا میرا

ہجر کی رہ گئی سے موت بھلی
کہ جہاں سب کہیں وصال ہوا

نواب عمدہ الملک امیر خاں بہادر کی سرمائش سے حاتم نے ایک مثنوی قہوہ کی تعریف میں لکھی تھی یہ مثنوی اس لئے قابل قدر ہے کہ شمالی ہند میں اس سے پہلے کوئی مسلسل نظم نہیں ملتی اس حیثیت سے حاتم کو اولیت کا مرتبہ حاصل ہے[1]

# فغاںؔ

اشرف علی خاں نام فغاںؔ تخلص تھا احمد شاہ بادشاہ دہلی کے "کوکا" تھے طبیعت میں ظرافت اور مزاح فطرت سے لے کر آئے تھے چنانچہ بادشاہ کی طرف سے "ظریف الملک کوکا خاں بہادر" کا خطاب تھا ابتدائے عمر سے شعر کہنے کا شوق ہوا مصحفی نے ان کی گنتی اُردو کے ممتاز شعرا کے برابر رکھ دی ہے
میر تقی میر نے انھیں قمر لباس خاں احمد کا شاگرد لکھا ہے مصحفی انھیں مدہم کا شاگرد

---

[1] مضمون ڈاکٹر زور ہندوستانی جنوری ۱۹۳۲ء

بتاتے ہیں اور فغاں نے بھی ایک آدھ جگہ اس کو تسلیم کیا ہے ایک جگہ کہتے ہیں۔

دشت جنوں میں کیوں نہ پھروں میں برہنہ پا
اب تو فغاں مدبم مرا رہنما ہوا

اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے مختلف دنوں میں دونوں کے شاگرد رہے ہوں کیونکہ اس شعر میں "اب تو" سے حال ہوتا ہے کہ اس سے پہلے اُمتد کے شاگرد رہے ہوں

احمد شاہ درانی کے حملوں نے دلی اور اہلِ دلی دونوں کو تباہ و برباد کر دیا فغاں نے بھی دلی کو خرباد کہہ کر مرشد آباد کی راہ لی۔ وہاں ان کے محاایر رح جاں صاحب اقتدار تھے کچھ دن ان کے پاس رہے پھر وہاں سے فیض آباد آئے گو دلی اُجڑ چکی تھی مگر بقول آزاد "دلی کا آدمی کہیں جاتا تھا تو لوگ اس کو ایسا سمجھتے تھے گویا پیرزادے آئے بلکہ اس کی نسبت رجاست کو سلیقہ اور اشعار کا دستور العمل سمجھتے تھے" چنانچہ ان کو بھی نواب شجاع الدولہ نے بہت اعزاز و اکرام کے ساتھ رکھا لیکن مارک مراجی نے یہاں بھی چین نہ لینے دیا۔ ایک دن نواب کے ہاتھ سے فغاں کا ہاتھ جل گیا یہ آگ بگولہ ہو کر عظیم آباد چلے گئے وہاں راجہ شتاب رائے نے بہت قدر کی یہاں تک کہ فغاں نے ساری عمر وہیں بسر کر دی ۱۱۸۶ھ مطابق ۱۷۷۲ء میں اس دنیا سے انتقال کیا کلام کا نمونہ یہ ہے۔

صنم بتا تو خدائی کا تجھ کو کیا نہ ہوا
ہزار شکر کہ تو بُت ہوا خدا نہ ہوا
کہاں ہو گیا آخر کو کچھ بُرا نہ ہوا
عجب نہ دل سے جلا تو بھی بے مزا نہ ہوا

شگفتگی سے ہے غنچہ کے تئیں پریشانی
بھلا ہوا کسی کافر تو مجھ سے دانہ ہوا

موا نہ میں حیا آخر کو ہیم بسمل ہو
غضب ہوا مرے قاتل کا مدعا نہ ہوا

لپٹ ہوا ہوں نصیحت بہت ہوا ہے خراب
ترے طفیل اے خانہ خراب کیا نہ ہوا

طرف سے اپنی تو نیکی میں ہے مرا صاحب
مری بلا سے دعا آں کا اگر بھلا نہ ہوا

# مظہر جانجاناں

نام مرزا جانجاناں تھا اور تخلص مظہر تھا والد کا نام مرزا جان تھا جو عالمگیر کے دربار میں صاحب منصب تھے سلسلۂ نسب محمد ابن حنیفہ سے ملتا ہے جو حضرت علی کے بیٹے تھے ماں بیجاپور کے ایک شریف گھرانے سے تھیں

۱۱۱۱ھ میں جب شاہ عالمگیر دکن میں فوج لئے پڑا تھا تو خبر آئی کہ مرزا جان کے بیٹا بمقام کالا باغ علاقہ مالوہ میں پیدا ہوا جب عالمگیر کو خبر ہوئی تو فرمایا کہ :
"پسر جان پدر می باشد" باپ مرزا جان ہے ہم نے لڑکے کا نام "جان جاناں" رکھا افسوس کہ مرزا جاناں کو سایۂ پدری سے عنوان شباب ہی میں محروم ہونا پڑا۔ ابھی یہ صرف اٹھارہ برس کے تھے کہ مرزا جان انتقال کر گئے مگر شفقت خداوندی راہ نما ہوئی مرزا جان جاناں نے ۳ برس کی عمر تک مدرسوں اور خانقاہوں

میں جاروب کشی کی اہلِ علم سے حدیث اور فقہ حاصل کیا اُس زمانہ میں ہر طرف تصوف کا چرچا تھا ان کا بھی رجحان تصوف کی طرف ہوا چنانچہ ہزاروں ہندو، مسلمان اُن کے مرید ہوئے تصوف کے لئے قناعت و استغنا لازمی ہے ان کے مزاج میں یہ باتیں روزِ ازل سے خمیر ہو گئی تھیں اُمرا اور بادشاہوں کی بھی نذر بس قبول نہ کرتے تھے حتیٰ کہ دقیرانہ زندگی بسر کی۔ دس محرم ۱۱۹۵ھ کو ایک شخص کے ہاتھ سے قتل ہو کر راہی ملک بقا ہوئے سودا نے تاریخ کہی۔

مرزا کا ہوا جو قاتل ایک مرتدِ شوم
اور ان کی ہوئی خبر شہادت کی عموم
تاریخ از دردِ درد یہ سُن کے کہی
سودا نے کہ ہائے جاں جاناں مظلوم
۱۱　ھ　۹۵

اُن کی بزرگی کا یہ عالم تھا کہ بڑوں بڑوں نے ان کے آگے سر جھکایا میر تقی میر اور شیخ علی حزیں جو ہر شخص کو اپنے سے کمتر جانتے تھے انھیں نہایت پُر تعظیم لفظوں میں یاد کرتے ہیں

مرزا مظہر کے شاگردوں میں چند مشہور اُستاد گزرے ہیں انعام اللہ خاں یقین میر محمد باقر حزیں لالہ سیدآر خواجہ اسد اللہ خاں بیان۔

مرزا مظہر کا ایک دیوان فارسی میں ہے اُردو میں بھی دیوان ہے مگر ناتمام و نایاب

مرزا مظہر کے کلام میں علاوہ اور باتوں کے ایک خصوصیت یہ بھی نمایاں ہے کہ انھوں نے ایہام سے بہت گریز کیا ہے اور بعض لوگوں کا تو یہ خیال ہے کہ مرزا مظہر پہلے شخص ہیں جنھوں نے صنعتِ ایہام کے طوفان سے زبان

کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ کلام میں درد و کیف بہت کافی ہے زبان نہایت پاک اور شستہ ہے دہلی کے خاص محاورات نہایت خوبی سے نظم کرتے ہیں کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

چلی سب گل کے ہاتھوں سے لٹا کر کارواں اپنا
نہ چھوڑا ہائے بلبل نے چمن میں کچھ نشاں اپنا
یہ حسرت رہ گئی کس کس مزے سے زندگی کرتے
اگر ہوتا چمن اپنا گل اپنا باغباں اپنا
میرا جی جلتا ہے اس بلبل بے کس کی غربت پر
کہ جس نے آسرے پر گل کے چھوڑا آشیاں اپنا

ہم نے کی ہے توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار
ہائے کس جلتا نہیں کیا مفت جاتی ہے بہار

نہ بلبلوں کا صبا مشہد مقدس ہے
قدم سنبھال کے رکھیو ترا یہ باغ نہیں

الٰہی کب کسو کے میں ریح انتظار آوے
ہمارا دیکھئے کیا حال ہو جب تک بہار آوے

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو
یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

## دور کی خصوصیات

اس دور میں خواص وقت پر بحث ہے اُردو کی خاطر خواہ خدمت کی گئی اس سے پہلے اُردو شاعری میں ایہام گوئی کا کافی غلبہ ہو گیا تھا جس کے جال میں شعرا ایسے پھنس گئے تھے کہ دوسرے میدان میں قدم اٹھانا دشوار ہو گیا تھا مگر اس کو آپ اعجاز کہئے یا اُردو کی طبیعت کی لطافت سے تعبیر کیجئے کہ کوئی مدعا دھیرے اپنے دامن پر زیادہ دنوں تک نہیں دیکھ سکتی رہاں کی عمر میں ۵۰ ۶۰ سال زیادہ نہیں ہوئے مگر کسی دور کو لے لیجئے آپ دیکھیں گے کہ اتنی ہی مدت میں ایسے عیوب جن پر زمانے نے حرف زنی کی ہو اُردو نے عمداً اُسے دامن سے دور کر دیا ہے

ایہام گوئی بھی زیادہ دنوں تک ایسا طلسم قائم نہ رکھ سکی لوگوں کو احساس ہوا اور اصلاح پر کمر بستہ ہو گئے حاتم اور مظہر دونوں اہم سرخیل مصلح تھے حاتم نے ثقیل الفاظ اور عیوب قافیہ کو رفع کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا شاہ مبارک آبرو وغیرہ کے رنگ میں خود دیوان لکھا تھا اُسے منتخب کر کے دیوان زادہ تیار کیا جس کا ذکر اُن کے تذکرہ میں آ چکا ہے شاہ مبارک آبرو کے یہاں سنتی اور صاد کے قوافی بھی رائج تھے حروف کا دبا معمولی بات تھی مگر حاتم نے سب کو ناجائز قرار دیا ایہام گوئی کی روک تھام مرزا مظہر نے کی اور نہایت شد و مد کے ساتھ اس جارحانہ جھاڑی سے اُردو کے نوخیز پودے کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی۔

کسی بانی اصلاح کو مشکل سے یہ کامیابی ہوتی ہے کہ اپنی زندگی ہی میں اسی کوششوں کو پوری طرح بار آور دیکھے حاتم اور مرزا مظہر دونوں کی اصلاحیں میر و سودا کے ہاتھوں سے مایۂ تکمیل کو پہنچیں لیکن یہ خوش نصیبی ہی حضرات کو نصیب ہے کہ اسد اللہ ہی کے دم سے ہوئی زمانہ کو رغبت کے بجائے الفاظ کی خراسوں اور ایہام گوئی وغیرہ سے تنفر پیدا ہو گیا حاجت سودا نے جب شاہ مبارک آبرو وغیرہ کے رنگ میں طبع آزمائی کی ہے تو ایک مقام پر گھبرا کر کہتے ہیں :-

حکاک کا یسر بھی مسیحا سے کم نہیں
میر وزہ ہوئے مردہ تو دیوے ہے وہ جلا
نہیں چھوڑتا ہے اشک مرا دامن دکسار
یہ طفلِ بد سرشت ہے گہوارہ سے پلا
ساکی نہیں خدا سے ہی گر یہ سکل زشت
ممکن نہیں کمہار کا ماٹی کرے گلا
غم سے حسرت کے خونِ جگر چھیٹ اب لے نسیم
بچے گلوں کے کچھ نہیں کھائے انھیں بھلا
اسلوب شعر کہنے کا سرا نہیں ہے یہ
مضمون و آزرد کا یہ سودا ہے سلسلا

اس دور کے شعرا کا بیان سیدھا سادا اور بڑی حد تک بیچرل ہے جو جی پر گذرتی ہے مہارت اور مریدار الفاظ میں کہہ جاتے ہیں

(۴)

# سودا

ان کا نام مرزا محمد رفیع تھا ان کے باپ کا نام مرزا محمد شفیع تھا میرزا شفیع تجارت کے سلسلے میں ہندوستان آئے اور یہیں رہ گئے تجارت سے ان کو دولت مند و فارغ البال کر دیا تھا اتنا زیادہ اعزاز تھا کہ نعمت خاں عالی کی لڑکی سے ان کی شادی ہوئی سودا اسی کے بطن سے پیدا ہوئے۔ سودا کے سالِ ولادت میں اختلاف ہے لیکن گمان غالب ہے کہ وہ ۱۱۰۹ھ اور ۱۱۲۴ھ کے درمیان پیدا ہوئے اور دہلی میں تعلیم و تربیت پائی باپ کے مرنے کے بعد جب ترکہ کی دولت اڑا چکے تو گذر اوقات کے لئے فوج میں سپاہی ہو گئے مگر جلد ہی اس ملازمت سے دست بردار ہو گئے خاندانی اعزاز اور اپنی قابلیت کی وجہ سے بادشاہوں اور اُمراء کا تقرب حاصل ہو گیا

اپنا کلام پہلے سلیمان قلی خاں داؔد کو دکھایا پھر شاہ حاتم کے شاگرد ہوئے سودا نے پہلے فارسی میں شعر کہنا شروع کیا اور اس میں وہ درجۂ کمال حاصل کیا کہ بڑے بڑے استادوں سے خراج تحسین وصول کیا یہاں تک کہ شاہ عالم بادشاہ اپنا کلام اصلاح کے لئے دینے لگے جب تک ہو سکا دہلی کو مادرِ وطن سمجھ کر وہیں رہے مگر ایک زمانہ آ گیا کہ دلی کو خیرباد کہنا ہی پڑا

سودا کے سرپرستوں کی بھی حالت دگرگوں ہوئی ناچار دل پر صبر کا پتھر رکھ کر دہلی کو خیرباد کہا اور فرح آباد میں نواب بنگش کے یہاں آ کر قیام کیا کوئی سترہ سال

تک یہاں آسودگی سے بسر کی اس کے بعد فیض آباد آکر شجاع الدولہ کے دربار میں عزت حاصل کی اور باقی عمر لکھنؤ میں گزار دی ستر برس کی عمر میں یعنی ۱۱۹۵ھ میں انتقال کیا

شاہ حاتم زندہ ہے سودا کے انتقال کی خبر سن کر بہت روئے کہا افسوس ہمارا پہلوان سخن" مر گیا

سودا ایسا دل و دماغ لے کر آئے تھے کہ اردو کے بہت کم شاعروں کو ایسی نعمتیں ملی ہوں گی طبیعت کی ہمہ گیری اور جولانی شاعری کے جس میدان میں ایسا رنگ دکھاتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ سودا کو ہر صنف سخن پر قدرت حاصل ہے اردو کے اکثر اصناف شاعری پر انھوں نے کامیابی کے ساتھ طبع آزمائی کی ہے قصائد اور ہجو میں وہ نام پیدا کیا کہ آج تک کوئی جواب نہ ہو سکا

غزل میں ان کا خاص رنگ یہ ہے کہ "کلام[1] کا زور مضمون کی نزاکت سے ایسا دست و گریباں ہے جیسے آگ کے شعلے میں گرمی و روشنی" الفاظ ایسی جگہ پر اس طرح جما دیتے ہیں کہ اگر ایک لفظ بھی شعر میں ادھر کا ادھر رکھ دیجئے تو سارا شعر بے لطف ہو جاتا ہے جب تک آپ الفاظ کی ترتیب اصلی طریقہ پر نہ دیجئے گا پورا لطف شعر کا نہیں حاصل ہو سکتا سودا کے شعر میں بندش نہایت سخت ہے مضمون اور درد کا بھی حصہ کچھ کم نہیں ہے تاثیر جس کی جاتی اردو غزل کے لئے ضروری سمجھی گئی ان میں بھی سودا نہایت ممتاز رتبہ رکھتے ہیں ان کے یہاں تشبیہ اور استعارے کبھی کبھی ایسی چیزوں سے پیدا کئے جاتے ہیں جو خاص لطف دے جاتے ہیں

سودا کے کلام میں ہندوستان کے رنگ و بو کا بھی کافی حصہ ہے یعنی فارسی شعرا کی تقلید میں ہندوستان کے رسوم، اشخاص وغیرہ کو نظر انداز نہیں کیا ان کا بھی نام آتا ہے ساون سے بھی لطف اندوز ہوتے ہیں کرشن اور دوسرے مقدس لوگوں کا بھی حوالہ جابجا

---

[1] آب حیات۔

کلام میں دیے ہیں یہ صحیح ہے کہ ہندی کے ثقیل الفاظ انھوں نے نکال ڈالے مگر ان کے بدل بھی بیش کئے یعنی فارسی کے محاورات کے ترجمے اردو میں نظم کیے۔ مثلاً لوکرون سے، لوکرنا یعنی سونگھنا جیسا کہ ایک شعر میں کہتے ہیں :-

دیکھوں نہ کبھی گل کو ترے منھ کے میں ہوتے
سنبل کے سوا زلف تری تو نہ کروں میں

سودا کا زمانہ شعر اسا اچھا تھا کہ ہندی کے ملائم الفاظ کو ترک کرنا گناہ سمجھتے تھے ان کو برابر استعمال کرتے رہے۔ پریت۔ رائی وغیرہ آپ کو اکثر ان کے کلام میں مل جائیں گے ان کی اس روش کو اگر درد و داغ ترک نہ کرتے تو موجودہ اردو ادب کو مصمون نگاری وغیرہ میں بہت کچھ سہولت حاصل ہو جاتی سودا نے رباعی، مرثیے، عربیں تہمیں آستوں بھی کہے ہیں لیکن ان کے قصائد ہر چیز پر بھاری ہیں ناانصافی ہوگی کہ اگر ان کے قصائد کی خصوصیات بیان کیے بغیر ان کا تذکرہ ختم کیا جائے مختصر طور پر ان کی خصوصیات حسب ذیل ہیں -

۱ ردیف مشکل منتخب کرتے ہیں لیکن مناسب الفاظ سے دلاویز بنا دیتے ہیں

۲ قصیدے کی شان کو پوری طرح قائم رکھتے ہیں یعنی متانت، سنجیدگی، زور الفاظ، مضمون آفرینی، علو تخیل جتنا ان کے قصائد میں ہیں وہ کسی اور کے یہاں نہیں ملتے۔

۳ استعارے اور تشبیہوں کے صرف میں جدت و ندرت سے کام لیتے ہیں

۴ سودا کے قصائد میں محاکاتی شاعری نہایت خوبی کے ساتھ موجود ہے جو اردو کے دوسرے قصیدہ کہنے والوں کو بہت کم نصیب ہوئی

۵ سودا کے قصائد میں مدح اور ہجو کے علاوہ تاریخی واقعات بھی ہیں

۶ سودا کی جدت پسند طبیعت نے ہمارے تمہید کو پامال سمجھ کر نئے عنوان بھی پیش کیے ہیں

یہ وہ خصوصیات اُن کے قصائد کی ہیں جو سوداؔ کو نہ صرف اُردو کے شعرا سے ممتاز کر دیتی ہیں بلکہ ان کو فارسی کے بہترین قصیدہ گو کے برابر رکھتی ہیں

یہی حال ہجو کا بھی ہے غالباً مرزا سوداؔ پہلے شخص ہیں جنھوں نے ہجو کو اس قدر تندو تیز کے ساتھ اُردو میں نظم کیا ہجو کا استعمال اگر اچھی طرح کیا جائے تو کارآمد باتیں بھی پیدا ہو سکتی ہیں، مذاق اُڑا کر عیوب دور کئے جا سکتے ہیں، ذاتیات کو الگ کر کے عالمگیر اصلاحات بیں کئے جا سکتے ہیں برائیوں کو چھوڑ کر سوداؔ کے یہاں حسب ذیل خوبیاں ہیں

(۱) ان کی ہجو میں اس زمانہ کے تمدن کا بھی نقشہ نظر آتا ہے۔ شرفاء و امراء کی زوی حالت، غریبوں کی مفلسی، دہلی کے کوتوال کا ظلم یہ سب مناظر آپ کو ہجو کے میدان میں مل جائیں گے

(۲) ماکیرہ تمسخر اور شائستہ مذاق کا ایک اچھا دخیرہ ان کی ہجو میں پایا جاتا ہے

(۳) ان کے کمال اور الفاظ پر حاکمانہ تصرف کا اندازہ ہوتا ہے اچھے بُرے خیالات کو ان کی جگہ پر موزوں الفاظ میں جس کے ساتھ نظم کر دینا سوداؔ کا خاص کارنامہ ہے

(۴) سوداؔ کے مزاج کی شگفتگی اور اُفتادِ طبیعت کا پتہ ان کی ہجوؤں سے ملتا ہے یہ رنگ آخر وقت تک قائم رہا ہے اور لطف یہ کہ اگر کوئی ان پر ہجو کہتا تو بہت خوش ہو کر داد دیتے

سب کچھ لکھنے کے بعد سوداؔ کے مرثیوں کا تذکرہ بھی ضرور ہے مرثیہ تاریخ ادب کا ایک ایسا اہم جزو بن گیا ہے کہ ہمیں اس کی ابتدا اور ترقی کا مطالعہ ہر اعتبار سے کارآمد معلوم ہوتا ہے سوداؔ نے یہاں بھی اپنی جدت طراری کا ثبوت دیا ہے اب تک مرثیوں کی شکل غزل یا ایسی ہی دو ایک شکلوں تک محدود تھی انھوں نے اُسے مربع، مخمس، مسدس، مسترزاد وغیرہ تمام شکلوں میں پیش کیا انھوں نے مرثیہ کو مذہبی دائرے ہی تک محدود نہیں رکھا بلکہ مرقع نگاری، جذبات نگاری، منظر نگاری وغیرہ کا اضافہ کر کے ادب کے لئے بھی ایک خاص چیز بنا دی۔ اُس عہد میں بہت سے مرثیہ نگار تھے

لیکن سودا کی حیثیت مرثیہ نگاری میں بھی ان کے ہمعصروں سے ممتاز ہے
کہا جاتا ہے کہ مرثیہ کو مسدس کی شکل میں پہلی بار پیش کرنے کا فخر سودا کو حاصل ہے لیکن یہ حال تحقیق طلب ہے سودا کے زمانے ہی میں کئی ایک مرثیہ گو تھے مثلاً میر تقی میر افسردہ وغیرہ اور ان سبھوں کے مرثیے مسدس کی شکل میں پائے جاتے ہیں اس لئے قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ پہل کس شاعر نے کی، البتہ سودا کی حدت پسندی کو مدنظر رکھتے ہوئے قیاس یہی کہتا ہے کہ ممکن ہے سودا ہی نے پہلے پہل مرثیہ کو مسدس کی شکل دی ہو

## درد

ان کا نام سید خواجہ میر اور تخلص درد تھا ان کے والد کا نام خواجہ محمد ناصر تھا اور عندلیب تخلص کرتے تھے فارسی کے اچھے شاعر تھے۔ سلسلۂ نسب خواجہ بہاؤ الدین نقشبندی سے ملتا ہے خواجہ میر درد دلی میں پیدا ہوئے اور والد کے اثر سے شاعری اور تصوف کے ورثہ دار ہوئے۔

تصوف و تالیف کا شوق بچپن ہی سے تھا چنانچہ ایک رسالہ پندرہ برس کے سن میں احکام الصلوٰۃ لکھا اٹھیس برس کی عمر میں واردات درد نام کا ایک اور رسالہ لکھا کئی تصنیفات درد کی یادگار ہیں اردو کے علاوہ فارسی میں بھی ایک دیوان ہے آزاد ان کے کلام کے متعلق فرماتے ہیں "خواجہ میر درد صاحب کی غزل سات شعر نو شعر کی ہوتی ہے مگر انتخاب ہوتی ہے خصوصاً چھوٹی چھوٹی بحروں میں جو اکثر غزلیں کہتے ہیں گویا تلواروں کی آبداری نشتر میں بھر دیتے ہیں خیالات اُن کے سنجیدہ اور متین تھے کسی کی ہجو سے زبان آلودہ نہیں ہوتی"۔ ان کی شاعری کا مرتبہ بہت بلند ہے اور ہم مصنف کا شفا الحقائق،

کی رائے سے اتفاق کرتے ہیں کہ درد اور کسک میں سوز و گداز میں درد کی غزلیں میر کی غزلوں کے دوش بدوش ہیں فرق یہ ہے کہ میر کے یہاں ایک خستگی اور کھلی ہوئی سپردگی ہے اور درد اسے کوئے دیتے رہتے ہیں

ان خوبیوں کے علاوہ میر درد کا نام تصوف کے اعتبار سے غالباً اردو کے کسی شاعر سے کم نہیں اکثر دقیق مسائل کو نہایت مزے اور اختصار کے ساتھ نظم کرتے ہیں۔ ہم نے ایک کتاب[1] میں درد کے تصوف پر کافی بحث کی ہے یہاں موقع نہیں کہ اس موضوع پر اور گفتگو کی جائے مگر اتنا کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ قول آزاد کے "تصوف جیسا اکھوں نے اردو میں آج تک کسی نے نہیں کہا" گو اس کا اردو کا دیوان مختصر سا ہے لیکن اصلیت اور سادگی کے ساتھ خیالات میں بلندی اور جذبات کی جو تاثیر ہر جگہ آپ کو ملے گا۔ الفاظ اور ترکیب استعمال کرتے ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو الفاظ اور محاورے سارے ملک میں مروج ہیں انھیں درد نے ترک کیا ہے کہیں کہیں ثقیل الفاظ ضرور ملتے ہیں مگر وہ اس خوبی سے برتے گئے ہیں کہ اسعار ما حرش گوار نہیں ہوتے

یہ درد کی ایک بڑی خوبی اور عجوبہ ہے کہ ان کے یہاں عشق حقیقی کا جلوہ ایسا عالم ہے کہ جاری کسی اور کو کہیں جگہ نہیں ملتی روحانیت سے جذبات کو اس طرح مالا مال کیا ہے جس طرح سان سے کیا ہے درد کی جانی ہے ان کی فارسی اور اردو کی ہمعصروں کے دل میں گھر کر لیا تھا خواجہ میر درد کا انتقال ۱۲ محرم ۱۲۰۰ھ مطابق ۱۷۸۵ء کو ۶۶ برس کی عمر میں دہلی میں ہوا۔ ان کے مزار اب تک زیارت گاہ خاص و عام ہے

---

[1] آئینہ معرفت یعنی اردو شاعری میں تصوف

# سوز

سوز تخلص سید محمد میر نام بزرگوں کا وطن بخارا تھا سوز دہلی میں پیدا ہوئے، اور وہیں نشو و نما ہوئی شاہ عالم کے زمانہ میں جب دہلی پر سیاہی آئی تو فقیر نے لکھنؤ سدھارے یہاں بھی زمانہ چین لینے نہ دیا ۱۲۱۲ھ میں مرشد آباد گئے وہاں سے پھر لکھنؤ کی خاک دامن کھینچ کر اسی طرف لائی صاحب کمال کا جوہر اسا رنگ دکھائے بغیر نہیں رہتا اس بار میر سوز لکھنؤ آئے تو کافی قدر ہوئی نواب آصف الدولہ سخا گو ہوتے مگر افسوس کہ زیادہ دن تک لکھنؤ میں نہ رہنے پائے تھے کہ ۱۲۱۳ھ میں اس دنیا سے کوچ کر گئے اور وہیں بیوندِ خاک ہوئے

سوز کا کلام تصنع اور تکلف سے پاک ہے غزل کے لئے سرمہ زبان حال ہے وہ ان کے یہاں کافی موجود ہے محاورات کا صرف اس خوبی سے ہے کہ بالوں بالوں میں سحر بلند ہوتا ہے ان کے یہاں خاص بات یہ ہے کہ اضافت، تشبیہ، استعارے ارتی ترکیبیں بہت کم ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ میر سوز کا رجحان فارسی کی رنگینی کے بجائے ہندی کی سادگی اور خدا داد حسن کی طرف تھا آزاد نے سچ کہا تھا کہ "اگر ان اشعار پر زبان رہتی اور خوب سیان کا زیادہ اس میں زیادہ ہوتا تو آج ہمیں اس قدر دشواری نہ ہوتی اب دوسری مشکلیں ہیں، اول یہ کہ رنگین استعارات اور مبالغہ کے خیالات گویا مثل تکیہ کلام کے زبانوں پر چڑھ گئے ہیں یہ عادت چھڑانی چاہیئے پھر اس میں نئے انداز اور سادے خیالات کو داخل کرنا چاہیئے"

# حسن

میر غلام حسن نام اور حسن تخلص بزرگوں کا وطن ہرات تھا مگر یہ خاص دہلی کے رہنے والے تھے وہیں پیدا ہوئے تھے دہلی کی حالت جب دگرگوں ہوئی تو یہ اپنے والد میر غلام حسین ضاحک کے ساتھ فیض آباد آئے جو اس وقت اودھ کا دارالسلطنت تھا لیکن جب آصف الدولہ نے لکھنؤ آباد کیا تو یہ بھی لکھنؤ چلے آئے

شاعری خاندان میں بزرگوں کے وقت سے چلی آرہی تھی خود ان کے والد میر صاحک بڑے پایہ کے شاعر تھے چنانچہ میر حسن نے ابتدا میں ان ہی سے اصلاح لی بعد میں میر درد کو کلام دکھانے لگے جب دلی چھوڑ کر لکھنؤ گئے تو مرزا صابر الدین صابر کے شاگرد ہوئے مگر ان کا رنگ کچھ زیادہ پسند نہ آیا لہٰذا میر اور سودا کے تتبع میں شعر کہنا شروع کیا دیوان چھپ گیا ہے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ درد کی صفائی و محاورے کا لطف خاص چیزیں ہیں جو ان کے یہاں نمایاں ہیں میر حسن کے یہاں محاورے کا لطف اور تغزل قابل دید ہے ان کو بھی تناسب لفظی کا خاص حصہ ملا ہے غزلوں کے علاوہ قصائد بھی کہتے ہیں لیکن غزل کے سامنے پھیکے نظر آتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ میر حسن کی حیات جاودانی کا راز غزل ہے نہ قصیدہ بلکہ مثنوی جس کو اس آب و تاب کے ساتھ اردو کے دربار میں انھوں نے پیش کیا کہ اگلے پچھلے شعرا کو سر تسلیم خم کرنا ہی پڑا۔ اردو میں نہ اس سے پہلے کوئی اس پایہ کی مثنوی ہوئی ہے نہ آئندہ امید ہے اس لئے کہ جس ماحول میں مثنویاں تیار ہوتی تھیں وہ بدل ہوئی کہ ختم ہو گیا فارسی ہو یا اردو دونوں زبانوں کی قریب قریب تمام مثنویاں کسی صلہ کی امید پر لکھی گئیں ہیں۔ اب سوائے زمانی سرپرستی کے اور کسی صلہ کی امید تو کیا بلکہ بقول سخنے یہ بھی امید نہیں کہ توجہ سے لوگ پڑھ لیں گے

یوں تو میر حسن نے کئی مثنویاں لکھیں لیکن ان کا سہرس کارنامہ "سحر البیان" ہے جس میں بے نظیر اور بدر منیر کا افسانہ ہے مولانا آزاد فرماتے ہیں کہ "زمانے نے اس کی سحر البیانی پر تمام شعرا اور تذکرہ نویسوں سے محضر شہادت لکھوایا" حقیقت یہ ہے کہ اس مثنوی کی تنقید پر پوری ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے جس کا یہاں موقع ہے نہ گنجائش لیکن بغیر اشارتاً ہی سہی یہ بتانا کہ یہ مثنوی ایسے زمانہ کی معاشرتی زندگی کا آئینہ ہے جس سے اس زمانہ کے رسم و رواج تمدن وغیرہ پر کافی روشنی پڑتی ہے بیان اور طرز ادا کا لطف اتنا عمدہ ہے کہ آج تک اسی رعنائی کے ساتھ یہ مثنوی پڑھی جاتی ہے جو شاید اس کے زمانہ میں رہی ہو زبان اس دور اندیشی اور ماہرگی کے ساتھ نظم کی گئی ہے کہ ڈیڑھ سو برس گزرنے کے بعد بھی بہت کم فرق معلوم ہوتا ہے میر حسن جذبات کی پوری ترجمانی کرتے ہیں بڑے بوڑھے عورت مرد بادشاہ فقیر سب کا ذکر اس مثنوی میں آیا ہے مگر ہر شخص کا خیال اور بیان حسب مراتب و کردار نگاری کے لحاظ سے نہایت خوبی سے دکھائے گئے ہیں یہ مثنوی اس قدر دلچسپ اور مقبول عام ہے کہ اس کے اکثر اشعار ضرب المثل ہو گئے ہیں اور لطف یہ ہے کہ مرا کہیں ہاتھ سے جانے نہیں پایا اور منظر و واقعہ نگاری اس خوبی کے ساتھ ہے کہ دونوں کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے کلام کا موہ دینا بیکار ہے اس لئے کہ مثنوی سحر البیان ہر جگہ مل سکتی ہے

میر حسن کا انتقال ۱۷۸۶ء میں ہوا مصحفی نے "شاعر شیریں بیاں" سے مادہ وفات نکالا

## میر

میر آگرہ میں پیدا ہوئے والد کے انتقال کے وقت ان کی عمر دس سال کی تھی

میر

والد کے انتقال کے بعد دہلی چلے آئے یہاں اپنے سوتیلے بھائی کے حالو سراج الدین خاں آرزو کے یہاں کچھ دن رہے تحصیل علم جاری تھی مگر حالو کے مرتا قبے میر کو تڑی تکلیفیں ہو گئیں اور دہلی سے پھر اکبر آباد چلے گئے کچھ دنوں قیام کر کے پھر مستقل دہلی واپس آئے

میر کی شاعری کا عروج دہلی میں ہوا لوگ ان کے کلام کو دور دراز شہروں میں بطور عطیہ لے جاتے تھے دہلی سے ان کی قدر بہت کچھ کی شاہ عالم کے دربار اور امراء کی محفل میں ان کا شعر کمال ٹھاٹ سے داد تعظیم و تکریم لیا لیکن بقول آزاد "حالی آداب سے حاضر ان کو نہیں مل سکتے اور وہاں تو خود حرامہ سلطنت حالی پڑا تھا" اس لئے میر نے سنہ ۱۲ صدی کی سل رکھ کر سرت داس کے ساتھ آرزو و سودا اور سوز کی طرح دلی کو الوداع کہا اور (۱۱۹۷ھ) ۱۷۸۲ء میں لکھنؤ پہنچے لکھنؤ میں غیر معمولی التفات اور اعزاز کے ساتھ میر کی آؤ بھگت کی گئی نواب آصف الدولہ نے میر کے لئے دو سو روپے ماہانہ مقرر کر دیئے۔

میر صاحب میانہ قد لاغر اندام اور کمزور رنگ تھے۔ ہر کام متانت اور آہستگی کے ساتھ کرتے تھے بات کم کرتے اور وہ بھی آہستہ آواز میں نرمی اور ملائمیت تھی مزاج میں قناعت اور غیرت ضرورت سے زیادہ تھی۔ مزاج کی تیزی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی نتیجہ یہ تھا کہ فاقے کرتے تھے دکھ اٹھاتے تھے مگر بقول آزاد اسی بد دماغی کے سایہ میں دنیا اور اہل دنیا سے بیزار بیٹھے رہتے تھے ان کی لاروال دولت یعنی سرمایہ شعر و سخن نے ہمت افلاس کی سلطنت کو ہیچ سمجھا۔ ان کی استادی کا اقرار نہ صرف اُن کے ہمعصروں نے کیا بلکہ زمانے نے اس کا فتویٰ دیا کہ اُردو شاعری میں اس سے زبردست غزل گو نہ کوئی پیدا ہوا ہے نہ ہوگا جس پایہ کے وہ استاد تھے اتنے ہی پُرگو بھی تھے ان کے کلام کا ذخیرہ بہت وافر ہے ایک دیوان فارسی

کا ہے اور چھ دیوان اُردو کے ہیں بہت سی مثنویاں و قصائد بھی اُن سے یادگار ہیں ایک مختصر سا رسالہ نکات الشعرا میر اور ایک اُردو شعرا کا تذکرہ نکات الشعرا بھی موجود ہے اُردو کے دیوان میں علاوہ غزلوں کے رباعی، مخمس، مستزاد، ترجیع بند، ترکیب بند، مسدس وغیرہ سب ہی کچھ ہیں واسوخت دو ہیں اور کچھ شک نہیں کہ لاجواب ہیں آزاد نے میر صاحب کو اُردو میں واسوخت کا موجد قرار دیا ہے

یوں تو میر صاحب نے مختلف اصنافِ شاعری پر طبع آزمائی کی ہے لیکن غزل میں ان کا پایہ ہر شاعر سے ممتاز ہے جس کا اعتراف اردو کے مسلم الثبوت اُستادہ مختلف اوقات میں کر چکے ہیں حقیقت یہ ہے کہ تغزل جس کامرانی اور خوش اسلوبی سے میر صاحب نے نبھایا ہے وہ ان ہی کے حصہ کی بات ہو گئی ہے اور یہی چیز ہے جس کی بدولت ان کی انفرادیت قائم و برقرار ہے میر کے یہاں بقول مصنف کاشف الحقائق "سوز و گداز، شستگی، شستریت، رنگینی، فراخت، بیرنی، شوخی وغیرہ کی کیفیتیں بدرجہ کثیر پائی جاتی ہیں" اگر اس کے ساتھ ان کا خلوص بھی شامل کر لیجئے تو آسانی سے یہ راز معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کا مقابلہ تاثیر و تغزل میں کوئی دوسرا کیوں نہیں کر سکتا اس کے علاوہ ایک اور زبردست خوبی یہ ہے کہ وہ عشق کے واردات کو اس حسن سے بیان کرتے ہیں کہ لوگ آپ بیتی میں جگ بیتی کا مزہ پاتے ہیں۔

ان کے اشعار میں سادگی اور صفائی اتنی زیادہ ہے کہ بلا غور و فکر اشعار ذہن میں سما جاتے ہیں اور دل میں نشتر کی طرح اُتر جاتے ہیں نتیجہ یہ ہے کہ ہر خاص و عام محظوظ ہوتا ہے غزل میں جذبات پر اگر نظر ڈالئے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی غزلوں میں اس دل کے واردات ہیں جس پر عشق کا نور اوار ہو چکا ہے میر صاحب کی زندگی پتہ دیتی ہے کہ عین شباب میں کسی کی نگاہِ ناز کے گھائل ہو گئے تھے جس کی وجہ سے طبیعت میں سوز و گداز اس طرح اپنا کام کر رہے تھے جیسے رگوں میں لہو۔ میر کا

درد و اضطراب اپنے ساتھ ایک خاص سکون و کیف لے کر آتا ہے سننے والے سنتے ہیں اور بجائے کرب کے اپنے دل میں ایک اشتیاق پاتے ہیں

قصیدہ میں میر صاحب سودا سے بہت پیچھے ہیں اس لئے کہ ان پر درد اور یاس کا غلبہ ہے جو قصیدہ کے لئے ایک بڑی حد تک کارآمد نہیں اس میں شکوہ الفاظ، مضامین کی بلند پروازی اور طبیعت کی شگفتگی نہایت ضروری سامان ہیں یہاں طبیعت اس کی عادی تھی کہ ملائم الفاظ ہوں سامنے کے مضامین ہوں جس کو تیرہ مردگی اور غم کے سایے میں ڈھال کر شعر کا جامہ پہنا دیا جاتے قصیدہ میں مدح کا حصہ خاص ہوتا ہے ان کی خود دار طبیعت کب گوارا کر سکتی تھی کہ اس میدان میں وہ زمین آسمان کے قلابے ملائیں

مثنوی اس صنف شاعری میں میر صاحب کو بہت کچھ کامیابی ہوئی۔ یہاں بھی عشق کے واردات نہایت عمدہ طریقہ سے بیان کرتے ہیں لیکن منظر نگاری رامی دسرس نہیں اور پھر بقول مصنف "کاشف الحقائق" آپ کی مثنویوں میں خارجی مضامین گویا ندارد ہیں کہیں آپ صحرا، جنگل، جال، خزاں، بہار وغیرہ جملہ خوش آیند مضامین بیان نہیں فرماتے ہیں، کردار ایسی جگہ پر موزوں نظر آتے ہیں اور بڑی خوبی سے جگہ پاتے ہیں ان کی مثنویوں نے وہ رنگ جمایا کہ اکثر شعرا نے ان کے قدم پر قدم رکھنے کی کوشش کی

میر صاحب کے کلام پر جو رائے آزاد نے دی ہے ہمارے نزدیک وہ مختصر طور پر بہترین تنقید ہے جس کو نقل کرنے پر ہم مجبور ہیں "میر صاحب کی زبان شستہ، کلام صاف، بیان ایسا پاکیزہ جیسے باتیں کرتے ہیں دل کے خیالات کو جو کہ سب طبیعتوں کے مطابق ہیں محاورہ کا رنگ دے کر باتوں باتوں میں ادا کر دیتے ہیں اور زبان میں خدا نے ایسی تاثیر دی ہے کہ وہی باتیں ایک مضمون سی جاتی ہیں۔ اسی

واسطے ان میں بہ بست اور شعرا کے اصلیت کچھ زیادہ قائم رہتی ہے بلکہ اکثر جگہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہجر کی تصویر کھینچ رہے ہیں یہی سبب ہے کہ دلوں پر اثر بھی زیادہ کرتی ہے وہ گویا اُردو کے سعدی ہیں[1]"

میر کا انتقال ۱۲۲۵ھ (۱۸۱۰ء) میں لکھنؤ میں ہوا اور وہیں مزار بھی ہے مگر افسوس کہ سنگ مزار بھی نہیں کہ صحیح اندازہ کیا جا سکے کہ کونسی قبر ہے میر درد نے سچ کہا ہے

اہلِ فنا کو نام سے ہستی کے ننگ ہے
لوحِ مزار بھی مری چھاتی پہ سنگ ہے

# یقین

انعام اللہ خاں نام یقین تخلص ان کے والد کا نام شیخ اطہر الدین تھا۔ یہ معزز خاندان شاہانِ مغلیہ سے متوسل تھے انعام اللہ خاں دہلی میں پیدا ہوئے ان کے حالات زندگی اب تک لاعلمی کے پردے میں پنہاں ہیں حال میں مرزا فرحت اللہ بیگ نے ان کا دیوان حیدرآباد سے شائع کیا ہے باوجود جد و جہد کے میرزا صاحب کو بھی مکمل حالات زندگی نہیں معلوم ہو سکے تذکروں سے اتنا ضرور پتا چلتا ہے کہ یہ ایک خوب صورت خوش اخلاق آدمی تھے۔ افیون کھاتے تھے چنانچہ اپنے اشعار میں جا بجا افیون کی تعریف کرتے ہیں ایک جگہ کہتے ہیں

ہمیں مار سیاہ زلف کے کاٹے سے کیا ہوئے　　کہ ہم اک عمر سے عادی ہیں حالِ لب کی افیون کے

---

[1] آبِ حیات ص۲۱۲

یقین میر امظہر جانِ جاناں سے اصلاحِ سخن لیتے تھے بعض مذکرہ نویسوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یقین خود شعر نہ کہہ سکتے تھے بلکہ ان کا دیوان میر امظہر کا کہا ہوا ہے مگر یہ محض خیال ہی خیال ہے حقیقت یہ ہے کہ یقین خود نہایت اچھے شاعر تھے، ان کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اگر کچھ اور جیتے رہتے تو اُردو شاعری میں ایک کارنمایاں کرتے مگر افسوس کہ پچیس برس کے سن ہی میں مار ڈالے گئے ان کے قتل ہونے کی مختلف وجہیں بتائی جاتی ہیں جن کے متعلق مرزا فرحت اللہ بیگ نے نہایت مدلل کفتگو کی ہے مگر پھر بھی اصل ایک راز سربستہ ہی رہ گیا جس کے سلسلہ میں ہم ایک اقتباس مرزا صاحب کا پیش کرکے اس عبرتناک واقعہ کو ختم کرنا چاہتے ہیں

اب رہا تذکرے والوں کی کھوج پوچھو ایک نے کچھ لکھا دوسرے نے اس سے روایت لی مگر اپنی طرف سے تھوڑا بہت کچھ اور بڑھا دیا تیسرے نے اس کا ترجمہ کرکے رنگ ہی بدل دیا اس لئے میں یقین کے قتل کے متعلق صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ اُن کے والد نے ان کو کسی ایسی وجہ سے قتل کیا جس کا سہ ملیا اب ناممکن ہے کیونکہ یہ راز صرف چند لوگوں کو معلوم تھا اور وہ ان کے ساتھ دفن ہو گیا[1]" غرض یقین کا انتقال ۱۱۶۹ھ میں ۲۵ سال کی عمر میں ہوا

یقین کی زبان بہت صاف و ستھری ہے مروجہ الفاظ ان کے یہاں بہت کم پائے جاتے ہیں ان کے کلام کی شوخی اور طرزِ ادا سعر میں بھی اثر کرتی ہے یقین بحریں بہایت شگفتہ منتخب کرتے ہیں اور کمال یہ ہے کہ ایک قافیہ کو مختلف پہلو سے مختلف ردیفوں میں جگہ دیتے ہیں جس کی وجہ سے مضمون میں خاطر خواہ اضافہ ہو جاتا ہے مرزا فرحت اللہ بیگ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ دیوان بھر میں ایک جگہ بھی نہیں ہے کہ دو جگہ ایک ہی قافیہ سے ایک ہی مضمون ادا کیا ہو۔

---

[1] دیباچہ دیوان یقین ص ۳۱

یقین کا دیوان دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ میر درد کی طرح یقین کہتے تھے لیکن یہ التزام خاص طور پر دلچسپ ہے کہ دیوان بھر میں ایک سو سر غزلیں ہیں اور سب پانچ پانچ شعر کی ہیں کلام میں مزا اور نمک ہر جگہ ہے گو کہیں کہیں پر صنعت ایہام بھی ہے لیکن اس زمانہ کا رنگ دیکھتے ہوئے یہ امر بھی قابلِ گرفت نہیں معلوم ہوتا تعقید سے کلام میں کھٹک ضرور پیدا ہوتی ہے مگر یہ اس زمانہ کے شعرا روا رکھتے تھے یقین کے یہاں جوش و ولولہ خاص طور نمایاں ہیں

یقین نے فارسی شعرا کے خیالات لے کر کہیں کہیں نظم کئے ہیں لیکن ہمارے نزدیک یہ سرقہ نہیں کہا جا سکتا اس لئے کہ قابلہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یقین نے محض ترجمہ نہیں کیا بلکہ مضمون میں وسعت اور جدت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے

## دور کی خصوصیات

اس دور کی خصوصیات میں چند باتیں قابل غور و داد ہیں

زبان کی صفائی ابھی ایسی نہ ہوئی تھی کہ اس میں خیالات کو پوری طرح سادگی کے ساتھ ادا کر سکتے اس دور کے شعرا نے اس بات کا احساس کیا اور پوری طرح سے اس اصلاح کے لئے کمر بستہ ہو گئے چنانچہ فارسی کی ترکیبیں جو بقول آزاد "مصری کی ڈلیوں کی طرح دودھ کے ساتھ منہ میں آتی تھیں انھیں گھلا ملا کر فارسی کی ترکیبوں اور محاوروں کو اردو کے سانچہ میں ڈھال کر اسرانی سے ہندوستانی کر لیا" جتنے محاورے فارسی کے اس دور میں اردو میں کر ہماری زبان میں آئے ہیں شاید اتنے کبھی نہیں آئے آزاد نے ایک فہرست آبِ حیات کے دیباچہ میں دی ہے جو قابل مطالعہ ہے

اس زبان کی صفائی اور معیار کے قائم رکھنے کے لئے خواجہ میر درد نے اپنے مکان پر ایک ماہانہ مشاعرہ مقرر کیا جس میں شعر و زبان کے جس و قبح پر بحث ڈالی جاتی تھی

بعد میں یہ مشاعرہ میر صاحب کے یہاں ہونے لگا اس انجمن کو قائم رکھنے کی فکر عرصہ تک بزرگان سخن کو رہی۔

ہندی کے ثقیل الفاظ جو ان کے روڑے بن کر شاہ راہ ادب میں مخل ہوتے تھے اُن سے بھی زبانِ شعر کو پاک کر کے ہموار راستہ بنا لیا نتیجہ یہ ہوا کہ اس دور کے شعرا کے کلام میں نفاست اور خیالات میں صفائی پیدا ہو گئی۔ کیونکہ فارسی کی مانوس ترکیبیں اور ہندی کے ناخوشگوار الفاظ بہت کم ہو گئے ہے

اس دور کے شعرا نے سنگلاخ زمینیں اور پیچ در پیچ استعاروں سے بہت کچھ گریز کیا ہے تاکہ حالات الفاظ کے ساتھ ہی دلوں میں اُتر جائیں حکیم تاثیر اور درد اس زمانہ میں شعرا کو نصیب ہوئی وہ نہ اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد کسی دور میں نظر آتی ہے

آزاد کو اس بات کا ملال ہے کہ "اس برتی میں طبیعت کی بلند پروازی سے اوپر کی طرف مُنہ نہ کیا کاش آگے قدم بڑھائے تاکہ حسن و عشق کے محدود صحن سے نکل جاتے اور ان میدانوں میں گھوڑے دوڑائے کہ نہ اُن کی وسعت کی انتہا ہے نہ عجائب و لطائف کا شمار ہے" حقیقت یہ ہے کہ ان بزرگوں کی نظر فارسی شاعری پر تھی جس کے دامن میں اتنی وسعت نہ تھی جتنی معرفی زبانوں میں ہے۔ اگر وہ میدان ہستی نظر ہوتے تو اس دور کے شعرا کی قابلیت اور جدت بنا لیا دوسرے میدانوں میں بھی اپنا رنگ دکھائے بغیر نہ رہتی

اس دور کے شعرا کا کارنامہ ایک اور لحاظ سے بھی قابل فخر و تحسین ہے مثنوی اور قصیدے میں وہ کام کیا کہ جو بہت مشکل سے ہوا تھا گو یہ تو نہیں کہ اس سے پہلے ان چیزوں پر طبع آزمائی نہ کی گئی ہو لیکن جس میر اور سودا نے ان اصناف شاعری کو کمال درجہ دیا کہ دونوں معراج کمال کو پہنچ گئے

غزل کا تو کچھ پوچھنا ہی نہیں اس دور میں اس صنف شاعری کی جو ترقی ہوئی

وہ ہر آنے والے عہد کے لیے باعث رشک رہی اس طرح پر یہ آسانی سے کہا جاسکتا ہے کہ اردو کی دنیا میں اس وقت وہ لوگ خامہ فرسائی کر رہے تھے جن کا نظیر مثنوی، قصیدہ اور غزل میں آج تک کوئی نہ ہو سکا

اس عہد کا کارنامہ یہیں نہیں ختم ہوتا بلکہ کچھ اور بھی باتیں ہیں مرثیہ اب تک مسدس کی شکل میں نہ تھا اسی زمانے میں لوگوں نے مرثیہ کو بھی مسدس میں کہہ کر خیال اور مضمون میں وسعت پیدا کر دی میر صاحب نے اردو میں ایک اور صنف شاعری کا اضافہ کیا یعنی واسوخت کہہ کر اردو اور اپنے نام کو بلند کیا مگر ہاں ان پھولوں کے ساتھ کچھ خار بھی آگئے میر راسوز اپنے ہجو گوئی میں بھی کمال پیدا کیا جس کا علاج نہ تھا کیونکہ اس کی سرحد کبھی کبھی ابتذال اور فحش گوئی سے مل جاتی ہے

(۵)

# جرأت

ان کا اصلی نام یحییٰ امان تھا مگر زمانے نے قلندر بخش کے نام سے مشہور کیا' ان کے باپ کا نام حافظ امان تھا ان کے بزرگوار معلیہ خاندان کے دربار سے وابستہ تھے چنانچہ امان شاہی خطاب اکبر کا عطیہ تھا

دلّی کی جب حالت خراب ہوئی تو جرأت فیض آباد آئے اور یہاں پڑھ لکھ کر جواں ہوئے نواب مجد خاں کے ملازم ہوئے ۱۲۱۲ھ میں لکھنؤ آئے' اور شاہِ عالم ثانی کے بیٹے مرزا سلیمان شکوہ کے دربار میں رسائی حاصل کی عرصہ تک یہاں قیام رہا اور یہیں ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء میں بیوند خاک ہوئے

جرأت شاعری میں جعفر علی خاں حسرت کے شاگرد تھے جو فارسی کے ایک مشاق اور اُردو کے بھی اچھے شاعر تھے جرأت کو موسیقی سے فطری شغف تھا علم نجوم میں بھی دستگاہ رکھتے تھے طبیعت اتنی شگفتہ پائی تھی کہ بات کرنے میں منہ سے پھول جھڑتے تھے لیکن بعض اوقات آتشباری کے پھول کی طرح بھی ہوتے تھے جس سے کبھی کبھی لوگ تلملا اُٹھتے تھے۔ اُس زمانہ کے دربار اور محفلوں کے لئے جرأت کا وہ ایک بڑی حد تک لطف حال کہا جاتا تھا انشاء اللہ خاں سے صحبت گرم رہتی تھی عین جوانی میں آنکھوں سے محروم ہو گئے تھے جس کی وجہ سے کبھی کبھی اُن حریفوں کو مضحکہ اڑانے کا موقع ملتا تھا

جرأت اور انشاء دو ایسے شاعر ہیں جن کے یہاں مسلسل غزلوں کا خاص اہتمام ہے معاملہ بندی جرأت کا طرۂ امتیاز ہے رندی، سرمستی اور حواس پرستی کی جیتی جاگتی تصویریں کھینچ کر جرأت نے اپنے لئے ایک رنگ الگ قائم کر لیا تھا۔

چھیڑ، خود رفتگی، کیف اور جذبات میں ایک لطیف شوخی پیدا کر دینا جرأت ہی ایسے استاد کا کام تھا اگر اس پہلو کو اعتدال سے بچا لیا جائے تو شاعری لطف احساس محبت کا رجحان نظر آئے گی، مصحفی کے یہاں بھی اس کی جھلک پائی جاتی ہے اور موجودہ دور میں حسرت موہانی کے کلام میں بھی کبھی کبھی جرأت کے رنگ تغزل کے پہلو نظر آجاتے ہیں لوگوں کی تقلید اور پیروی سے یہ اندازہ ضرور کیا جا سکتا ہے کہ جرأت نے اپنے رنگ کو مقبولیت کے درجہ تک پہنچا دیا تھا

جرأت کے ماکمال شاعر ہونے میں کلام نہیں انھوں نے اکثر اصناف شاعری پر طبع آزمائی کی ہے غزل، رباعی، مخمس، واسوخت، ہجو، کچھ ہے البتہ قصیدہ سے دیوان خالی ہے جہاں تک زبان کا تعلق ہے اس میں صفائی سادگی خاص طور سے قابل دید ہے محاورات کی سلاست اور خوش مزاقی کا نظارہ پڑھنے والے کو ہر طرف پوری طرح اپنا گرویدہ کر لیتا ہے لیکن ان میں ہی باتیں ہیں جو کلام میں عیب ہیں درد شوخی اور مانگیں الفاظ زیادہ ہے بے جا ہوگا اگر کہا جائے کہ کہیں کہیں شوخی حد سے زیادہ ہو گئی ہے ان کا کلام حسن و عشق کے اکثر ارادات کا مرقع ہے رباعیوں میں معشوق کے اعضاء کا ذکر بڑی خوبی سے بیان کرنے میں دلدادہ کم یاب ہے اس لئے یہاں نمونہ کلام دینا بے جا ہوگا

میں تڑپ کے سنگ ربت بصد اضطراب اُلٹا
مری قبر پر وہ آکر جو پھرا شتاب اُلٹا

مرے نتو سوال سُن کر وہ رہا خموش بیٹھا
نہیں یہ بھی کہنے کی جا کہ ملا جواب اُلٹا

جو رکھے ہے تحت داڑھی وہ عجی سو مل ہو مفلس
کہ رہے نہ آسو دریا قدحِ حباب اُلٹا

شبِ وصل یہ قلق تھا کہ وہ سو گیا تو منھ سے
نہ ذرہ بھی میں دوپٹہ ذرہ حجاب اُلٹا

نہیں ہے خیال اس کا کہ جو آیا خواب میں وہ
تو رہا یہ اُس کی ڈر سے نہ وہ ہم نے خواب اُلٹا

اسی در تک آؤں گا میں کہ نہیں ہو دل کہے ہیں
مجھے پھیرنے عبث ہو زرہِ عتاب اُلٹا

طلب اس سے کل جو مے کی تو بھرا ہوا زمیں پر
مجھے شوخ نے دکھا کر قدحِ شراب اُلٹا

جو کسارِ مصحفی اپنی لگے نہ کے ناؤ گا ہے
تو مرا بھیڑ مارے لگے پہنے آب اُلٹا

کبھی مدرسہ میں پڑھنے مرے شعر جو لگا وہ
تو ہوا نے دوں ہی جرأت ورقِ کتاب اُلٹا

جرأت زیادہ لکھے پڑھے آدمی نہ تھے رہاں عربی اور معمولی علوم و فنون سے ناواقف نہ تھے۔ شاعری سے دلچسپی دیوانگی کی حد تک تھی، ان کے کلام میں ایسے سارے رجحانات ملتے ہیں جو ایک عیش پرست اور زوال پذیر عہد کے تقاضے ہیں مگر یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ جرأت کی شاعری میں صحت مند جنسی اشارے زیادہ ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خارجی بیانات کے دلدادہ ہیں۔

# انشاء

سید انشاء اللہ خاں نام اور انشاء تخلص حکیم میر ماشاء اللہ خاں کے بیٹے تھے بزرگوں کا اصل وطن نجف اشرف تھا خاندانی پیشہ طبابت تھا اس میں یہ خاندان نہایت ممتاز تھا جس کی وجہ سے شاہان مغلیہ کے دربار تک رسائی تھی دہلی کے زوال پر میر ماشاء اللہ خاں کو مرشد آباد جانا پڑا اور انشاء اللہ خاں وہیں پیدا ہوئے باپ نے انشاء اللہ خاں کی تعلیم و تربیت میں بڑی جانکاہی کی، مختلف علوم و فنون کا ماہر کر دیا

شاہ عالم ثانی کے وقت میں انشاء اللہ خاں مرشد آباد سے دلی آئے اُن کی قابلیت اور شعر گوئی کی بدولت یہاں کافی احترام ہوا۔ انشاء رند طبیعت اور شگفتگی مزاج سے تمام دربار پر چھا گئے یہاں تک کہ دربار کے دوسرے شعرا ایسا رنگ اکھڑتے دیکھ کر انشاء سے کبیدہ خاطر ہونے لگے اور یہ چشمک زنی بزم سخن کو کبھی کبھی رزم کا میدان بنا دیتی تھی ایک حریف دوسرے پر تیغ زبان سے حملہ آور ہوتا دوسرا تیر مذمت و ہجو سے رخمی کرنے کی کوشش کرتا مگر انشاء اللہ خاں سب پر بھاری پڑتے تھے ممکن تھا کہ یہ صحبتیں کچھ عرصہ تک گرم رہتیں کیونکہ پڑھے لکھے لوگوں کی لڑائی تھی۔ لیکن شاہ عالم کا حیرانہ حالی تھا انشاء کی صورت کے مطابق جیح وماہ کرتا بیمار دلی چھوڑ کر وہ لکھنؤ چلے آئے

لکھنؤ میں مرزا سلیمان شکوہ کا دربار دہلی کے "حرا کا بیاہ گاہ" تھا باپ کے دربار سے انشاء اللہ خاں کو آتے ہوئے دیکھ کر مرزا سلیمان شکوہ نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ خدا دانی اور خاطر اس حد تک کی کہ ایسا استاد بنا لیا حالانکہ اس سے پہلے مصحفی ایسے استاد سے

اصلاح لیے تھے کچھ دنوں تک انشاء یہاں رہے لیکن حوصلہ مندی کے لئے یہ دربار بھی ناکافی نظر آیا رفتہ رفتہ نواب سعادت علی خاں کے یہاں پہنچ گئے اور وہاں نواب کے مزاج میں اتنا دخل ہوا کہ تمام لکھنؤ میں انشاء اللہ خاں کا طوطی بولنے لگا اپنے مزاج اور لطف طبیعت سے نواب کو ایسا گرویدہ کر لیا تھا کہ جس کو چاہے دلا دیے

ایک عام مقولہ ہے کہ "زیادہ میٹھے میں کیڑا پڑ جاتا ہے"۔ انشاء اللہ خاں کی دوستی بھی اسی کی مصداق ہوئی نواب سعادت علی خاں فطرتاً نہایت متین اور سنجیدہ مزاج تھے انشاء کی طرافت اور شوخی ایسے مزاج کے آدمی کے لئے ایک نہ ایک دن ناگوار ضرور ہونا چاہیئے تھا مگر ابھی تک نواب کا یہ حال تھا کہ انشاء اللہ کی جدائی کسی وقت گوارا نہ ہوئی یہاں تک کہ ایک دن انشاء اللہ خاں کو جب گھر پر نہ پایا تو یہ حکم دیا کہ آج سے بجز ہمارے دربار کے اور کہیں نہ جانا کیجئے۔ اس قید سے رنجیدہ انشاء اللہ کے لئے وہی کام کیا جو کسی کے لئے طوق و سلاسل کرتے ہیں کچھ دنوں میں شکر رنجی بہت بڑھ گئی دربار سے تنخواہ بھی بند ہو گئی نتیجہ یہ ہوا کہ انشاء کے یہاں فقر و فاقہ کا دور دورہ ہو گیا اور وہی انشاء جس کے دروازے پر ہاتھی جھوما کرتے تھے اور مال و دولت بہرہ دیا کرتے تھے وہی اس عالم میں ۱۸۱۷ء میں اس دنیا سے سدھارے کہ جدا دشمن کو بھی وہ دن نہ دکھائے

اس حالت میں ایک نہایت دردناک تصویر انشاء کی آخری حالت کی آزاد نے سعادت یار خاں رنگین کی روایت کی ساویر سار کی ہے "میں (سعادت یار خاں) اندر گیا دیکھا کہ ایک کونے میں (انشاء) بیٹھے ہیں سر نہیں ہے دونوں زانوؤں پر سر دھرا ہے آگے راکھ کے ڈھیر میں ایک ٹوٹا سا حقہ پاس رکھا ہے مالو وہ سال شکوہ کہ تھمگٹ دیکھتے تھے وہ گرمجوشی اور محفلیوں کی ملاقاتیں ہوتی تھیں یا یہ حالت دیکھی بے اختیار دل بھر آیا میں بھی وہیں پاس بیٹھ گیا اور دیر تک رویا۔ جب جی ہلکا ہوا

تو میں نے پکارا کہ سید انشاء۔ سید انشاء نے سر اُٹھا کر اس نظر حسرت سے دیکھا جو کہتی تھی کہ کیا کروں آنکھ میں آنسو نہیں میں نے کہا کیا حال ہے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا شکر ہے پھر اس طرح سر کو گھٹنوں پر رکھ لیا کہ نہ اُٹھایا "

انشاء کی قابلیت اور زور کلام اس پایہ کے ہیں کہ سارا اُردو کے اور شعراء میں مشکل سے کسی کو یہ طرۂ امتیاز حاصل ہوا اور لطف یہ کہ اُن کی ہر ظریف کسی میدان میں سدہ بھی جس طرف انتہب قلم جھک پڑتا میدان کو روند ڈالتا کاش ایسے عالی دماغ شخص کو کوئی ایسی سوسائٹی مل جاتی جو اس سے ڈراما یا ایسی ہی کوئی اور کارآمد چیز لکھا لیتی تو اُردو میں انشاء کی بدولت شاید ایسا کارنامہ مہیا ہو جاتا جس کی نظیر مشکل سے ملتی

انشاء کے کلیات میں قریب قریب تمام اصناف شاعری موجود ہے علاوہ نظم کے نثر میں بھی ایک لطیف یادگار ہے جس کا نام دریائے لطافت ہے یہ اُردو قواعد کی پہلی کتاب ہے جس کا سنہ تصنیف ۱۸۰۲ء ہے جس کی زبان فارسی ہے۔ لیکن دوسری کتاب کی زبان اُردو ہے جس کا نام "رانی کیتکی" کی کہانی ہے اس میں یہ التزام کیا گیا ہے کہ عربی فارسی کا ایک لفظ بھی نہ آنے پائے یہ خالص اُردو کا ایک اچھا نمونہ ہے ان کا کلام دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ زبان پر قدرت اور محاورہ پر حکومت کافی حاصل ہے یہی نہیں کہ صرف اُردو، فارسی کے ماہر ہوں بلکہ کئی زبانوں سے واقف تھے چنانچہ ایک قصیدہ لکھا ہے جو سات زبانوں میں ہے ایک قصیدہ اور ہے جو بے نقط ہے

انشاء کا کلام اُن کے ماحول کا آئینہ ہے یعنی ظرافت، ہجو، مسخری وغیرہ دیکھ کر اُن زمانے کے حال کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اُن کا دماغ ایک انسانی چیز تھا جو ملاکاروں کے اُن کے سامنے ایک لمحہ میں ہر چیز پیش کر دیتا تھا۔ کبھی کبھی کسی لفظ یا محاورے کی صحت پر اُن سے سند مانگی جاتی تو لغت اور اساتذہ کے کلام سے فوراً نمونہ پیش کر دیتے۔

سودا کی طرح انشاء کا رجحان فارسی، عربی کے علاوہ ہندی کی طرف بھی تھا

اس معاملہ میں یقیناً وہ سودا سے بڑھے ہوئے تھے یہ ہی نہیں کہ ہندی کے نرم اور لطیف الفاظ استعمال کرتے ہوں بلکہ اس معاملہ میں اس قدر شغف تھا کہ بحر اور اصناف شاعری کا نام عربی سے بدل کر ہندی میں کرنا چاہتے تھے چنانچہ مثلث کا نام ٹکڑا اور مربع کا نام چوکڑا رکھا تھا مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن ۔ مفاعیلن کی جگہ پری جانم پری جانم پری جانم پری جانم فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن کی جگہ جب لگن ۔ جیت لگن جیت لگن جب لگن رائج کیا اسی طرح منطق کی اصطلاحیں ہندی میں پیدا کیں ۔

یہ صحیح ہے کہ اُن کے کلام میں بے اعتدالی بہت ہے لیکن بقول آزاد "کچھ جہالت کے سبب سے نہ تھی بلکہ عمداً بھی" ان کی غزلوں میں داخلی پہلو بہت کم ہے ٹھٹھول اور کبھی کبھی عورتوں کا لب و لہجہ یہاں بھی نمایاں ہے البتہ علوئے تخیل کی کمی کا کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا ۔

# مصحفی

مصحفی تخلص غلام ہمدانی نام باپ کا نام ولی محمد تھا ان کا خاندان امروہہ میں ایک معمار حیثیت رکھتا تھا سنہ ۱۱۹۰ھ میں کہ مصحفی کا الم شباب تھا دلی میں آکر مشق سخن اور تحصیل علم میں مصروف ہو گئے نتیجہ یہ ہوا کہ بہت علد قابلیت اور شاعری نے ان کو بلندی پر پہنچا دیا لیکن دہلی پر افلاس کا دور دورہ تھا لکھنؤ میں سخاوت کی گنگا بہہ رہی تھی اس نے مصحفی کو بھی اپنی طرف مائل کیا دلی کو خیرباد کہہ کر آصف الدولہ کے زمانہ میں لکھنؤ آئے اور مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار میں ملازم ہو گئے ان کے فن کی کافی قدر کی گئی یہاں تک کہ رائے نے بجنت استاد تسلیم کر لیا آزاد کا خیال ہے کہ مصحفی کا انتقال سنہ ۱۲۴۸ھ سنہ ۱۸۲۴ء میں ۸۰ برس کے سن میں ہوا لیکن شیفتہ کو اختلاف ہے گلشن بے خار میں لکھتے ہیں کہ

۱۱۶۴ھ میں ان کا انتقال ہوا

مصحفی کے صاحب کمال ہونے کا ثبوت یہی کیا کم ہے کہ جس پایہ کے شاگرد اُن کو ملے وہ خود اپنے وقت کے مستند استاد تھے مثلاً آتش، علیق، صمیر، اسیر وغیرہ گو مصحفی متلبس اور سنجیدہ مزاج تھے لیکن سید انشاء کی ظرافت نے ان کو بھی جواب دینے پر مجبور کیا اس وجہ سے ان کے کلام کا ایک حصہ سید انشاء کے رنگ کا ہے لیکن اس معرکہ میں انشاء سے پیچھے ہیں دیوان تعداد میں آٹھ ہیں جس سے اُن کی پر گوئی کا آسانی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے اور لطیفہ یہ ہے کہ ہزاروں سعر قیمت لے کر بیچ ڈالتے تھے جس کو لوگ اپنے نام سے شاعروں میں پڑھتے تھے طبیعت ہمہ گیر تھی مختلف اصناف شاعری پر طبع آزمائی کی ہے کہا جاتا ہے کہ ان کا کوئی خاص رنگ نہیں کبھی میر سوز کا انداز ہے کبھی میر کی تقلید ہے اور کہیں سودا کا ڈھنگ ہے لیکن یہ صحیح نہیں مضمون کے اعتبار سے ان کی امتیازی خصوصیت "نشاطِ سماں" اور "رنگ ردیف" کو نہایت پُر کیف دلنشیں طریقے سے بیان کر دیتا ہے تصیدے نہایت اچھے ہیں شاندار الفاظ دل پسند رنگینیں، مشکل زمینیں سہل ہیں رفعت سب کچھ ہے لیکن سودا کا جوش و خروش کم پایا جاتا ہے ان کی ایک مثنوی "بحر المحبت" بہت مشہور ہے

مصحفی کی علمی قابلیت کا پتہ نہیں چلتا مگر خود اُن کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی سے بخوبی آگاہ تھے چنانچہ ایک دیوان بھی ان کا فارسی میں ہے مصحفی کا نام اُردو کی دنیا میں یوں بھی قابل قدر ہے لیکن تذکروں کی وجہ سے ان کی شہرت میں چار چاند لگ جاتے ہیں دو تذکرے انھوں نے اُردو فارسی شعرا کے متعلق لکھے ہیں اُردو کے شعرا کا تذکرہ محمد شاہ کے زمانے سے شروع ہوتا ہے اور مصحفی کے ہمعصروں تک سلسلہ چلا آتا ہے

مصحفی نے اُردو زبان کی اصلاح میں کافی حصہ لیا بہت سے الفاظ اور

عیوب مثلاً ستر گربہ وغیرہ نکال ڈالے لیکن ایسے الفاظ رائج بھی کر دیئے جو مقامی ہیں مثلاً سیاٹ پوٹ اسی طریقہ سے ملکی خصوصیتوں کے مضمون بھی لیے ہیں چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں

دیکھا رہیں لے ہمدمیں حسن حسنکہ بیتیا آدمی — لیے رخ لیے مصحفی رخ ایسی پیتا آدمی گئی
تحفہ آسو جیں کیوں نہ نظر آئے سیاٹ — یاد آئے مجھے جس دم وہ نگبوو کا گھاٹ

## اثر

سید محمد نام اور تخلص اثر تھا ان کے حالات زندگی کا سہ اتنی تک نہیں چل سکا بس اتنا معلوم ہے کہ خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی تھے اور ان سے اتنے مانوس تھے کہ خود ایک مرید اپنے پیر سے ہوتا ہے نثری اور شاعری دونوں میں درد کی تقلید کرتے ہیں

اثر کا کلام میر درد کی طرح صاف اور سادہ ہے لیکن وہ درد نہیں جو درد کے یہاں ہے جذبات سے سادگی ادا ہوتے ہیں اور بہت خوب نظم ہوتے ہیں لیکن مولوی عبدالحق "مضمون کو دیکھئے تو اس میں تصوف ہے نہ اخلاق نہ حکمت و فلسفہ بلکہ سچے دل کی واردات ہے جو صاف صاف سیدھے الفاظ میں اس طرح بیان کر دی ہے جیسے کوئی باتیں کرتا ہے"[1]

دیوان بہت مختصر ہے اور قریب قریب ساری غزلیں چھوٹی بحر میں ہیں کچھ رباعیاں ہیں اور کچھ مطلع غزلیں مختصر ہیں اور زبان کے لحاظ سے فارسی ترکیبیں ہیں مگر بہت کم ہیں تو اثر کے کلام میں دل سوزی، درد، خلوص سب کچھ ہے مگر

---

[1] دیباچہ دیوان اثر ص ۳

بقول محمود "جس خصوصیت نے اثر کو اثر بنایا ہے وہ ایک جدت ہے ایک گداز ہے ایک عاشقانہ گمبھیرتا ہے" ثقیل الفاظ بہت کم آئے ہیں اور ممکن تھا کہ ان کی ثقالت معلوم بھی نہ ہوتی مگر چونکہ اثر کی زبان بہت نرم ہے اس وجہ سے یہ الفاظ کبھی کبھی ناگوار ہوتے ہیں مثلاً تعجبات۔ میر اثر کا شعر ہے۔

رشک ہوتی تعجبات ہے اب
مرہی جا پاس ایک بات ہے اب

اسی طرح ابہام اکھیڑے ہم وطنان وغیرہ ہیں مگر یہ حرانی زیادہ نہیں ہے اثر کے کلام میں چند الفاظ اور بھی قابل دید ہیں جن سے اسی دور کے لسانی رجحان پر روشنی پڑتی ہے۔

تلوار کے بجائے تروار، آگے کے بجائے آگو، ہم لے کے بجائے ہمیں اس لے کے بجائے جیں

ایک مسوی جواب دھیان سی ان کی یادگار ہے

## دور کی خصوصیات

(۱) زبان کی اصلاح زیادہ ہے ثقیل الفاظ زیادہ نکالے جا رہے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زبان میں صفائی اور روانی زیادہ ہوتی جاتی ہے مگر پھر بھی سب، ٹک، اکھیڑے، جھگڑا، زور (بہت) وغیرہ ایسی جگہ پر قائم ہیں

(۲) ہندی کے الفاظ بھی لائے گئے مگر نرم اور فصیح۔

(۳) مضمون میں بہت کم ترقی ہوئی اس دور کے شعراء رنگوں کے خیالات کو طرح طرح سے پیش کرتے ہیں مگر خود کوئی نئی بات مشکل سے سوجھتے ہیں

(۴) طرافت اور تمسخر کی بھرمار ہے یہاں تک کہ متانت اور سنجیدگی کی بھی آنکھیں کبھی کبھی بند ہو جاتی ہیں

(۵) ملکی اور مقامی خصوصیات کو اس دور کے شعرا نے زیادہ جگہ دی ہے۔ لکھنؤ اور دہلی کے میلے اور مختلف جشن اور اثرات کا تذکرہ پہلے سے زیادہ ہے۔

(۶) کلام میں ناہمواری اور بے اعتدالی زیادہ ہے کم شاعر ایسے ہیں جن کے یہاں یکسانیت پائی جاتی ہو

(۷) شعرا نے دریائے لطافت لکھ کر اردو کے محاورات اور قواعد کو باقاعدہ کرنے کی کوشش کی

(۸) شاعری میں روحانیت اور عشق کی کمی ہو گئی باتیں ہی باتیں رہ گئیں درباداری کی وجہ سے شعرا اپنی آزادی خیال کو کام میں نہ لا سکے، بہت کم شاعر ایسے ہیں جو دربار کی سرپرستی کے خواہاں نہ رہے ہوں اور جو دربار سے متعلق تھے وہ اپنے سرپرستوں کی خوشی کو زیادہ مدنظر رکھتے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ شاعری میں تصوف اور جذبات عالیہ کی کمی ہو گئی

(۹) اس کے مقابلہ غزل میں زور آزمائی کا میدان ڈھونڈھا مشکل ذائقہ ردیف، زمین پر زیادہ توجہ ہونے لگی اور ایسی صورت میں صرف غزل کی خانہ پُری ہو سکی معنویت اور بلندی نصیب نہ ہو سکی۔

(۱۰) رنگینی کو بھی فروغ اسی زمانہ میں ہوا غالباً امراء کی خوشنودی مزاج اور تعیش پسندی کے زیر اثر اس کی نشو و نما ہوئی

شعرا کے باہمی اصلاحات نے جوابی اور فنی اعتراضات کا سلسلہ قائم کر دیا تھا اگر وہ تنقید کا پہلو اختیار کر لیتا تو اردو کو بہت کچھ فائدہ پہنچ سکتا تھا لیکن نہ تو اس نیت سے اعتراض کئے جاتے تھے اور نہ کسی کو سنجیدگی کے ساتھ اس کے سوچنے کی ضرورت محسوس ہوئی

(۶)

# نظیر اکبر آبادی

تاریخ ادب اُردو مرتب کرنے والے کے لئے ایک بڑی دقت نظیر اکبر آبادی کے سلسلے میں یہ ہوتی ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ انھیں کس دور کے شعرا کے ساتھ رکھا جائے ان کی صحیح تاریخ پیدائش معلوم نہیں لیکن ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کا خیال ہے کہ حملۂ نادر شاہی کے وقت دلی میں پیدا ہوئے تھے۔ یہی قرین قیاس بھی ہے کیونکہ انھوں نے طویل عمر پائی تھی اور ان کا انتقال ۱۸۳۰ء میں ہوا اگر پیدائش ۱۷۳۹ء یا ۱۷۴۰ء کے قریب مان لی جائے تو البتہ نظیر کے عہد معین کرنے میں کچھ آسانی ہو جاتی ہے پھر بھی زبان طرز بیان موضوع کے لحاظ سے ان کو کسی دور سے وابستہ کرنے میں قطعی فیصلہ کرنا باقی رہ جاتا ہے

ہم ان کو ایسی دنیا آپ سمجھ کر ہر دور سے الگ رکھتے ہیں ان کے کلام کی خصوصیات خود ایک دور کی خصوصیات کے برابر ہیں

نام ولی محمد تھا اور نظیر تخلص کرتے تھے والد کا انتقال بچپن ہی میں ہو گیا تھا احمد شاہ ابدالی کے زمانہ میں دلی چھوڑ کر اپنے خاندان کے ساتھ آگرہ آئے اور اکبر آبادی ہو گئے دلی اس زمانہ میں انقلابات کا گہوارہ تھی سیاسی سماجی تبدیلیاں ہو رہی تھیں نظیر کو بھی انھیں تبدیلیوں میں سے ایک تبدیلی سمجھنا چاہیئے کیونکہ غزلوں کی

رسمی شاعری کو الگ کرنے کے بعد نظیر کا نہ تو کوئی ہمعصر دکھائی دیتا ہے اور نہ ہم زباں
انھوں نے میر کی قنوطیت اور سودا کی ہمہ گیری بھی دیکھی، وہ درد کے تصوف سے بھی آشنا
تھے مرآت کی معاملہ بندی مصحفی اور انشاء کی چوٹوں کا نظارہ بھی انھوں نے کیا لیکن
دلی اور لکھنؤ کے مرکزوں سے دور رہ کر اپنی ایک الگ شاہراہ بنا لی جس پر خود ہی چلے
دوسرا کوئی اور ادھر قدم نہ بڑھا سکا

نظیر ایک متاعت پسند طبیعت لے کر آئے تھے درباروں سے وابستگی نہ تھی
اُن کا حلقہ احباب وسیع تھا اور اس حلقہ میں امیر و غریب، عالم و جاہل، پیشہ ور
اور غیر پیشہ ور، ہندو مسلمان کسی کی قید نہ تھی اس وسیع النظری اور وسیع المشربی کا اثر
ان کے کلام میں بھی نمایاں ہے نواب سعادت علی خاں نے لکھنؤ بلایا تھا نہ گئے
اور تقریباً عمر بھر آگرہ ہی میں لالہ بلاس رام کے یہاں معلمی کر کے شاعری کرتے رہے
کلام کا زیادہ حصہ بھی لالہ بلاس رام ہی کے یہاں سے ملا ورنہ نظیر کو خود اُس کے
جمع کرنے کا خیال نہ تھا صحبتی میں فالج کے اثر سے انتقال کیا

نظیر کی آزاد زندگی میں شاعری کو نئی راہوں پر جانے کا موقع خوب ملا
پابندیوں کی کمی، معیار کی قید سے آزادی، زباں کی لطافتوں کے جھگڑے سے
نجات حاصل ہونے کی وجہ سے نظیر کو اپنی شاعری کی دنیا وسیع کرنے کا موقع بھی
مل سکا اور اُنھوں نے غزل سے ہٹ کر نظموں پر اپنی ساری توجہ صرف کر دی
غزلوں میں تغزل اور کیف بہت ہے لیکن ڈاکٹر رام بابو سکسینہ مصنف تاریخ
ادبِ اُردو کا یہ کہنا کہ لکھنؤ کا قدیم طرز بھی نہیں گیا ہے شاید نظیر کی غزلوں کے
اُن اشعار کے پڑھنے کے بعد زیادہ صحیح نہ ثابت ہو جن میں خارجیت اور
رعایتِ لفظی ہے

کلیاتِ نظیر کی کچھ نظمیں ایسی معلوم ہوتی ہیں جو ہمیشہ دوستوں کی فرمائش

رہ گئیں اور کچھ وہ ہیں جو مکمل ہے لالہ ملاس رام کے لڑکے یعنی اپنے شاگرد کو خوش کرنے کے لئے جانوروں اور چڑیوں کے بارے میں لکھی گئیں لیکن اُنھیں میں بعض نظمیں ایسی بھی دیکھی جاسکتی ہیں جن میں تصوف کا کوئی مسئلہ اشاروں کنایوں میں بیان کیا گیا ہے ان نظموں کا دجرہ بھی کافی ہے جو جوانی اور جوانی کی سرمستیوں کا ذکر کرتی ہیں اگرچہ لہجہ اور اندازِ بیان کہیں کہیں مبتذل ضرور ہو گیا ہے لیکن موضوع کے اعتبار سے ایسا نہیں ہے کہ بہت زیادہ ناگوار ہو پھر اُن نظموں کی تعداد بھی کم نہیں ہے جن میں افلاس کی زندگی کو فطرت کی رعنائیوں کے ساتھ دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے بار بندگی کی تکلیفوں کی تصویر کھینچی گئی ہے چاہے وہ غریبی اور بڑھاپے کی وجہ سے ہو یا عشق ناکسی اور سب سے لیکن جن نظموں کی وجہ سے نظیر کا نام زندہ رہا وہ اُن کی واعظانہ اور ناصحانہ نظمیں ہیں جن میں کہیں تمثیل کی مدد سے اور کہیں صاف صاف نظموں میں زندگی کی بے ثباتی اور موت کا یقین دلانے کی کوشش کی گئی ہے جوانی میں جتنی رندی اور سرمستی کا مظاہرہ کیا تھا یہ بڑھاپے میں اُسی کا ردِ عمل معلوم ہوتا ہے مذہبی نظموں میں جہاں اسلام کے بعض رہنماؤں کا ذکر ہے وہاں گرو نانک بھی آئے ہیں اور اُن کے کلمات کا اچھا خاصہ حصہ ہے۔ مذہب کی روایات اور تہواروں کے رنگین اور دلکش بیان کے لئے وقف ہے

جیسا کہ ابھی بیان ہوا اُن کا تعلق کسی مرکز سے نہ تھا اس لئے وہ عوام کے قریب آئے اسی لئے اُن کو وہ زبان بھی اختیار کرنی پڑی جو عوام کے لئے قابلِ فہم ہو شاعری کی صناعانہ تکمیل تو اُن کے یہاں نہ ہو سکی لیکن اندازِ بیان کے لحاظ سے انھوں نے اپنے ہی شعور کا پورا پتہ دیا ہے انھوں نے نظم کی زبان موضوع کے اعتبار سے اختیار کی ہے چنانچہ نظیر کے کلیات کا مطالعہ کرنے والا مختلف قسم کی زبانوں کے نمونے دیکھنے کا جو موضوع کی مناسبت سے اس کے گرد کھینچ گئے ہیں۔

نظیر کے یہاں جو شاعرانہ واقعیت اور بیان کی صداقت ملتی ہے اس میں اگرچہ خیال کی گہرائی اور تاثیر کے تیر نشتر نہیں لیکن پھر بھی وہ ہمیں یہ ماننے پر مجبور کر دیتی ہے کہ ہم نظیر کو ایسا شاعر مانیں جس نے اپنی نظم کا مواد روزانہ کی زندگی سے حاصل کیا۔ اور اسے اپنے رنگ میں پیش کیا یہی سبب ہے کہ ان کے یہاں مقامی رنگ کافی ملتا ہے وہ کسی وقت خالص مثالی چیزیں نہیں پیش کرتے بلکہ اپنے گرد و پیش کے مناظر اور واقعات کو ایک پُرخلوص سادگی کے ساتھ سامنے لاتے ہیں اُن کی زندگی اور شاعری میں ایک طرح کی ہم آہنگی ہے جو نظم لکھنے والے کے لئے ضروری ہے۔ نظیر کے بارے میں نقادوں نے مختلف قسم کی رائیں قائم کی ہیں کسی نے انھیں شاعر ہی نہیں مانا ہے اور کسی نے انھیں انیس وغیرہ سے بڑا شاعر سمجھا ہے لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ وہ شاعر ہے مگر صفِ اوّل کے نہیں ڈاکٹر سکسینہ نے مختصر لفظوں میں بہت صحیح لکھا ہے کہ "نظیر میں سودا کا زور، میر کی بلند پروازی، انشاء کی طراوت، انیس و دبیر کا جوش و خروش نہیں ہے مگر یہ سب صفات اُس میں ایک حد تک ضرور پائی جاتی ہیں"۔

(۷)

# ناسخ

امام بخش نام، ناسخ تخلص تھا پیدائش فیض آباد میں ہوئی بعد میں لکھنؤ چلے آئے اُن کے حالات پر مختلف ارباب قلم نے مختلف رائیں قائم کی ہیں لیکن ان باتوں کو نہ تو تاریخ ادب سے تعلق ہے اور نہ بحث اتنی خوشگوار ہے کہ اسے یہاں چھیڑا جائے بس اتنا جان لینا کافی ہے کہ دنیائے ادب میں ان کی ترقی ذاتی تھی۔

ناسخ کو ورزش کا بہت شوق تھا خوراک کی مقدار کچھ کم نہ تھی پانچ سیر بچھیا کھاتے تھے جس پھل کے لئے جی چاہتا لگن اور سینیاں بھر کر سامنے منگاتے اور دم کے دم میں صاف کر جاتے مگر یہ سب باتیں اُن کے جثہ کے لحاظ سے نامناسب نہ تھیں نہایت قوی ہیکل لمبے تڑنگے فراخ سینہ منڈا ہوا سر سیاہ رنگ کھاروے کا سا ڈاڑھی شیر کی طرح مٹھے رہتے تھے

لکھنؤ میں انھوں نے عربی، فارسی پڑھی تحصیل علم کے بعد اصلاح کلام کے لئے میر کی خدمت میں حاضر ہوئے لیکن انھوں نے اصلاح کی زحمت نہ کی خواجہ عشرت لکھنوی مصنف "آب بقا" کا خیال ہے کہ میر کے انکار کے بعد مصحفی اور میر علی حال تنہا سے ناسخ اصلاح لیتے رہے لیکن عام طور سے یہ مشہور ہے کہ انھوں نے کسی سے اصلاح نہیں لی خود

دلی سے دیس آباد آئے آتش کی ولادت کا فخر بس آباد ہی کو حاصل ہے ابھی کم سن ہی تھے کہ باپ کا انتقال ہو گیا لہٰذا تعلیم پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکی بعد میں فارسی و عربی کسی حد تک پڑھ لی تھی

آتش کے حاداں میں پیری مریدی کا بھی سلسلہ چلا آتا تھا لیکن انھوں نے حاداں کی روش چھوڑ کر شاعری اختیار کی شیخ مصحفی کے شاگرد ہوئے اور اسا مام پیدا کیا کہ مسلم الثبوت اُستاد ہو گئے بلکہ سیکڑوں شاگردوں کو اُستاد کر دیا

اسی روپیہ ماہانہ بادشاہ لکھنؤ سے ملتا تھا پندرہ روپیہ گھر میں دیتے تھے، اور باقی راہ خدا میں غریبوں کو تقسیم کر دیتے تھے جس کا نتیجہ یہ تھا کہ مہینہ میں ایک آدھ فاقہ بھی ہو جاتا اکثر شاگرد امیرزادے تھے لیکن کوئی سلوک کرنا چاہتا تو یہ مشکل سے قبول کرتے۔ گو دھیری چھوڑ دی تھی لیکن فقیرانہ انداز ان کی طبیعت سے کبھی نہ گیا آزاد ان کی طرز معاشرت کے متعلق لکھتے ہیں "ایک ٹوٹے پھوٹے مکان میں جس پر کچھ چھت کچھ چھپر سایہ کے تھے دریا بچھا رہتا تھا اسی پر ایک لنگ باندھے صبر و قناعت کے ساتھ بیٹھے رہے اور عمر چند روزہ کو اس طرح گزار دیا جیسے کوئی بے نیاز و بے پرواہ فقیر تکیہ میں بیٹھا ہو کوئی متوسط الحال اشراف مالکو غریب آتا تو متوجہ ہو کر باتیں بھی کرتے تھے امیر آتا تو دھتکار دیتے تھے وہ سلام کر کے کھڑا رہتا کہ آپ فرمائیں تو بیٹھے یہ کہتے "ہوں! کیوں صاحب! دورے کو دیکھتے ہو کہ کیڑے حرام ہو جائیں گے یہاں مسند تکیہ کہاں؟"

ضعیفی تک مالکین اور سامان رفع کے ساتھ رہے گیرد انہ بند باندھتے تھے ایک ڈنڈا بھی ہاتھ میں ہوتا تھا پیر میں سلیم شاہی جوتا ہمیشہ دیکھا گیا ٹھاٹ پیے کا سو دن عمر بھر رہ گیا آخر وقت میں بینائی جاتی رہی تھی آزاد لکھتے ہیں کہ "۱۲۶۳ھ میں ایک دن بھلے چنگے بیٹھے تھے۔ یکایک موت کا ایسا جھونکا آیا کہ شعلہ کی طرح بجھ کر رہ گئے

آتش کے گھر میں راکھ کے ڈھیر کے سوا اور کیا ہوتا تھا میر دوست علی خلیل نے تحریر و تکھیں کی

آتش، ناسخ کے ہمعصر تھے جن سے مشاعروں میں ہنگامہ آرائی رہی مگر صرف نوک زبان تک محدود رہتی سودا اور انشاء کی طرح ہاتھا پائی کی نوبت نہ آتی لیکن اسا صرور ہے کہ اس جوش کو آداب دربار بھی دبا نہیں سکتا تھا۔ کبھی کبھی سر دربار نوک جھونک ہو جاتی آتش کا کارنامہ صرف ایک دیوان غزلوں کا ہے جو اُن کے سامنے رائج ہو گیا تھا دوسرا تتمہ ہے جو اُن کے بعد مرتب ہوا

لکھنؤ اسکول کا سب سے بڑا کام زبان کی درستی تھی چمنستان اردو کو حشو و حاشاک سے پاک کرنا اس نے اپنا فرض سمجھا اور انصاف یہ کہتا ہے کہ اس معرکہ میں اس اسکول کو بہت کچھ کامیابی ہوئی ناسخ نے خاص طور پر اصول مرتب کئے کہ کون الفاظ رکھے جائیں اور کون نکالے جائیں آتش نے صفائی زبان کو اسے یہاں آئینہ کر کے دکھایا چنانچہ سب سے پہلی خصوصیت جو اس کو سوا آتش کے یہاں ملے گی وہ زبان کی صفائی اور محاورات کا بہترین صرف ہے

روزمرہ اور بول چال کا لطف آتش کے کلام میں بے حد مزا پیدا کر دیتا ہے رنگینی اور شوخی ان کے کلام کی دلکشی دوبالا کرتی ہے اور پھر اس پر لطف یہ کہ اختصار کے ساتھ مضمون ادا ہوتا ہے جو سونے میں سہاگے کا کام دیتا ہے۔ مثلاً

ناگفتنی ہے عشق بتاں کا معاملہ
ہر حال میں ہے شکر خدا کچھ نہ پوچھیے

کہا جاتا ہے کہ آتش کے کلام میں صرف باتیں ہی باتیں ہیں علو تخیل و بلند پروازی مفقود ہیں مگر یہ خیال محض ان کے حریفوں کا ہو سکتا ہے حقیقت یہ ہے کہ ان کا دیوان مضامین بلند سے خالی نہیں فقیرانہ اور آزادانہ رنگ آتش کو انفرادی حیثیت دے کر

دوسرے شعرا سے ممتاز کرتا ہے اور شعر میں جان پیدا کر دیتا ہے ایک جگہ کہتے ہیں ۔

مرد فقر و دعا جانے ادب ہے عاقل
بادشاہ تخت سے یاں اپنے اُتر لیتا ہے

کام ہے تیشے سے ہم کو اور نہ ساغر سے غرض
مست رہتے ہیں شراب رُخ دلبر سے غرض

آتش کے یہاں تصوف کی چاشنی اس مزے اور آزادی کے ساتھ ہے کہ بے جا نہ ہوگا اگر اُن کو اُردو کا حافظ کہا جائے مستی کا عالم ملاحظہ ہو ۔

جہاں و کار جہاں سے ہوں بے خبر اس مست
زمیں کدھر ہے کہاں آسماں نہیں معلوم

آتش سہل الفاظ بہت کم استعمال کرتے ہیں اور جہاں کہیں ایسے الفاظ آجاتے ہیں وہاں طرز ادا اور نسبت الفاظ کی وجہ سے ان کو بھی دلچسپ بنا دیتے ہیں مثلاً "اس القصص" کی ساختہ کو دیکھئے تو غزل کے لئے ناخوشگوار معلوم ہوتا ہے مگر آتش نے کس مزے کے ساتھ اس کو نظم کیا ہے

حافظ رُخ کتابی محبوب کے ہیں ہم
اس القصص ہے ہمیں یاد ہو گیا

جس کے خارجی لوازمات کی تعریف اس زمانہ میں مقبول عام تھی مگر کہنے والے کبھی کبھی خود اُلجھ کر رہ جاتے تھے معنویت اور سادگی تو دور شعر میں ہلیلیاں ہو جاتا تھا مگر خواجہ آتش نے کمال کیا ہے کہ اس رنگ میں بھی دلکشی اور دلنشی آخر تک قائم رکھی ہے آتش تشبیہات کو بھی بے رنگ سے منتخب کرتے ہیں "تلاش کہتے ہیں" ۔

اب کی بہار میں تو مجھے مار اُتار دے
کشتی مے دو آتشہ اُمید و بیم سے

آتش کے یہاں چند کمزوریاں بھی نظر آتی ہیں کبھی کبھی عامیانہ مضمون نظم کر جاتے ہیں جس کو بحاظ یہ کہہ سکتے ہیں کہ باتیں ہی باتیں ہیں دوسرے یہ کہ الفاظ صحیح طور پر بعض وقت نظم نہیں ہوتے خواہ آپ اس کو علمی استعداد کی کمی سمجھئے یا یہ کہہ کر چپ ہو جائیے کہ عوام کی زبان پر یہ لفظ ایسے ہی رائج تھا جس کو آتش نے نظم کیا اس قسم کی مثالیں اور لوگوں کے یہاں بھی ملی ہیں مثلاً میر مسجد کو مسیت کہتے ہیں اسی طرح آتش نے بھی چند الفاظ لکھ دیئے ہیں مثلاً مستک کو تمش اور المضاعف کو المضاف حلوا کو حلوہ وغیرہ ان کے یہاں سب سے زیادہ تکلیف دہ چیز ناہمواری کلام ہے۔

ماحول سے شور ہو کر آتش نے بھی نوٹ ورعایت لفظی پر زیادہ توجہ کی جس کا کلام کا کافی حصہ اس خصوصیت سے مجروح نظر آتا ہے ایسے موقع پر کیف و تاثیر دونوں کمی نظر آتی ہے صاف نظر آتا ہے کہ قافیہ پیمائی اور رعایت لفظی کے لئے یہ اشعار کہے گئے ہیں لیکن جہاں کہیں آتش روایتی شاعری سے الگ ہو کر [illegible] و مردانگی و خود داری کے ساتھ جذبات قلمبند کرتے ہیں وہاں ان کی اعلیٰ خصوصیت ان کو اردو کے بہترین شعراء کی صف میں جگہ دلاتی ہے

## دیاشنکر نسیم

پنڈت[1] دیاشنکر نسیم ۱۸۱۱ء میں پیدا ہوئے ان کے والد کا نام پنڈت گنگا پرشاد کول تھا لکھنؤ آپ کا وطن تھا جیسا کہ اس زمانہ میں دستور تھا اردو، فارسی میں تعلیم پائی شعر لئے اردو و فارسی کا کلام نظر سے گزرتا رہا خلقی طبیعت داری اور دہانت نے شاعری کا سوتی لیا غرض کہ بیس برس کی عمر میں شعر و سخن کا اچھا خاصا مذاق پیدا کر لیا خواجہ حیدر علی آتش کی گرمی

---

[1] ماخوذ از مضامین حکیمت

حسن دانش بیانی نے ایسا فریفتہ کیا کہ ان کی شاگردی اختیار کی اپنی قابلیت کی وجہ سے بہت جلد شہرت حاصل کر لی مگر افسوس کہ موت نے بے وقت حملہ کیا۔ بتیس ۳۲ سال کی عمر میں ہیضہ کی بیماری نے دفعتہً ۱۸۴۱ء میں خاتمہ کر دیا

نسیم میانہ قامت گندمی رنگ سیہ چشم اور چھریرے بدن کے آدمی تھے سلسلۂ عاشقی یہ تھا کہ شاہی فوج میں دکھل تھے بڑے ظریف و بذلہ سنج آدمی تھے تیزی ذہن و دقت طبع کا عجب عالم تھا حاضر جوابی نیز زباں کی جوہر تھی ان ہی صفات خاص نے ان کا وقار ہمعصر شعرا میں قائم کیا

نسیم کی غزلیات میں آتش کے کلام کی طرح دنیا سے بے پروائی، خودداری، رندگی کی بے ثباتی اور بے باکی ہر جگہ نمایاں ہے زبان کا لطف عام طور سے آتش کے کلام کا مزہ دے جاتا ہے نسیم ایسے رہنے کے مذاق کے اعتبار سے تناسب لفظی کے بہت دلدادہ نظر آتے ہیں مگر معنویت و پاکیزگی کا بھی کافی خیال ہے ان کے کلام میں ترنگی و اختصار کی وجہ سے شعر میں خاطر خواہ خوبی پیدا ہو جاتی ہے۔ استعارہ کی ندرت اور تشبیہوں کی دلکشی سے کلام میں ایک نمایاں شگفتگی پیدا ہو جاتی ہے

نسیم کے متعلق چکبست کا یہ خیال ایک حد تک درست ہے کہ "گو یہ آتش کے شاگرد تھے لیکن آتش کی گرمی سخن ان کے کلام میں نہیں پائی جاتی ان کی مشکل پسند طبیعت نے ناسخ کا رنگ پسند کیا مگر باوجود تصنع کے جو اس رنگ کا خاص جوہر ہے۔ نسیم کا کلام بالکل بے نمک نہیں طبیعت میں ایک خداداد کیفیت ہے جو کلام کو مزیدار بنا دیتی ہے[1]"

نسیم کا ایک چھوٹا سا دیوان ہے جس میں علاوہ غزلوں کے چند خمس و ترجیع بند بھی ہیں مگر ان کی حیات جاودانی کا باعث یہ دیوان نہیں بلکہ وہ مثنوی ہے جس کا نام "گلزار نسیم" ہے۔

---

[1] مضامین چکبست ص۱۴۱

اس مثنوی کا خاص جوہر اختصار، پختگی کلام تناسب لفظی بندش کی چستی ہے سچ تو یہ ہے کہ نسیم نے تناسب لفظی کی صنعت کو معراج کمال پر پہنچا دیا ہے اردو شعرا کو قریب قریب ہمیشہ اس صنعت سے کم و بیش دلچسپی رہی ہے لیکن آتش و ناسخ کے زمانہ میں ضرورت سے زیادہ لوگوں کو اس کا چسکا ہو گیا تھا بعض لوگوں کا یہ ذوق جنون کے درجہ تک پہنچ گیا تھا بعض رعایت لفظی کے کوئی شعر اچھا نہیں معلوم ہوتا تھا امانت کا نام کس نے نہ سنا ہوگا ان کو اس صنعت سے خاص شغف تھا لیکن لطافت و متانت ان کے شعروں میں تناسب لفظی کی وجہ سے مجروح ہو جاتی ہے نسیم کا احسان ہے کہ انھوں نے اس رعایت لفظی کو اپنی مثنوی میں لوگوں کے مذاق کا خیال کرتے ہوئے اس لطافت و متانت کے ساتھ جگہ دی کہ گویا دنیا کو راستہ بتا دیا ہے کہ اس میدان میں یوں قدم اٹھایا جائے تو بجائے پاؤں لڑکھڑانے کے حرام مزا کا لطف پیدا ہو سکتا ہے گلزار نسیم کا دامن آورد سے پر ہے لیکن روانی و برجستگی کی وجہ سے آورد بھی آمد کا لطف دے جاتی ہے عموماً یہی معلوم ہوتا ہے کہ تناسب لفظی کو خواہ مخواہ اشعار میں جگہ نہیں دی گئی بلکہ طبیعت کی موزونیت نے ضرورت کے لحاظ سے یہ بے ساختہ صرف کر دیئے ہیں

اس مثنوی میں اختصار و معنی آفرینی ہر لحاظ سے نہایت قابل قدر ہے ایک شعر میں معنی کے اعتبار سے کئی کئی شعر کے مضامین بھر دیئے ہیں اور لطف یہ ہے کہ ہر جگہ مطلب واضح ہو جاتا ہے شاذ و نادر ہی کوئی موقع ایسا ہوتا ہے کہ مفہوم صاف نہ ہو نسیم کے یہاں رنگین بیانی کی وجہ سے سوز و گداز مثنوی میں بہت کم ہو گیا ہے لیکن بقول چکبست "نسیم کے اشعار زبان کی پاکیزگی اور ترکیب الفاظ کی چستی کے لحاظ سے تاثیر کا طلسم سے ہوئے ہیں"[1]

---

[1] مضامین چکبست ص ۱۲۹

# نصیر

نصیر الدین نام تھا اور نصیر تخلص سیاہ فام آدمی تھے اس وجہ سے گھر والے میاں کلو بھی کہتے تھے ان کے والد کا نام شاہ عرب تھا وطن خاص دہلی تھا خاندان میں فقیری اور پیری مریدی عرصہ سے چلی آرہی تھی شاہ نصیر چونکہ اپنے باپ کے اکلوتے بیٹے تھے اس لئے بڑی ناز و نعم سے پرورش ہوئی تھی غریب باپ نے اُستاد و ادیب رکھ کر شاہ نصیر کی تعلیم پر پوری توجہ کی مگر یہ اتفاق تھا کہ علمی استعداد بامہ مکمل تک نہ پہنچ سکی

شاعری میں نصیر نے شاہ محمدی مائل سے اصلاح لی تھی شاہ عالم کے زمانہ میں شاہ نصیر کی شاعری کو فروغ ہوا اور وہ دربار میں بڑی قدر و منزلت سے رکھے گئے ان کو بھی دربار سے ایسی محبت ہو گئی تھی کہ جب انگریزی عملداری ہوئی تو دربار چھوڑ کر حیدرآباد اور لکھنؤ کا سفر کرنے لگے مگر وطن کی محبت میں نہ لینے دیتی تھی کئی بار دہلی آئے گئے شاہ نصیر کی ذات اس لئے بھی قابلِ قدر ہے کہ جو فرض ولی کی وجہ سے دکن کا نصیب ہو گیا تھا اس کی ادائیگی میں انہوں نے بڑی دلچسپی لی تھی جب شاہ نصیر دکن پہنچے تو وہاں شعر و شاعری کا چرچا کم ہو چلا تھا لیکن ان کی آمد نے وہی کام کیا جو ولی کی موجودگی نے دہلی میں کیا تھا بزم سخن پھر روشن ہو گئی اور سینکڑوں نے شاہ نصیر کی شاگردی کی

شاہ نصیر کئی بار لکھنؤ تشریف لائے اور مشاعروں میں استادوں سے معرکہ آرائیاں رہیں یہاں آنے سے شاہ نصیر نے بھی ناسخ و آتش کا رنگ اختیار کیا اور ان کے کلام میں موٹے رنگینی رعایت لفظی کا عنصر غالب ہو گیا آتش کے اثر سے دہلی کے اور سعر اکی ناسخ کے قول میر انیس۔ ؎ بچا نہ گرد سے دامن بہت بچا کے چلے

ان کے مزار کا فخر دہلی اور لکھنؤ کو نہیں بلکہ حیدرآباد کو حاصل ہے۔ جہاں ۱۸۴۷ء میں اس دارِ فانی سے شاہ نصیر نے رحلت کی۔

ان کا کلام کمیاب ہے تھوڑا بہت کہیں کہیں مل جاتا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ طرافت کی چاشنی اور تشبیہات کی دلاویزی اُن کے کلام کی جان ہے زور بھی کافی ہے اور کمال یہ ہے کہ سنگلاخ ردیفوں میں بھی یہ زور قائم رہتا ہے۔ کبھی کبھی تعقید ہے۔ استعارے عامیانہ بھی ہو جاتے ہیں

شاہ نصیر کو مدرسہ گوئی میں بڑا ملکہ تھا۔ ہر مشاعرہ غزلیں کہتے تھے اور برجستہ اصلاح دیتے تھے

# ذوق

شیخ ابراہیم نام ذوق تخلص تھا شیخ محمد رمضان کے لڑکے تھے ذوق ۱۲۰۲ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے جب ذرا ہوش سنبھالا تو اُن کے والد نے حافظ غلام رسول کے پاس پڑھنے کو بٹھا دیا حافظ جی شاعر بھی تھے ہر وقت ان کے یہاں شعر و شاعری کا چرچا رہا کرتا تھا وہیں سے ذوق کو بھی شعر گوئی کا شوق ہوا اور حافظ جی سے اصلاح لینے لگے بعد میں شاہ نصیر کو دکھانے لگے رفتہ رفتہ مشق سخن نے ذوق کو اُستاد بنا دیا یہاں تک کہ ولی عہد سلطنت بھی ذوق سے اصلاح لینے لگے اور ذوق نے اپنی قابلیت کا وہ سکہ جمایا کہ خاقانی عہد کا خطاب دربار سے عطا ہوا بعد میں خان بہادر بھی ہو گئے تھے ساتھ ہی ساتھ ایک ہاتھی مع ایک موضعہ لقرنی کے مرحمت ہوا تھا

اُن کا انتقال ۱۸۵۴ء میں ہوا مرنے سے تین گھنٹہ پہلے یہ شعر کہا تھا ؎

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گزر گیا　　کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

ذوقی فطرتاً نہایت نرم دل اور سنجیدہ مزاج تھے خوفِ خدا دل میں اس قدر تھا کہ عمر بھر اپنے ہاتھ سے کوئی جانور ذبح نہیں کیا موسیقی سے خاص دلچسپی تھی، علوم اور رمل میں بھی کافی دستگاہ تھی طب میں بھی دخل تھا نماز و روزہ کے بہت پابند تھے گھنٹوں عبادتِ خدا میں مصروف رہا کرتے۔

ذوقی کے کلام کو دیکھ کر یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کی غزلوں میں تغزل کا اختصار برجستگی اور کسی قدر رنگینی بھی ہے لیکن ذوقی کی ایک اہم خوبی جو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے وہ زبان اور محاورات کی کشش ہے زبان کی صفائی اور لطافت میں مشکل سے کبھی فرق آنے پاتا ہے بلکہ ایسے مزے کے ساتھ الفاظ کو شعر کے سانچے میں ڈھالا جاتے ہیں کہ خود بخود ترنم پیدا ہو جاتا ہے

محاورہ ہر ایک شاعر صرف کرتا ہے جو بیدا ہوتا یا ہوتا اس کے امکان میں نہیں کمال اُس وقت حاصل ہوتا ہے جب زبان گھر کی لونڈی ہو آورد کی بجائے آمد ہو اور اُس کے ساتھ طبیعت میں جدا داد لطافت اور مذاقِ سلیم کا غلبہ ہو تب ہی نظر انتخاب باغ زبان سے وہ پھول چھانٹ کر لائے گی جو نہ صرف شگفتہ اور دیدہ زیب ہوں بلکہ جن کو دماغ کا ماغباں سر آنکھوں پر جگہ دے گا۔ ذوقی کی زبان جس قدر صاف اور نرم ہے وہ محتاجِ بیان نہیں اور پھر ذوقی ایسا مستند اور ثقہ جو محاورہ صرف کرتے ہیں وہ شعر کی جان ہو جاتا ہے اور شعر میں دلاویزی پیدا کر دیتا ہے

اخلاقِ حسنہ جس کثرت کے ساتھ ذوقی کے کلام میں ہیں وہ شاید ہی کسی دوسرے غزل گو کے یہاں دستیاب ہو سکیں تصوف کی چاشنی غزل میں ایک حد تک ضروری سمجھی گئی ہے چنانچہ اُن کے یہاں بھی تصوف کا عنصر آپ کو کافی ملے گا تصوف کے اکثر مسائل پر انھوں نے روشنی ڈالی ہے وحدت وجود وصال، فنا، بقا، عبرہ کے متعلق جو کچھ بیان کیا ہے وہ ہر لحاظ سے قابلِ قدر ہے

جہاں کہیں دوقی کے کلام میں شوخی کی جھلک ہے دلکشی کا سرمایہ ہے ایک جگہ کہتے ہیں ؎

مشکل ہے مرے عہدِ محبت کا ٹوٹنا
اے بے وفا یہ تیری خدا کی قسم نہیں

اشعار میں ضرب المثل نظم کرنے میں کوئی اُن کا ثانی نظر نہیں آتا اس خوبی سے ضرب المثل کا صرف کرتے ہیں کہ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ زبردستی لائے ہیں بلکہ شعر میں خود بخود آگئے ہیں اس سے صرف یہی نہیں معلوم ہوتا کہ اُن کی معلومات کا دائرہ وسیع ہے بلکہ علم و فضل کا بھی اندازہ ہوتا ہے کیونکہ نہ صرف اُردو، ہندی بلکہ عربی و فارسی کی بھی مثلیں پائی جاتی ہیں تشبیہات اور استعارات پر نظر ڈالیے تو اکثر اُن میں نئے اور عمدہ ملیں گے جس کی وجہ سے تاثیر کلام اور تیز ہو جاتی ہے

دوقی جب کبھی شعر میں گفتگو کا پہلو پیدا کرتے ہیں تو ایک ادا ایسی ہوتی ہے جو اُن کے کلام کی محبوبیت کو دوبالا کر دیتی ہے تشبیہ اور استعارے کی طرح ان کے یہاں سے فقرے اور ترکیبوں کا بھی انبار ہے مثلاً "تودۂ حسرت، کفِ ہر شاخ، لطارۂ رنگِ بہار" ایسے چمن وغیرہ

دوقی کے شعر عام طور سے صاف اور سادے ہیں غالب کی طرح مشکلات کے سرمایہ دار نہیں لیکن جذبات اور مضمون آفرینی عام طور پر مدنظر ہے دوقی کا مذاقِ خاص یہ ہے کہ کسی قدر سوٹ اور اس کے ساتھ رعایت لفظی لیکن ہوٹ میں بعید از قیاس باتیں نہیں لاتے۔ مجموعی حیثیت سے ان کی غزلیں پُر اثر ہیں سیر دلی در لودگی نہ ہونے کے برابر ہے تخیل میں بلندی کلام میں کیف بہت کم ہے مولوانہ ذہنیت کا غلبہ ان کے دیوان میں ہر جگہ ہے اکثر استعارہ فاحشہ پیمائی کے دوقی میں کہے گئے ہیں اور رعایت لفظی سے آراستہ کیے گئے ہیں مبالغہ کو شاید بلند پروازی کا مرادف سمجھ کر زیادہ زور و خوشی کے ساتھ کلام میں صرف کیا گیا ہے۔

قصیدہ گوئی میں ذوقؔ کا پایہ بہت بلند ہے سوداؔ کے بعد اس صنف شاعری کے معیار قائم رکھے ہیں انھوں نے بڑی قابلیت سے کام لیا مضامین میں تنوع، بیان میں زور و علمیت خاص طور سے نمایاں ہے الفاظ کا نادر و دلکش ذخیرہ خوبی سے ایک جا کرتے ہیں ترنم کا بہت خیال رکھتے ہیں تشبیب میں عموماً ندرت و نرکاری سے کام لیتے ہیں مختلف عنوانات سے دلچسپی پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کرتے ہیں مختلف مسائل پر بحث بھی کرتے جاتے ہیں روانی پر سب سے زیادہ توجہ ہے، باوجود سنگلاخ زمین و الفاظ کے ذہن کو رکاوٹ نہیں ہوتی مگر بلندی تخیل کی کمی اور جامعیت و ندرت کا نقدان ذوقؔ کو سوداؔ کے برابر نہیں پہونچنے دیتے۔

# غالبؔ

اسد اللہ خاں نام مرزا نوشہ لقب تھا نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ ستاہی خطاب تھا پہلے اسدؔ تخلص کرتے تھے بعد میں غالبؔ ہو گئے اُن کا خاندان امراں کا تھا اور سلسلۂ نسب افراسیاب بادشاہ توراں تک پہنچتا ہے جس پر مرزا کو بڑا ناز تھا مرزا کے دادا شاہ عالم کے وقت میں دلی آئے تھے یہاں سلطنت نے اپنے حسب حال اُن کی کافی عزت کی اور پہاں آنسو کا علاقہ بطور جاگیر کے دیا مگر شاہ عالم کے بعد ملک میں کچھ ایسی بدنظمی ہوئی کہ وہ علاقہ بھی جاتا رہا

غالبؔ کے باپ عبداللہ بیگ خاں آصف الدولہ کے زمانہ میں لکھنؤ آئے اور لکھنؤ سے حیدرآباد گئے بالآخر الور میں آکر راجہ بختاور سنگھ کی ملازمت کی اور یہاں کسی لڑائی میں ۱۸۰۱ء میں مارے گئے اس وقت مرزا کی عمر صرف پانچ برس کی تھی۔ باپ کے بعد اُن کے چچا نصر اللہ بیگ خاں نے مرزا کے سر پر ہاتھ رکھا یہ اکبرآباد کے صوبیدار

سنہ ۱۸۰۶ء میں جنرل لیک کا عمل ہوا تو مرزا نصر اللہ کو سواروں کی بھرتی کا حکم ہوا اور سترہ سو روپیہ ذات کا اور ڈیڑھ لاکھ روپیہ سالانہ کی جاگیر میں حاتی دی گئی مگر یہاں بھی حالی کو سکون نہ نصیب ہوا ابھی صرف نو برس کی عمر تھی کہ ایسے شفیق اور مقتدر چچا کا بھی انتقال ہو گیا جو رتاعتے ان کی پیش ہوئی حالی کو بھی سات سو روپیہ سالانہ ملتا رہا بہادر شاہ نے بھی حالی کو پچاس روپیہ ماہوار اور خلعت مقرر کر دیئے تھے لیکن غدر کے بعد یہ تنخواہ بھی بند ہو گئی اور نہایت تکلیف سے بسر ہونے لگی کچھ آرام پور چلے گئے اور یہاں ایک سو روپیہ ماہوار مقرر ہو گیا مگر وطن کی محبت نے وہاں بھی چین نہ دیا دلی واپس آئے تیس سال کے بعد پیش بھی جاری ہو گئی اور آخر عمر تک دلی ہی میں گزارا ۷۳ برس کی عمر میں سنہ ۱۹۶۹ء میں انتقال ہو گیا

حالی کو فارسی سے اردو ساست تھی تمام عمر غیر معمولی دلچسپی اس زبان سے لیتے رہے ہندوستان کے فارسی شعرا میں ان کا پایہ بہت بلند ہے حالی کی طبیعت میں حسن اور ساتھ ہی ساتھ متانت فطرت نے ایک جگہ جمع کر دی تھی اعلان و شگفتگی مزاج کی وجہ سے مرزا کثیر الاحباب ہو گئے تھے چنانچہ خط و کتابت کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو میں ایک بے نظیر خطوں کا مجموعہ ہو گیا جس سے اردو کے طرز بیان پر کافی اثر پڑا

حالی کا کلام تین دور میں تقسیم کیا جا سکتا ہے پہلا دور وہ ہے جس میں رائے ماحول کے الفاظ میں لیکن کچھ تو لوگوں کی نکتہ چینیوں اور کچھ مولوی فضل حق کی دوستی نے مرزا حالی کو رنگ بدلنے پر مجبور کیا کیونکہ یہ عام تنقید تھی کہ ان کا طرز بیان مانوس اور شعر بے لطف ہوتے ہیں دوسرا دور وہ ہے جس میں زبان کسی قدر صاف ہو گئی ہے اور کہیں کہیں سہل ہو گئی ہیں تیسرا دور وہ ہے جب تراکیبیں اور پیچیدا میں بہت قریب مائل جالی رہتی ہیں ان دور میں ان کی شاعری میں زیادہ ہو گیا ہے سلاست اور روانی خاص طور پر نمایاں ہے حدت اور بدرت سے کلام کی دور کا خالی نہیں حالی نے یا مال راستے

کو چھوڑ کر ایک نیا راستہ اختیار کیا اور چاہا کہ اہل ہند کو پوری طرح فارسی کی سر کرا دیں مگر ہندوستانی پھر بھی ہندوستانی رسوم کی پابندیوں نے اس کی اجازت نہ دی عالت آگے بڑھتے چلے جاتے تھے کہ پلٹ کر دیکھا تو سمجھے کہ زمانہ کو مری روش پسند نہیں لوگوں کی دل شکنی کا خیال ہوا ناچار خود اس راستہ کو چھوڑ دیا مگر یا مال راستہ سے ملی ہوئی ایک ہک ڈنڈی نکالی جس پر عمر بھر گامزن رہے اور رفتہ رفتہ زمانے کو اس پر چلا کر چھوڑا

خیال میں بلندی اور مضامین کی ندرت کو مرزا نے ایسا حصہ دیا تھا جس کا ایک زمانہ گرویدہ نظر آتا ہے ان کے یہاں صنعت اور ماکرہ استعارہ کام میں لائی گئی ہیں علو تخیل اور معنی آفرینی ان کے طائر کلام کے پر پرواز ہیں جو مضمون کو کنگرۂ عرش تک پہنچا دیتے ہیں

ٹھیٹھ مضمون بہت اختصار کے ساتھ ایک شعر میں نظم کر دیتے ہیں ان کے کلام کی مخصوص اور بلندی عام سطح سے بہت بلند ہے غالب کی سی ہموار غزلیں مشکل ہی سے کسی اور دیوان میں نظر آسکتی ہیں ان کا کلام کئی لحاظ سے دماغ پر دیرپا ہے منجملہ ایک عنوان یہ بھی بہت پر لطف ہوتا ہے کہ کبھی کبھی ان کے اشعار میں دو ایک مانوس ایسی محاورے ہوتی ہیں جن کو پڑھتے ہی ان کی طرف سے ہنسی آجاتی ہے بلکہ استعارہ ہی میں بعض الفاظ ایسے لطف اشارے کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کا ذہن خود بخود اسی ماحول کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو عالت کے پیش نظر تھا یہ ذہن کا ذرا سا ایک کیف پیدا کر دیتا ہے غور کرنے سے سب کچھ ذہن میں آجاتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیزیں بھی شعر میں موجود تھیں درد و غم کی داستان بہت موثر اور مختصر الفاظ میں بیان کرتے ہیں غالباً یہ طرز ادا اثر کے یہاں سے حاصل کی ہے۔ عالت کی نگاہ زندگی کے حقیقی اور عملی پہلو پر پڑتی ہے وہ تصوف کے اکثر رموز و مسائل بہایت لطف پیرائے میں بیان کرتے ہیں جہاں کہیں ان کے کلام میں سوقی ہے وہ بہایت دلکش ہے ابتذال کی جھلک کہیں نہیں آنے پاتی۔ "نگارستانِ عرل" میں جتنا تنوع عالت کے یہاں ہے اور

کہیں نہیں مل سکتا حیات و موت، مرد اختیار، سود و زیاں، گناہ و ثواب سب فلسفیانہ عمق کے ساتھ ان کے کلام میں جگہ پاتے ہیں حسن و عشق کے چھوٹے چھوٹے مسائل سنجیدگی کا رنگ پاتے ہیں عالمِ تحیرات و واردات قلب کو ہو بہو بیان کر دیتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر شخص "میں نے یہ سمجھا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے" کے طلسم میں اسیر ہو جاتا ہے عالمانہ فلسفیانہ کاوشوں اور لہجہ کی بلندی سے اُردو ادب کو دفعتاً بلند کر دیا، زبان کی سطح ہمیشہ سے زیادہ بلند ہو گئی

# مومن

ان کے والد کا نام غلام نبی خاں تھا خاندانی پیشہ طبابت تھا مومن خاں کے دادا سلطنت مغلیہ کے آخری دور میں دلی آئے اور شاہی طبیبوں میں داخل ہو گئے اسی سلسلہ میں کچھ جاگیر بھی عطا ہوئی

مومن خاں کی ولادت ۱۸۰۰ء میں ہوئی اُن کے والد کو شاہ عبدالعزیزؒ سے عقیدت تھی چنانچہ یہ نام شاہ صاحب موصوف ہی نے رکھا تھا ابتدائی تعلیم شاہ عبدالقادر سے حاصل کی عربی سے فراغت حاصل کرنے کے بعد اپنے خاندان میں طب کی کتابیں پڑھیں ذکاوت اور حافظہ قسام ازل نے مومن خاں کو خاص طور سے عطا کیا تھا علوم میں وہ مہارت حاصل کی کہ بڑے بڑے علم سے دکھا کرتے تھے۔ شاعری میں شاہ نصیر سے اصلاح لیتے رہے اصناف شاعری میں قصیدہ، رباعی، واسوخت، غزل، ترکیب بند، ترجیع بند، مثنوی سبھی پر طبع آزمائی کی ہے تاریخ گوئی میں کمال تھا بات بات میں تاریخ کہتے تھے

مومن کی یادگار ایک دیوان اور چھ مثنویاں ہیں کلام دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ معنی آفرینی اور جدت بیان کے لحاظ سے اردو میں کم شعرا اس پایہ کے گزرے ہیں

فارسی ترکیبوں اور الفاظ کے اُلٹ پھیر سے سادی بات کو بھی سادہ رہا سکتے ہے، کبھی کبھی الفاظ کی تکرار تاثیر بڑھانے میں مدد دیتی تھی مومن کا دل عشق کی لذت سے خوب واقف تھا اس وجہ سے درد اور مرا کلام کو دلکش اور پُر لطف بنا دیا ہے استعارہ میں تھوڑی سی پیچیدگی، طنز، تشبیہ اور استعارے کی مدرت اُن کی انفرادی خصوصیات میں داخل ہیں فرسودہ خیال کو بھی اسلوب بیان کے زور سے بیا کر لیتے ہیں جس سے پُر لطف معنویت پیدا ہو جاتی ہے ان کی جذبات نگاری میں اصلیت کا پہلو بہت نمایاں رہتا ہے کیونکہ وہ واردات قلب اور محبت کی نفسیات کو مدنظر رکھ کر شعر کہتے تھے ان کی عریں فلسفیانہ مباحث سے بھی خالی نہیں حیات و موت کی کشاکش مختلف طریقوں پر بیان ہوئی ہے اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کہیں کہیں ان کے الفاظ ان کے تخیل کا مفہوم پورا نہیں کرتے اور سننے والے یا پڑھنے والے کا ذہن خود اُن کے خیال تک نہیں پہنچتا

مومن کو مثنوی نگار کی حیثیت سے کوئی خاص شہرت نہیں حاصل ہوئی ان کی مثنویاں ان کی حیات کی آئینہ دار ہیں جن میں جذبات کی آمد اور زبان کی سلامت اور روانی خاص طور پر قابل ذکر ہیں قصائد کے اعتبار سے وہ قصیدہ لکھنے والوں کی پہلی صف میں نظر آتے ہیں مگر طبیعت کی خودداری کسی بادشاہ یا امیر کا قصیدہ لکھنے سے مانع رہی، روزگار دین کی شان میں متعدد قصیدے کہے صرف دو قصیدے دیوان میں ایسے ہیں جو راجہ اسیت سنگھ اور فرمانروائے لوٹک کی تعریف میں ہیں لیکن وہ بھی صلہ کی اُمید پر نہیں ان کے واسوخت بھی عشق مجازی کے ایک رُخ کو واضح کرتے ہیں

۵۳ برس کی عمر میں کوٹھے سے گرنے، پانچ مہینہ بیمار رہ کر ۱۸۵۱ء میں انتقال کیا

# دور کی خصوصیات

اس دور کی خصوصیات میں ایسی دو ذہنیتوں سے مابقہ پڑتا ہے جن کی راہیں بالکل الگ سی معلوم ہوتی ہیں

(۱) غالب و مومن اور آتش خیالات اور معنویت کی طرف زیادہ مائل تھے دوق تعمیر اور ناسخ کا رجحان زیادہ تر زباں اور عروض کی طرف تھا

(۲) غالب نے فلسفیانہ، حکیمانہ، خیالات کا اردو شاعری میں سنگ بنیاد رکھا جس کا نتیجہ اس وقت تو نہیں مگر بعد کو ظاہر ہوا لیکن خیالات میں تنوع اور اندازِ بیاں میں جدت اسی وقت لوگوں کے سامنے آگئی

(۳) زباں کی صفائی، تشبیہات، استعارات کی رنگینی، رودر سے زیادہ بڑھ گئی

(۴) روایت لفظی اور خارجی پہلو پر بعض شعرا نے اتنا زور دیا کہ پورے دور کو متاثر ہونا پڑا بلکہ اس کے بعد آنے والے دور کو بھی انھیں کی تقلید کرنی پڑی۔

(۵) شاعری کا دائرہ زیادہ تر غزل تک محدود رہا، قصیدہ و مثنوی پر کم توجہ کی گئی جن لوگوں نے اس طرف توجہ بھی کی وہ اپنے پیش رووں سے آگے نہ بڑھ سکے

(۶) فارسی و ترکی کے الفاظ و ترکیب اردو شاعری میں تیزی کے ساتھ جگہ پانے لگے جس پر پہلے سے زیادہ توجہ کی جانے لگی

(۷) چونکہ سلطنت کا نقشہ بدل رہا تھا دہلی اجڑ رہی تھی اور لکھنؤ نظام آباد ہو رہا تھا اس وجہ سے اس دور کے کلام میں رعنائت و قنوطیت شاعری کے میدان میں دوش بدوش نظر آتی ہیں، دہلی کے شعرا کے یہاں ایک گونہ یاس و اضمحلال ہے، لکھنؤ کے شعرا میں شاعرانہ بے بسی کو چھوڑ کر احساس میں شگفتگی نظر آتی ہے

(۸)

# امیر

امیر احمد نام اور امیر تخلص تھا مولوی کرم محمد لکھنوی کے صاحبزادے ہیں ۱۶ شعبان ۱۲۴۴ھ میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے بادشاہ نصیر الدین حیدر کا زمانہ تھا لکھنؤ فضل و کمال کا مرکز ہو رہا تھا علما اور مجتہدین علم کے دریا بہا رہے تھے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے اور بعد میں علمائے فرنگی محل سے حاصل کی امیر طب نجوم جفر و غیرہ سے بھی واقف تھے طبیعت بچپن ہی سے شعر و سخن کی طرف مائل تھی اور پھر اس وقت لکھنؤ کی فضا ایسی تھی کہ ہر طرف شاعری برس رہی تھی امیر نے بچپن ہی سے شعر کہنا شروع کر دیا کچھ دنوں کے بعد آتش کے شاگرد ہو گئے آتش کے شاگردوں میں کوئی دوسرا فرد گرامی نہ تھا چنانچہ جب واجد علی شاہ کا دور آیا اور امیر کو دربار میں رسائی نصیب ہوئی تو اپنے ساتھ امیر کو بھی وہاں لے گئے امیر کو بھی رفتہ رفتہ فروغ حاصل ہوا دو کتابیں "ارشاد السلطان" اور "ہدایت السلطان" لکھ کر بادشاہ کے دربار میں پیش کیں اور صلے میں جلعت و خرچہ سے سرفراز ہوئے

امیر کے کلام میں واجد علی شاہی دربار اور لکھنؤ کے اس دور کے رنگ کی جھلک اکثر نظر آتی ہے یعنی معشوقوں کی محفل ادا میں گفتگو چھیڑ چھاڑ دیپر راگ کی صحبتیں سب کا لطف نظر آتا ہے

صحبتیں منتشر ہو چکی تھیں مگر امیر ان چیزوں کو نہایت حسرت و یاس کے ساتھ یاد کیا

کرتے تھے چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں

امیر افسردہ ہو کر غنچۂ دل سوکھ جاتا ہے
وہ ملنے ہم کو قصر باغ کے جب یاد آتے ہیں

لکھنؤ کی رونق واجد علی شاہ کے ساتھ رخصت ہو گئی تھی رہی سہی بہار بھی غدر کے ہنگامہ میں ختم ہو گئی بلکہ وہ مصیبت آئی کہ شہر کے اہل کمال بھی ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے ناچار امیر کو بھی کبھی کاکوری کبھی بہرائچ کبھی مین پوری جانا پڑا بالآخر رام پور میں آ کر مقیم ہوا اور یہیں ریاست وحید الزماں لکھنوی کی لڑکی سے عقد ہوا نواب رام پور امیر سے لیے کلام پر اصلاح لینے لگے امیر کی قدر و منزلت رام پور کے دربار میں ایسی ہوئی کہ ۴۲ سال تک یہیں رہے وارث کے بلانے سے حیدرآباد کا سفر کیا لیکن مالے ہی بیمار پڑے اور ایک مہینہ تک بیمار رہ کر ۱۹۰۰ء میں راہی ملک بقا ہوئے

امیر اپنی قابلیت کے لحاظ سے فخر روزگار تھے ان کے کارنامے کی فہرست کافی لمبی چوڑی ہے دو کتابوں کے نام پہلے آ چکے ہیں لیکن اور بہت سی تصنیفات ان کے علاوہ ہیں مجملہ دو مثنویاں 'نور تجلی' اور 'ابر کرم' اور مسدس مسمی صبح ازل شام ابد لیلۃ القدر ذکر سیاہ اسما مشہور ہیں واسوخت بھی خواجہ حاتم کی تصویر میں دیوان مراۃ الغیب ۱۲۹۰ھ اور مسمی جام عشق ۱۲۹۲ھ میں شائع ہوئے کچھ اور کلام بھی ہے جو ان کے سامنے شائع نہیں ہو سکا ایک کتاب سرمۂ بصیرت ہے جس میں عربی اور فارسی کے وہ الفاظ دیے ہیں جو اردو میں عام طور پر غلط استعمال ہوتے تھے ان الفاظ کو صحیح طور سے استعمال کر کے اس کتاب میں دکھایا گیا ہے امیر کی تصنیفات میں امر الحساب ایک عدیم المثال لغت ہے امیر کا ابتدائی کلام ایک حد تک داغ کے رنگ میں ہے لیکن خوبی یہ ہے کہ نہ تو تقلیدی شاعری خشک ہوتی ہے اور نہ تصنع کی شاعری سے کیف ہوتی ہے تکلف میں امیر نے ایسی لطافت و رنگینی بھر دی ہے کہ رکاکت اور ثقل سے

علاوہ ایک خاص مزا پیدا ہو گیا ہے جو اُن کے کلام کو دوسروں کی ایسی شاعری سے بہت زیادہ دلکش اور پُر لطف بنا دیتا ہے برخلاف اس کے جب وہ داغ کی سادگی اور بے تکلفی اختیار کرتے ہیں تو کبھی کبھی ثقیل اور ابتذال پیدا ہو جاتا ہے

آپ کے کلام میں فصاحت اور ترنم خاص طور پر نمایاں ہیں سوقی کلام کے لطف کو دوبالا کرتی ہے اور عام طور پر مناسبت قائم رہتی ہے صحت زبان اور روزمرہ کہیں ہاتھ سے جانے نہیں پاتے البتہ ضرور ہے کہ سوقی کبھی کبھی مناسبت کے حاشیہ سے باہر نکل آتی ہے لیکن جب اس زمانہ کے مذاق پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ عیب کچھ زیادہ تکلیف دہ نہیں معلوم ہوتا

آپ کا کلام عام طور سے صاف اور سلیس ہے قول حال اور محاورات کے لحاظ سے لکھنؤ کی ٹکسالی زبان کا بہترین نمونہ ہے تصوف کی جھلک اُن کے کلام میں وسیع النظری کا ثبوت ہے مگر اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُن کا کلام ایک بڑی حد تک مستورات کی کہانی کا دھیرہ ہے جو ممکن ہے کہ موجودہ روشنی والوں کو ناپسند ہو لیکن اس زمانہ میں دل کی گفتگو دھڑکنوں کی بقا کے لئے اسے ضروری سمجھا جاتا تھا

# داغ

نواب شمس الدین خاں کے بیٹے تھے سنہ ۱۸۳۱ء میں دلی میں پیدا ہوئے ابھی چھ سات سال کے رہے ہوں گے کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا ماں نے بہادر شاہ کے بیٹے مرزا محمد سلطان عرف مرزا خضر سے شادی کر لی اس سلسلے سے داغ کو بھی لال قلعہ میں رہنا نصیب ہوا اور وہیں تعلیم و تربیت پائی لال قلعے کے تعلق سے دو تین سا اُستاد ملا انہیں سے اصلاح لیتے رہے اور انہیں کے ساتھ مشاعروں میں جانے لگے

سنہ ۱۸۵۷ء میں مرزا خضر کے انتقال کے بعد ان کو مع اپنی ماں کے قلعہ چھوڑنا پڑا

اس سے بڑھ کر یہ مصیبت ہوئی کہ اگلے سال غدر کا ہنگامہ رونما ہوا اور داغ مصائب میں مبتلا ہو گئے اس کے بعد رام پور آئے نواب یوسف علی خاں کا زمانہ تھا وہ بہایت علم دوست تھے لکھنؤ اور دہلی کے بعد شعرا کا ٹھکانہ رام پور ہی رہ گیا تھا یہاں داغ کی بڑی قدر ہوئی کلب علی خاں ولیعہد کے مصاحب خاص مقرر ہو گئے خاں کی زندگی میں داغ یہیں رہ گئے ان کے انتقال کے بعد حیدرآباد آئے یہاں بھی قدر و منزلت سے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا بڑی تنخواہ کے عاوہ وقتاً فوقتاً انعامات سے بھی سرفراز ہوتے رہے حیدرآباد ہی میں داغ گرانبار ہو گئے اور کچھ دنوں بیمار رہ کر ۱۹۰۵ء میں انتقال کیا اور وہیں دفن ہوئے

چار دیوان گلزار داغ، آفتاب داغ، ماہتاب داغ، یادگار داغ ہیں ایک مثنوی فریاد داغ اور چند قصائد اور رباعیات بھی موجود ہیں داغ کے کلام پر نظر ڈالنے سے چند باتیں صاف نظر آتی ہیں سب سے پہلی چیز زبان کی صفائی اور روانی ہے ثقیل الفاظ اور فارسی ترکیبوں سے انھوں نے بڑی حد تک گریز کیا ہے پیچ در پیچ استعارے اور بعید از کار خیالات اُن کے یہاں نہیں پائے جاتے جلبلایں اور شوخی ان کے کلام کی جان ہے لیکن یہی شوخی کبھی ابتذال تک پہنچ جاتی ہے اور رنگین بیانی عامیانہ پن کی جھلک لئے ہوئے محفل انس میں نمودار ہوتی ہے معاملہ بندی، شباب اور مستی کی تصویریں کہیں کہیں ایسی بے ساختگی اور شوخی لطافت سے مزہ پیدا کر دیتی ہیں اور کبھی مذاق سلیم پر بار ہو جاتی ہیں داغ کے کلام میں عشق کم ہے محبت کی ترجمانی بیشک اس انداز سے ہے کہ ہر شعر پر کیف ہے مگر درد و گداز زیادہ نہیں تشبیہ و استعارات میں ندرت کی کمی ان کے اختراع پر داغ ہے ان کی غزلوں میں رطب و یابس بہت پایا جاتا ہے کچھ اشعار انھوں نے ایسے رنگ سے الگ ہو کر صرف مردہ شاعری کی تقلید میں لکھے جو عموماً خشک اور بے کیف ہیں لیکن اُن کی شوخی ایسے اشعار کو ابھرنے کا موقع نہیں دیتی۔ لفظ "تیور" اور "تکھائیں" کا صحیح اطلاق اگر شعر پر ہو سکتا ہے تو وہ داغ کے اشعار ہیں جہاں حسن اور محبت دونوں شوخ اور بے حجاب ہیں

اُردو شاعری پر داغ کا بڑا اثر رہا اُن کے زمانے ہی سے عام طور پر دوسرے شعراء اُن کی تقلید کرنے لگے تھے اس کے بعد بھی عرصہ تک لوگ داغ کی شاعری کا اثر لیتے رہے

# جلال

سید صاحب علی نام تھا ۱۲۵۰ھ میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے حکیم اصغر علی کے بیٹے تھے فارسی و عربی کی تعلیم اعلیٰ پیمانہ پر حاصل کی آبائی پیشہ کا بھی حال رکھا طبیعت کی بھی قابلیت ہم پہنچائی مگر شعر و شاعری میں زیادہ انہماک رہا ان دنوں لکھنؤ کے مشہور شاگرد رسا کا طوطی بول رہا تھا جلال اُن کی خدمت میں حاضر ہوئے اصلاح لینے لگے مگر کچھ عرصہ بعد رشک زیارت کی غرض سے عراق چلے گئے تو جلال مرزا کو اپنا کلام دکھانے لگے

لکھنؤ کا ماحول اس زمانہ میں شعر و شاعری کے لئے بہت موزوں تھا۔ شاعروں میں بڑے بڑے سخن فہم و صاحب کمال جمع ہوتے جو کئی عربیں بڑھے دوسروں کی بھی ہمت افزائی کرتے دلق، تحر، اسیر، اصغر، بیخود وغیرہ سب کے سب سرگرم سخن ہوتے جلال بھی اسی داستان میں طبع آزمائی کی غرض سے حاضر ہوئے گویا انہیں ایسے بڑے بڑے صاحبان فن کی صحبت نصیب ہوگئی تھی طبع پر زور دینے کا کافی موقع ملتا رہا

لکھنؤ کی یہ رونق و نشاط زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکی غدر ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ نہ کہتا دامن پر آپہنچا ع

اُٹھے کہ اب وہ لذت صحبت نہیں رہی

محفل درہم برہم ہوگئی جس کو جدھر راہ ملی بھاگ نکلا جلال نے حکمت کے دامن میں پناہ لی لکھنؤ میں عشق مدراسے وقار کے مکان میں مطب قائم کیا اور گزر اوقات کا اہتمام کرنے لگے کچھ دنوں کے بعد نواب یوسف علی خاں والی رام پور نے ان کو اپنے یہاں

بلا لیا جلال ان کے بعد بھی کوئی بیس سال تک عزت و احترام کے ساتھ رام پور میں رہے نواب کلب علی خاں نے اپنے دربار کو دہلی و لکھنؤ کا خاکہ سا بنا دیا تھا اور امیر، داغ، تسلیم وغیرہ کو اکٹھا کر لیا جلال کو یہاں بھی معرکہ آرائیوں سے فرصت نہ ملی کلب علی خاں کے مرنے کے بعد یہ صحبت بھی منتشر ہوئی کوئی حیدرآباد گیا کوئی کہیں گیا جلال کو حسین میاں ریاست مگر دل کے نواب نے اسے یہاں بلا لیا مگر یہاں زیادہ دنوں تک قیام نہ رہ سکا واپس چلے آئے ۱۹۰۹ء میں ۷۷ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا

جلال نے زبان و شاعری میں تاریخ کی پوری تقلید کرنے کی کوشش کی قواعد پر خاص توجہ کی بعض بحث، مذکیر و تانیث کا جھگڑا، محاورات و عروض کا مسئلہ ہر وقت پیش رہا ان سب باتوں کا نتیجہ کچھ اچھا ہی ہوا کبھی ایک لغت، قواعد، عروض کی کتاب جلال نے مرتب کر دیں جو ادب کے لئے مفید تھیں۔ مگر گرامر کو ہر علمی نقطۂ نظر سے منظم کرنے میں جلال نے بڑی کاوش سے کام لیا اس لحاظ سے ان نے اُردو ادب میں ایک ایسی ایک جگہ پیدا کر لی اپنے عہد میں اُردو کے باکمال اُستاد اور خاص سرپرست سمجھے جانے لگے علمی قابلیت کی وجہ سے ان کا سکہ تمام دُنیائے اُردو میں اس وقت رائج ہو گیا

شاعری میں اُنھوں نے اپنا اثر نمایاں لکھنؤ پر قدم رکھا خارجی عناصر و رنگینی بیان پر زیادہ زور دیا علو تخیل و پرجوش اندازِ بہت کم ہے لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُن کا کلام غلطیوں سے پاک ہے استعارات، زبان و محاورات و عروض کے لحاظ سے بہت صحیح و مستند ہیں

ایک حصہ جلال کے کلام کا ایسا ہے جس میں اُنھوں نے میر کی تقلید کی ہے جس میں تاثیر و سادگی و معنویت نہایت خوبی سے نمایاں ہیں ان کی اکثر غزلیں اپنے رنگوں کی روش کے برخلاف مختصر و صاف ہیں رعایت لفظی، سوٹ وغیرہ صرف ہیں لیکن لطافت و کیف سے خالی نہیں اس لئے تصنع کا اثر زیادہ بُرا نہیں پڑتا اور جہاں کہیں معنویت و سادگی کی طرف جلال

جلال

ے لوجہ کی ہے وہ اشعار اپنے رنگ میں بے نظیر ہیں

جلال نے قصائد پر بھی کافی توجہ کی شکوہ الفاظ مضمون آفرینی کبھی کبھی تشبیب میں تنوع پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جس سے ان کے عالم وہمہ داں ہونے کا صاف ستہ چلتا ہے لیکن اس صنف شاعری میں کوئی خاص شہرت نہ حاصل کر سکے صرف اتنے زمانہ کے معیار قصیدہ گوئی کو حسن و خوبی کے ساتھ برقرار رکھنے کی کوشش کرتے رہے جلال کی علمی قابلیت کا اندازہ کرنے کے لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تصنیفات کی ایک فہرست بھی ساتھ ہے

۱ دیوان اول شاید شوخ طبع

۲ دیوان دوم کرشمہ جات سخن

۳ دیوان سوم مضمون ہائے دلکش

۴ دیوان چہارم نظم رنگین

ان کے علاوہ لغت و قواعد وغیرہ رحسب ذیل کتابیں ان سے یادگار ہیں

۵ سرمایہ زبان اردو محاورات کا لغت ہے

۶ افادہ تاریخ تاریخ گوئی کے متعلق ہے

۷ صحت القواعد

۸ سمع اللغات

۹ گلشن فیض (لغت ہے)

۱۰ مفید الفصحاء

## دور کی خصوصیات

(۱) شاعری میں رنگینی، معاملہ بندی، شوخی زیادہ ہوتی گئی

(۲) لکھنؤ اور دہلی اسکول ایک دوسرے سے اب بھی متاثر ہو رہے تھے شعرائے لکھنؤ دہلی کی

طرف زیادہ مائل تھے۔

(۳) اب سے پہلے دور کی وسعت، دور دراز کی تشبیہات، پیچیدہ استعارات کم ہو چلے لطافت و کیف کے ساتھ ساتھ تھوڑی سی سادگی بھی کلام میں جگہ پانے لگی

(۴) استدلال و مسالحہ و فلسفہ بیانی کا اس دور میں بھی حصہ رہا

(۵) زبان، قواعد و صحت کا زیادہ خیال رہا مختلف لغات و کارآمد رسالے لکھے گئے گویا شعرائے بھی نثر کی طرف توجہ کی اور اپنی تحریروں سے زبان کو زیادہ سے زیادہ مسلم کرنے کی فکر کی

(۶) مرثیہ کی وجہ سے جس وعشق کے علاوہ دوسری راہیں بھی شاعر کو مل گئیں رزم و بزم کی داستاں، واقعات کی مسطر نگاری، ماں باپ کی محبت، بھائی بھائی کی محبت، بہن کی محبت، امیر غریب کا کردار، غرض کہ مختلف و متعدد موضوعات اُردو شاعری کے ہاتھ آ گئے

(۹)

# مرثیہ

یہاں مرثیہ سے مراد وہ نظمیں ہیں جو واقعات کربلا کے متعلق وقتاً فوقتاً کہی گئیں امام حسینؑ کی شہادت کے بعد ہی سے ایسی نظمیں عربی میں آنے لگیں بعد میں فارسی سے بھی اتر لیا اور اچھا خاصا ایک ذخیرہ تیار ہو گیا اُردو میں ابتدائی عہد سے یہ چیز آ گئی تھی بعض لوگوں کا تو خیال ہے کہ دکن میں اُردو شاعری کی ابتداء مرثیہ سے ہوئی، لیکن یہ فیصلہ زیادہ اطمینان بخش نہیں بہرحال قطب شاہی دور میں اس کے اچھے نمونے ملتے ہیں

شروع میں مرثیہ بہت مختصر ہوتا تھا کوئی خاص شکل بھی معین نہ تھی کبھی مربع کی شکل میں رہا کبھی غزل کی شکل میں مضمون کے لحاظ سے زیادہ تر مضامین و واقعات پڑھے ہوتا عموماً، سی نقطہ نگاہ سے دیکھا جاتا اور ثواب کے لئے پڑھا جاتا۔ شمالی ہند میں میر و سودا کے مرثیے مشہور ہوئے اور اسی عہد میں اس کی شکل مسدس کی ہو گئی جو رفتہ رفتہ اتنی مقبول ہوئی کہ مستقل طور پر مسدس مرثیوں کے لئے مخصوص ہو گیا۔

ابھی تک فنی اعتبار سے مرثیہ کو نمایاں حیثیت نصیب نہیں ہوئی تھی میر ضمیر نے اس طرف خاص توجہ کی اس کے اجزائے ترکیبی معین کئے یعنی مرثیہ کو آٹھ حصوں میں تقسیم کیا

(۱) چہرہ (۲) سراپا
(۳) رخصت (۴) آمد

(۵) رجز　　(۶) جنگ

(۷) شہادت　　(۸) بین

ان کے بعد والوں نے بھی اسی راستہ پر قدم رکھا اور ان خصوصیات کو برابر سراہتے رہے اس وقت سے مرثیہ میں وہ چیزیں لائی گئیں جو اس سے پہلے اُردو ادب میں مفقود تھیں اب تک اُردو شاعری حُسن و عشق کی داستان تک محدود تھی اب مرثیہ نے محبت کی دنیا کو وسیع کر دیا نہ صرف عاشق و معشوق کے جذبات دکھائے بلکہ مختلف طرح کی محبت اور مختلف اشخاص کی محبت کا نقشہ بھی کھینچا باپ بیٹے کی محبت ماں بیٹی کی محبت، بھائی بھائی کی محبت، بہن بھائی کی اُلفت، چچا بھتیجے کی اُلفت، آقا و غلام کا اُس وفاداری پر شفقت، جانوروں کے جذبات غرضکہ متعدد مختلف افراد کی محبت کا خاکہ پیش کر دیا

مطرلگاری کے اعتبار سے بھی مرثیہ نے وہ جذبات الہام دیئے کہ اب تک اُردو شاعری کی کسی ایک صنف میں ایسی مثالیں نہ تھیں صبح کا منظر، شام کا منظر، دوپہر کی گرمی، دریا کی روانی، گھوڑوں کا دوڑنا، الف ہونا، فوجوں کا آپس میں ٹکرانا، تلواروں کا چلنا، پہلوانوں کا آپس میں تیغ آزمائی کرنا، غرضکہ اس قسم کے صدہا منظر پیش کر کے اُردو کی وسعت کو مرثیہ نے بڑھا دیا مرثیہ کی یہ ہمہ گیری، ہمہ داری نہ عربی میں تھی نہ فارسی میں مجموعی لحاظ سے ہر ایک پر فروغ بھی اس سے پہلے اُردو میں جتنی علمی و ادبی چیزیں آئی تھیں وہ سب کی سب تقلیدی تھیں مرثیہ نے آکر اردو کو سر اُٹھانے کا موقع دیا اور ادبی دنیا کو دکھا دیا کہ ایک عمدہ موضوع اور تاریخی واقعہ بھی ادب کی جان بن سکتا ہے مرثیہ نے فنی اعتبار اور ادبی لحاظ سے وہ اہمیت حاصل کی کہ اُردو میں بالکل ایک چیز سمجھا جانے لگا اور ایسا معلوم ہوا کہ اس حسن و کمال کے ساتھ یہ صنف نہ عربی میں تھی نہ فارسی میں

میر انیس و مرزا دبیر نے اس فن کو معراجِ کمال پر پہنچا دیا۔ طرزِ بیان، مناسبات، زبان، شدتِ احساس سب اس خوبی سے ایک جا ہوئے کہ اس سے آگے بڑھنا ناممکن

سل کے لیے ماٹکس ہو گیا ان لوگوں کے بعد بھی لوگ مرثیہ کہتے رہے مگر نفسیاتی تحلیل و فنی خصوصیات پر کوئی اضافہ نہ ہو سکا

# دبیر

مرزا سلامت علی نام اور دبیر تخلص مرزا غلام حسین کے بیٹے تھے ۱۸۰۳ء میں دہلی میں پیدا ہوئے مگر باپ کے ساتھ بچپن ہی میں لکھنؤ چلے آئے اور یہاں آکر تحصیل علم میں مصروف ہوئے یہاں تک کہ علمی استعداد فاضلانہ حد تک پہنچ گئی

مرثیہ گوئی کا چسکا روزِ ازل سے لے کر آئے تھے متاعروں میں اکثر تذکرہ کیا کرتے تھے ذوقِ سخن میں جب تیزی ہوئی تو خود بھی طبع آزمائی کرنے لگے اور میر مظفر حسین ضمیر کے شاگرد ہو گئے یہاں تک نام پیدا کیا کہ اُستاد سے زیادہ شہرت ہو گئی مرثیہ کو ایسا خاص فن بنا دیا کہ اُستاد میر ضمیر نے فرسودہ مرثیہ گوئی میں چند عنوانات قائم کر کے چار چاند لگا دیئے تھے یعنی چہرہ آمد رجز لڑائی وغیرہ کو خاص طور پر الگ کر کے ایک مخصوص حصہ قرار دے دیا تھا لیکن صرف راستہ تیار ہوا تھا آرائش اور پختگی کا کام ہونہار شاگرد کے لیے چھوڑ دیا تھا

مرزا دبیر نے یہی نہیں کیا کہ اپنے اُستاد کی بنائی ہوئی عمارت کو قائم رکھا بلکہ بقول آزاد مرحوم جو کچھ اُستاد سے پایا اُسے بہت بلند اور روشن کر کے دکھایا اس شہرت کا سارا بلند ہوا دربار اودھ سے بھی سرپرستی کا ہاتھ اٹھا مرزا دبیر کے مراثی کم از کم ۳۵ ہزار مرثیے کہے ہوں گے رباعی، سلام، نوحے ان کے علاوہ ہیں مرزا صاحب کی خصوصیات میں ترکیب الفاظ، جدید تشبیہات، استعارے اور زورِ کلام داخل ہیں ان کا کلام علمی زبان اور مضمون آفرینی کا اعلیٰ نمونہ ہے عیوب سے مبرا ہے اور فنِ عروض کے

پرسادوں کا بہترین دلچسپ چیستاں ہے کیونکہ صانع بدائع سے مرصع ہے مرزا صاحب نے محرم ۱۸۷۵ء میں وفات پائی اور اپنے گھر ہی میں دفن ہوئے۔

مرزا دبیر کے واقعات کربلا کی تفصیلات پر اسا رور دیا ہے کہ استعمار کی خوبی بہت کم ہو گئی ہے لوری پوری روایتوں اور حدیثوں کو سادہ قرار دے کر مرثیوں کو اتنا طول دے دیا ہے کہ شاعرانہ لطافت روحی کا دس کو بلند ہونے کا پورا موقع نہیں ملتا زبان و بیان کے لحاظ سے مرزا دبیر کے کلام میں بہ نسبت میر انیس کے کلام کے یکساں دشواری بھی کم ہے مرزا دبیر کے یہاں آپ کو اس زمانہ کے مذاق کے مطابق رعایت لفظی و مبالغہ بھی ضرور طریقہ پر ملتا رہے گا لیکن عالمانہ اندازِ داستان اور رنگ سے ان کا کلام کہیں خالی نہ ملے گا

# انیس

میر مستحسن علی نام اور انیس تخلص مرثیہ گو کے صاحبزادے تھے ۱۸۰۲ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے لیکن جب آصف الدولہ نے لکھنؤ بسایا تو میر انیس بھی یہیں آ گئے انیس کا خاندان سالہا سال سے زبان کی خدمت کر رہا تھا کسی نسل سے باقری سید یہ سلسلہ جاری تھی ان کے گھرانے کی زبان اردوئے معلیٰ کے لحاظ سے تمام زبان میں مستند سمجھی جاتی تھی۔

ابتدائی تعلیم مولوی حیدر علی صاحب سے حاصل کی شاعری میں باپ سے اصلاح لیتے رہے ان کے باپ میر خلیق مرثیہ گوئی میں میر ضمیر کے ہم پلہ تھے میر انیس نے باپ کے قدم پر قدم رکھا اور باپ کے زمانہ ہی میں کافی شہرت حاصل کر لی جب میر ضمیر اور میر خلیق نے زبان جاری ہوا تو مرزا دبیر اور انیس نے اس کی جگہ لی اور دونوں حضرات میں معرکہ آرائی شروع ہو گئی لیکن بجائے کسی حریف کے کلام میں ترقی ہوتی چلی گئی

انیس کو زبان پر وہ قدرت حاصل ہے جو خالق کو مخلوق پر۔ جن الفاظ سے جس موقع پر جو کام لینا چاہتے ہیں وہ جادوئی اطاعت کے ساتھ حکم بجا لاتے ہیں

مرثیے پڑھیے تو سب عورت، مرد، آقا، خادم، دوست، دشمن سب ہی کا کارنامہ نظر آتا ہے۔ انیس کا کمال ہے کہ ہر ایک کے جذبات کو حفظِ مراتب کے لحاظ سے اس طرح نظم کرتے ہیں کہ ان کے کردار کی پوری تصویر نمایاں ہو جاتی ہے۔ مناظرِ قدرت کے بیان کرنے میں انیس کو یدِ طولیٰ ہے۔ دریا، جنگل، شام، دوپہر، دوپہر کا سماں الفاظ سے ایسا کھینچتے ہیں کہ مصور کا قلم بھی ایسی کیفیت اور نمونہ نہیں کر سکتا۔ عاری ہے۔ رزم کا واقعہ بیان کرتے ہیں تو تلواروں کا چلنا، تیروں کا چمکنا، گھوڑوں کا ہنہنانا اور حریفوں کے دست و بازو کی صفائیاں ہمارے نظروں کے سامنے اس طرح پھرتی ہیں کہ گویا ہم اس جنگ میں کھڑے ہو کر تماشا دیکھ رہے ہیں۔ غرض کہ جس مضمون کو لیا ہے اُسے ایسے سادگی سے کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہی ان کا خاص رنگ ہے

زبان کی لطافت، محاورات کی دلاویزی اور مضمون کی دلکشی کسی وقت پڑھنے والے کی طبیعت کو بوجھل نہیں ہونے دیتی۔ سیکڑوں بند کے مرثیے ہیں پڑھتے چلے جائیے مگر کیا مجال کہ ذرا بھی طبیعت اُکتائے۔ آزاد نے سچ لکھا ہے دونوں (انیس و دبیر) باکمالوں نے ثابت کر دیا کہ حقیقی اور تحقیقی شاعر وہی ہیں کہ ہر رنگ کے مضمون ہر قسم کے خیال ہر ایک حال کو ایسے الفاظ کی موزونی سے ایسا ظاہر کر دیں جیسے چاہیں رُلا دیں جیسے چاہیں ہنسا دیں جیسے چاہیں حیرت کی صورت بنا دیں۔

سادگی، فصاحت اور روانی مراثی کے یہاں قدم قدم پر نمایاں ہیں یہاں تک کہ کوئی دوسرا شاعر اس معاملہ میں مشکل سے ان کا شریک نظر آتا ہے۔ اونچے مضامین کو بھی انیس نے آسان لفظوں میں اس طرح بیان کر دیے ہیں کہ مضمون کی دقت مشکل سے محسوس ہوتی ہے۔ سادگی و سنجیدگی ان کے کلام کی جان ہیں۔ اعتدال سے سخت نفرت ہے۔ مکالمہ میں کوئی

شاعر انیس کا مقابلہ نہیں کر سکتا اگر ان کے تمام کلام پر نظر ڈالئے تو وہ قادر مکیں کے ساتھ احلاقِ حسنہ کا آئینہ معلوم ہوتا ہے

میر انیس کا کلام پانچ جلدوں میں نولکشور پریس سے شائع ہو چکا ہے لیکن اسلامی پریس نے بچپن جوانی اور بڑھاپے کے لحاظ سے کلام کو تین حصوں میں الگ کر کے شائع کیا ہے ہر دور میں تدریجی ترقی نظر آتی ہے میر انیس نے بہتر سال کی عمر پائی ۱۸۷۴ء میں عالم فانی سے عالم جاودانی کی طرف کوچ کیا

جب تک لکھنؤ آباد رہا زیادہ تر یہیں رہے لیکن غدر کے بعد جب لکھنؤ تاراج ہوا تو میر انیس اور مرزا دبیر کی زیارت کا موقع دوسرے شہروں کو بھی نصیب ہوا عظیم آباد بنارس حیدر آباد اور الہ آباد کو بھی ان کی زیارت اور کلام سننے کا موقع ملا

(۱۰)

# دورِ جدید

غدر کے ہنگامے کے بعد نہ صرف ہندوستان کی سیاسی و معاشرتی زندگی پر اثر پڑا بلکہ علمی و ادبی دنیا میں بھی انقلاب عظیم ہوا انگریزی ادب سے روشناس ہوتے ہی اس کے گوناگوں اصناف شاعری سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ڈراما مناظر اور مختلف عنوان کی کارآمد نظموں کی ابتدا ہوئی حالانکہ اُردو میں جن لوگوں نے اس راستہ کو دکھایا انھوں نے خود باقاعدہ کبھی انگریزی تعلیم حاصل نہ کی تھی لیکن صحبت کا اثر اور زبان کی محبت نے دلوں کو اُبھارا اور رفتہ رفتہ انھوں نے وہ رہنمائی کی کہ زمانہ کی آنکھیں کھل گئیں ایک وسیع میدان سامنے دیکھ کر ماہرانہ راستے اور فرسودہ حالات سے گھبرا کر اُردو کی دنیا نئی منزل کی طرف قدم اُٹھایا

ترکی اصلاح فورٹ ولیم کالج سے شروع ہو گئی تھی سرسید اور اُن کے ساتھیوں نے علمی مضامین اور اخلاقی بحثیں مدلل و مؤثر طریقے سے پیش کر کے ایک نیا راستہ کھول دیا تھا البتہ نظم کی ترقی کے لئے شاید زمانہ آزاد و حالی کا منتظر تھا آزاد نے پنجاب میں رہ کر ایک علمی انجمن قائم کی جس کا مقصد اُردو شاعری کی اصلاح اور ترقی تھا اس میں بجائے مصرع طرح کے عنوان نظم دیا جاتا تھا اسی انجمن میں حالی نے ایسی مشہور اور ہر دلعزیز نظمیں "برکھا رت" وغیرہ پڑھیں جو ایک بجلی کی طرح دور دور گئیں اور عام طور سے مقبول ہوئیں

حالی اور آزاد نے شاعری میں نئی روح پھونک دی یہیں سے اس دور کی پہلی حس کا عہد حاضر بھی ممسوس ہے شاعری میں ایک ایسا انقلاب آیا کہ اردو کا شاعر حس کی رسمی دنیا سے الگ ہو کر حقیقت پسندی کی طرف مائل ہوا یعنی مبالغہ سے گریز اور محبت کی تنگ دنیا سے باہر نکل کر کو رانہ جذبات نگاری کو ترک کرنے لگا کار آمد موضوع پر مختلف شکلوں میں نظمیں نمایاں ہونے لگیں رفتہ رفتہ سیاسی مضامین بھی اردو شاعری کے احاطہ میں آگئے اور عہد حاضر میں تو اس کثرت کے ساتھ معاشرتی و سیاسی پہلو پر نظمیں آنے لگی ہیں کہ دوسری چیزیں پس پشت رہ گئی ہیں حقیقت نگاری اس دور کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے۔

# آزاد

محمد حسین نام اور آزاد تخلص تھا ان کے والد کا نام محمد باقر تھا خاص دلی کے رہنے والے تھے سنہ ولادت ۱۸۳۲ء ہے مولوی محمد باقر اور ذوق سے ایسے مراسم تھے کہ عزیزوں سے بھی بڑھ کر تھے آزاد نے ہوش سنبھالا تو ان کے والد نے بیٹے کو ذوق کے سپرد کیا جس کے سایۂ عاطفت میں آزاد کی تعلیم و تربیت ہوئی

غدر کے ہنگامے میں آزاد نے وہ مصیبتیں پڑیں کہ دنیا نظروں میں سیاہ ہو گئی مولوی محمد باقر شہید ہوئے گھر لٹ گیا کچھ دنوں تک آزاد کس مپرسی کی حالت میں ادھر ادھر مارے مارے پھرے آخر میں لاہور پہنچے اور سررشتہ تعلیم میں پندرہ روپیہ ماہوار پر ملازم ہو گئے مگر قابلیت کے زور سے رفتہ رفتہ وہ شہرت حاصل کی کہ پنجاب گورنمنٹ کی نظروں میں ان کے سوا کوئی سماتا ہی نہ تھا گورنمنٹ نے ان سے نصاب پڑھوائے اور مختلف ریڈرس لکھوائیں بہت مقبول ہوئیں ایک مرتبہ علمی خدمات کے لئے کامل اور نجار الملک گورنمنٹ کی طرف سے خطاب دیئے گئے

آزاد کے کارنامے اردو ادب میں آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں انھوں

نے نہ صرف مختلف کارآمد نظمیں لکھ کر اُردو شاعری کو راہ راست پر لانے کی کوشش کی بلکہ نثر میں بھی ایسی تصنیفات ان یادگار چھوڑیں جو اس سے پہلے نظر نہ آتی تھیں رمزیہ افسانہ، اُردو ادب کی باقاعدہ تاریخ، علم اللسان یہ سب ان فارسی وغیرہ ایسے کارنامے ہیں جو اُردو میں اس سے پہلے نہیں دیکھے گئے آزاد کا انتقال ۱۹۱۰ء میں ہوا

## آزاد کی شاعری کی خصوصیات

آزاد چونکہ جدید اُردو شاعری کے بانی تھے اس لئے ان کے یہاں شاعری کی تمام خوبیاں نہیں پیدا ہو سکیں بعض جگہ تعقید بھی ہے جیسی بھی کم ہے علو تخیل کا بھی فقدان ہے لیکن نمونہ مسطر نگاری اور روزِ کلام کو جس طرح آزاد نے سنوارا ہے وہ قابل تعریف ہے لطیف اور نازک جذبات کو نہایت خوبی سے اُٹھائے ہیں ان کے کلام کا خاص جوہر جوش اور درد ہے استعارہ اور تشبیہ کی بہت سی چیز مطالب نہایت خوبی سے بیان کر جاتے ہیں

آزاد کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر عبدالقادر سروری رقمطراز ہیں "آزاد کی شاعری پژمردہ دلوں کو بہلا سکتی ہے دامن دل سے گرد اذکار کو دھو سکتی ہے لیکن حال کو عروج اور دہن کو قوت پرواز عطا نہیں کر سکتی شگفتگی، لطافت، ترنم اور نفیس تشبیہوں اور طول استعاروں کا استعمال آزاد کی شاعری کے اثر کا خاص راز ہے اس رنگ میں اُن کی شاعری سفر ہے" [1]

اسی لائق مصنف نے آزاد اور حالی کا جا بجا جو موازنہ کیا ہے اس کا احساس ہم کہیں کہیں یہ کرتے ہیں "حالی کے برخلاف آزاد کے سامنے کوئی تلقینی یا اخلاقی مقصد شعر لکھتے وقت موجود نہیں رہا تھا اس لئے ان کے کلام میں حالی کی نسبت زیادہ فطرت ہے" [2]

صفحہ ۵ پر لکھتے ہیں کہ "آزاد کے کلام میں جو جوش ہے وہ ہمارے جذبات کو حالی کے کلام سے زیادہ متاثر کرتا ہے"

---

[1] جدید اُردو شاعری از پروفیسر عبدالقادر سروری صفحہ ۱۰۳ [2] ایضاً

آزاد ایسی شاعری کو ذریعۂ اصلاح نہیں سمجھتے بیدل و صائب سے گریز کرتے ہیں اسی وجہ سے ان کا کلام خشک اور پھیکا نہیں ہوتا یا تو موضوع ان کو پسند آجاتا ہے اس پر طبع آزمائی کرکے لطف اندوز ہوتے ہیں

ان کی یادگار کئی ایک مثنویاں ہیں مسلسل مسدس صبح امید گنج شاعت وداع الصاف داد انصاف خواب امن وغیرہ ان سب میں خواب امن طرز بیان روانی اشعار وغیرہ کے لحاظ سے بہت بلند ہے۔

# حالی

الطاف حسین حالی ۱۸۳۷ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے جد و پدر کے سر پر سایۂ پدری اٹھ جانے کے بعد قدیم کی رسم تھی کہ پہلے قرآن پڑھائے جاتے چنانچہ ایسا ہی ہوا اس کے بعد فارسی و عربی کی تعلیم حاصل کی ۱۴ سال کے تھے کہ ان کے خلاف رسم شادی کر دی گئی مگر انھوں نے کسب علم کے مشغلے کو جاری رکھا علمی استعداد روز بروز ترقی کرتی رہی

دہلی میں آکر مرزا غالب کے شاگرد ہوئے مگر غالب کی صحبت سے زیادہ فیضیاب ہونے کا موقع نہیں ملا غدر کے ہنگامے نے کئی سال تک گھر سے باہر نکلنے کا موقع نہ دیا تین چار برس کے بعد نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سے فیض صحبت حاصل ہوا ان کی صحبت سے حالی کے خیالات پر بہت کچھ اثر پڑا شیفتہ مبالغہ سے گریز کرتے تھے سچی باتیں اور سیدھے سادے خیالات کو نظم کرنا ان کے نزدیک شاعر کا فرض اولیں تھا یہ باتیں ایسی تھیں جو حالی کی جدید شاعری کا پس منظر ہو گئیں

شیفتہ کے یہاں آٹھ برس رہ کر لاہور گئے وہاں گورنمنٹ بک ڈپو میں ایک جگہ ملی جہاں اردو میں ترجمہ کی ہوئی کتابوں کی تصحیح کا کام سپرد ہوا چونکہ اس کام میں انگریزی ادب سے

واقعیت کا موقع ملا اس وجہ سے حالی کی طبیعت پر مغربی حالات کا کافی اثر پڑا اُردو کی پستی دیکھ کر اس کی شاعری اور انشا پردازی کے نقائص پر اصلاح کے لئے کمر باندھی رفتہ رفتہ حالی کو بھی اُس انجمن میں ماریابی ہوئی جہاں آزاد نغمہ سنجی کر چکے تھے حالی نے بھی جدید طریقے پر عمل پیرا ہو کر چار مثنویاں اس مشاعرے میں پڑھیں پہلی برکھا رُت دوسری نشاطِ اُمید تیسری مسافرہ رحم و انصاف چوتھی حبِ وطن یہ مثنویاں بہت مقبول ہوئیں اس کے علاوہ بعد میں بھی کارآمد نظمیں لکھتے رہے ایک مسدس مدوجزرِ اسلام کے نام سے لکھا جس میں مسلمانوں کی ترقی اور تنزل کے اسباب دکھائے ہیں ۱۹۱۴ء میں آپ کا انتقال ہوا

اگرچہ جدید شاعری کی بنیاد آزاد کے ہاتھوں پڑی لیکن حالی کی جنبشِ قلم نے اس کو مستقل اور نمایاں شکل دے دی سب سے پہلی چیز جس پر نظر پڑتی ہے وہ اُن کی نظموں کی ضخامت اور بے عنوانوں کی کثرت ہے

حالی کا مجموعۂ کلام مادی الفکر میں دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے (۱) نظمیں (۲) غزلیں بے عنوانوں کے علاوہ ان کی نظموں میں سادگی، روانی، تسلسل اور ایک بڑی حد تک ہمواری، یکسانیت اور یک رنگی موجود ہے

منظر نگاری، واقعہ نگاری، سیرت نگاری، فلسفۂ اخلاق، فلسفۂ قومیت، اظہارِ شخصیت، وسعتِ نظر، بصارت پسندی، جذبۂ ہمدردی اور کہیں کہیں سادگی اور بے تکلف سرمستی کلام میں خاص دلکشی پیدا کر دیتی ہیں

حالی کے مجموعۂ کلام کو ایک ضخیم اور طولانی وعظ کہہ کر ٹالا نہیں جا سکتا ان کے یہاں درسِ عمل اور واقعیت و عرفانی کیفیات سے ہرگز محروم نہیں ہیں

حالی کی قدیم غزلوں میں سیفتہ کا انداز ملتا ہے جس میں عاشقانہ جذبات نہایت تیز اور پُر اثر ہیں سادگی کے ساتھ لطیف کنائے اور حسن و عشق کے رموز اس طرح آجاتے ہیں کہ پڑھنے والا ایک پُر کیف دیا گیرہ فضا میں پہنچ جاتا ہے اعتدال اختصار بے تکلفی، نرمی اور کہیں کہیں

سہل ممتنع ان غزلوں کی امتیازی خصوصیات ہیں جدید غزلوں میں حالی نے نئی مہم سر کرنی چاہی مگر شگفتگی و سلاست اور غزلوں کا فطری لب و لہجہ بہت کم قائم رکھ سکے۔ ان غزلوں کی حیثیت کے ادبی تحریر سے زیادہ نہ بڑھ سکی

# اسمٰعیل

اُن کا وطن میرٹھ ہے جہاں ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوئے ابھی دنیا کو بہت کم دیکھا تھا کہ ملازمت کا بار سر پر پڑ گیا سولہ سال کی عمر تھی جب سررشتہ تعلیم میں ملازم ہوئے پہلے دفتر میں کچھ دن تک کام کرتے رہے لیکن علمی قابلیت نے بہت جلد ترقی کے میدان میں کھڑا کر دیا یہاں تک کہ فارسی کے ہیڈ مولوی مقرر ہو گئے۔ سہارن پور و میرٹھ میں عرصہ تک اسی خدمت کو انجام دیتے رہے ۱۸۸۸ء میں سنٹرل ماڈل اسکول آگرہ گئے اس وقت سے برابر یہیں قیام رہا ۱۸۹۹ء میں پنشن لی اپنے وطن میں آکر بقیہ عمر تالیف و تصنیف میں ختم کر دی ۱۹۱۷ء میں اس جہانِ فانی سے رحلت کی

مولوی اسمٰعیل کا سب سے بڑا کارنامہ ان کی وہ اُردو ریڈرس ہیں جو بچوں کے لئے انھوں نے لکھی تھیں یہ کتابیں کچھ ایسے انداز اور مزاج شناسی کے ساتھ لکھی گئیں کہ بہت عرصے تک کورس میں داخل رہیں اگر اُن کی پانچویں ریڈر تک کوئی شخص توجہ کے ساتھ پڑھ لیتا تو اس کو اچھی خاصی اُردو آجاتی۔ مولوی اسمٰعیل کو سررشتہ تعلیم میں رہ کر بچوں کے دل و دماغ سے آشنا ہونے کا بہت اچھا موقع ملا تھا جس سے انھوں نے فائدہ اٹھایا اگر دوسروں کو نصیب نہیں اور حقیقت یہ ہے کہ انھیں کتابوں کی بدولت ان کو اُردو دنیائے شاعری کی حیثیت سے بھی جانا بچوں کے لئے چھوٹی چھوٹی نظمیں لکھ کر انھوں نے کچھ اس انداز سے نغمہ سرائی کی کہ پیرانِ کہن سال کی بھی نظریں پڑنے لگیں پڑھنے والے اور پڑھانے والے دونوں کم و بیش یکساں متاثر ہونے لگے

اسمٰعیل کا کلام دو حصوں میں تقسیم ہو سکتا ہے ایک تو وہ حصہ جو بچوں کے لئے ہے اور دوسرا وہ جس میں نظمیں ہیں اور دوسرا حصہ وہ جس میں عاشقانہ و صوفیانہ مضامین ہیں بچوں کی نفسیات کا مطالعہ اسمٰعیل نے بہ نظر غائر کیا تھا ان کے بیان کا صحیح اندازہ تھا چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑے بڑے نتائج پیدا کرنا مولوی اسمٰعیل کا خاص کارنامہ ہے ایسی نظموں میں روانی، لطافت اور ان کی سادگی خاص طور پر پائی جاتی ہے بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے موضوع کو شعر کے جامہ میں اس طرح پیش کرتے ہیں کہ دل و دماغ دونوں متاثر ہوتے ہیں ہر قدم پر ایک اُمنگ ایک اُبھار اور ایک خاص کیفیت محسوس ہوتی ہے

مسطر نگاری میں بھی اسمٰعیل کو خاص ملکہ ہے وہ تفصیلات میں تو زیادہ نہیں جاتے مگر جو معمولی کیفیت کو ہمیشہ مدنظر رکھتے ہیں تشبیہات ایسی پُرلطف لاتے ہیں کہ ایک تازگی محسوس ہوتی ہے، اور طرزیاں کی خوبی سے مسطر کی دلاویزی نہایت پُرکیف و بااثر ہو جاتی ہے۔

اسمٰعیل کی وہ نظموں کا، جہاں زیادہ تر اصلاحی ہے اتحاد و اتفاق کی تعلیم کے علاوہ کام کرنے اور ایک مار رہنے کی تلقین زیادہ ہے اس مقصد کو کامیاب بنانے کے لئے کبھی کبھی وہ عہد ماضی کا عروج اور عہد حاضر کی پستی کا موازنہ کر کے عبرت دلانے کی کوشش کرتے ہیں کبھی کبھی اکبر کی طرح انگریزی فیشن سے گریز پر بھی زور دیتے ہیں اور سماجی کمزوریوں کی طرف پر اثر انداز میں اشارے کرتے ہیں وہ اپنا اصلاحی مقصد قصائد و عمرہ میں بھی نہیں بھولتے کبھی کبھی کارآمد نصیحت اس میدان میں بھی کر جاتے ہیں غزلوں میں وہ زیادہ تر تصوف کے مسائل نظم کرتے ہیں عشقیہ مضامین بھی پُرزور انداز میں بیان کرتے ہیں مگر شوخی اور تاثر کی کمی محسوس ہوتی ہے لب و لہجہ کے لحاظ سے غزلیات میں غالب کا اثر نمایاں ہے ان کی غزلوں پر غزلیں بھی اسمٰعیل نے لکھی ہیں یوں بھی کلام سے غالب کی تقلید نمایاں ہے وہ غالب کو اپنا استاد بھی مانتے تھے مگر اُن کی سوانح عمری سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ شاعری کے لئے وہ کسی استاد کی خدمت میں حاضر ہوتے یا نہیں

مولوی اسمٰعیل کو انگریزی نظموں کے ترجمہ کرنے کا خاص ملکہ تھا جہاں کہیں انھوں نے نظم کا ترجمہ نظم میں کیا ہے وہاں محاورہ اور سلاست کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا ان کا عام انداز بیان نہایت سیدھا سادہ ہے ہندی الفاظ مثلاً کھیت، سکھ، ملیامیٹ دلدر وغیرہ کے استعمال میں تکلف نہیں کرتے

ان کے کلیات میں مختلف اصناف شاعری نظر آتے ہیں، غزل، رباعی، قصیدہ کے علاوہ سلام و مرثیہ پر بھی طبع آزمائی کی ہے مولوی اسمٰعیل ہر حال میں بچوں کا خیال رکھتے ہیں ایک غزل کہی ہے جو موسیقی کی مشہور غزل "تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو" کے جواب میں ہے اس میں حالی ماری کی طرح بچوں کے لئے نعت کا مجموعہ اکٹھا کر دیا ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں

وہی کارواں وہی قافلہ تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی منزل اور وہی مرحلہ تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

متفاعلن متفاعلن متفاعلن متفاعلن

اسے دن کہتے ہیں سفر کا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہی شکر ہے جو سماں ہے وہ ملول ہے جو اُداس ہے
جسے شکوہ کہتے ہو ہے گلہ تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہی نفع ہے وہی کھوٹ ہے وہی طرب ہے وہی چوٹ ہے
وہی سود ہے وہی فائدہ تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہی ہے ندی وہی نہر ہے وہی موج ہے وہی لہر ہے
یہ حساب ہے وہی سلسلہ تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جسے بھید کہتے ہو راز ہے جسے ماجرا کہتے ہو سارے
جسے تاں کہتے ہو ہے وہ تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہی خمار ہے جو دل میں ہے وہی دوست ہے جو حلیل ہے
مدد نہیں کیا ہے تُرا بھلا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

# سرور

مستی[1] درگا سہائے سرور حکیم پیارے لال کے بیٹے تھے آپ کی ولادت دسمبر ۱۸۷۲ء میں جہاں آباد ضلع بیلی بھت میں ہوئی آپ کے بزرگ اس قصبہ کے قدیم رئیس و زمیندار تھے

سرور کی ابتدائی تعلیم جہاں آباد کے تحصیلی اسکول میں ہوئی وہیں سے انھوں نے اردو مڈل کا امتحان پاس کیا ابتدا ہی سے وہ اسی جماعت میں ذہانت کی وجہ سے ممتاز رہے اس امتحان کے پاس کرنے کے بعد آپ نے مولوی سید کرامت حسین بہار سے فارسی پڑھنا شروع کیا شعر و سخن کا شوق بھی اسی وقت سے پیدا ہوا لکھنے پڑھنے سے جس قدر وقت بچتا تھا شعر گوئی اور شعرا کا کلام دیکھنے میں صرف کرتے تھے آپ اصلاح بھی مولوی صاحب موصوف سے لیا کرتے تھے

عرصہ کے بعد سرور کو انگریزی پڑھنے کا شوق ہوا جہاں آباد میں اس کے لئے کوئی اسکول نہ تھا لہذا ایک پوسٹ ماسٹر سے انگریزی پڑھنا شروع کر دیا دو سال کے عرصے میں آپ نے انگریزی مڈل کا بھی امتحان پاس کر لیا شعر و شاعری کا مشغلہ جاری رہا ابتدا میں وحشت تخلص اختیار کیا لیکن پھر سرور ہو گئے

۱۸۹۹ء سے آپ کا کلام ادبی رسالوں میں شائع ہو کر مقبولِ عام ہونے لگا ادیب و سخن میں آپ کا کلام خاص طور سے جگہ پاتا رہا، سرور بہار ہت اُمنگ کے ساتھ اشعار میں ایسی خوش دلی کا ثبوت دے رہے تھے کہ دفعتاً ان کا اکلوتا بیٹا جس کی ماں ایک سال کا چھوڑ کر

---

[1] ماخوذ از حام سرور

مری بھی انتقال کر گیا اس حادثے سرور کی طبیعت میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا ہر وقت غم زدہ رہنے لگے اور غم غلط کرنے کے لئے مے نوشی اختیار کر لی حالانکہ کہنے یہی تھے کہ ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
ایک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیئے

لیکن آخر میں اس قدر پینے لگے تھے کہ کئی کئی روز تک مست و بیہوش رہتے تھے ۳ اپریل ۱۹۱۰ء کو سرور نے اپنا مجموعۂ کلام مرتب کرنے کی غرض سے الہ آباد کا سفر کیا ۲ جون کو آپ الہ آباد سے وطن آئے دوبارہ پھر اسی سلسلہ میں الہ آباد آرہے تھے کہ لکھنؤ بخار اور دردِ سینہ میں مبتلا ہو گئے اور دو ہی روز میں ۳ دسمبر ۱۹۱۰ء کو رحلت کر گئے

سرور بہت نیک طبیعت، حلیم اور راست باز تھے گفتگو کا انداز خاص تھا اس میں تبسم مزاحی ایک قسم کی سرپرستی پیدا کر دیتی تھی طبیعت میں ظرافت اور زندہ دلی بھری تھی "سدہ نوار" ان کا تکیہ کلام تھا شاعری کے اثر سے طبیعت میں وارفتگی پیدا ہو گئی اور تنہائی زیادہ پسند کرنے لگے

سرور کے یہاں نظموں کا دخل غزلیات کے مقابلہ میں زیادہ ہے آپ نے گوناگوں مسائل سے کلام میں ندرت و تنوع پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے ان کے یہاں اعلیٰ خصوصیت یہ بھی نظر آتی ہے کہ محض دیہات و شہر ہی کے درندہ جانور وغیرہ کو جذبات انگیزی کا ذریعہ نہیں سمجھا بلکہ ہندوستان کی بھی چیزیں دل کو سامان صد بہار خیال کر کے کلام میں نہایت نمایاں جگہ دی ہے مثلاً قمری و غلہ فراست لیکن دوسرے کے پہلو بہ پہلو ہندوستان کی کوئل طوطا ہنس سارس، مرغابی، گدھ، حمیا، دمدمی کو جگہ دی ہے گویا سودیشی پیداوار کو بدیسی مال کے پہلو بہ پہلو سجا دیا ہے

سرور کے پہلو میں ایک ایسا حساس دل تھا جو پھول وغیرہ میں بھی دبی سرائیں وحدانیت ڈھونڈھتا تھا جو انسان کے دل میں عموماً ہوتے ہیں سرور کی نگاہ نہایت وسیع ہے

رس لینے کی اہلیت اس درجہ ہے کہ غیر مادی اشیاء اور چھوٹے چھوٹے جانوروں کی زندگی سے سبق لے کر حقیقت کے موتی حاصل کرتے ہیں گویا مادی حیرتوں سے روحانی سرمل تک بالعموم پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں حاکم وطن سے محبت کے اظہار میں ایک ایک لفظ سے عقیدت و انس کا بہتا ہوا دریا نظر آتا ہے اور اسی سلسلہ میں اس قدر جوش آجاتا ہے کہ جن کو وطن سے محبت نہیں ان پر لعنت کے تیر برسا دیتے ہیں

سرور کا کلام نہ صرف مبالغہ سے پاک ہے بلکہ اس کی جگہ متانت لئے ہوئے ہے خیالی باتوں کی جگہ عموماً زندگی کے روزمرہ کے واقعات دلچسپ طریقے سے جگہ پاتے ہیں طرز بیان میں فارسی تراکیب سے تیزی و روانی پیدا کر دیتے ہیں الفاظ کے انتخاب میں عموماً بہت احتیاط سے کام لیتے ہیں جس کی وجہ سے شعر میں ایک ترنم اور ساتھ ہی ساتھ کیف بھی پیدا ہو جاتا ہے ان ہی سب باتوں کی وجہ سے وحدت کے حتمی مضمون میں دلکشی پیدا کر دیتے ہیں گھریلو زندگی کا بھی جب نقشہ کھینچتے ہیں تو تاثر بڑھ جاتا ہے جاتی تغزل کی جاتی دیکر نظموں کا لطف دوبالا کر دیتے ہیں

میر کی طرح سرور کے کلام میں غم و اندوہ اس کے دل کی پکار معلوم ہوتے ہیں سرور بہت سلیقہ کے ساتھ جذبات کو حالات سے ہم آہنگ کر دیتے ہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے اشعار محسوسات کا مرقع ہیں

## سورج نرائن مہر

مہر کی جدت یوں بھی داخل ہے کہ جب اردو کی فضا میں غزل کا نغمہ گونج رہا تھا مستقل نظموں کی طرف لوگوں کا التفات بہت کم تھا انھوں نے صرف یہی نہیں کیا کہ طبع زاد موضوع پر نظمیں لکھی ہوں بلکہ انگریزی کی نظموں کو شعر کا جامہ پہنا کر زبان میں حتی المقدور وسعت پیدا کرنے

کی کوشش کی لیکن یہ نظمیں زیادہ تر نظمی رنگ کی حیثیت رکھتی ہیں، چنانچہ "کلام مہر" کے دیباچہ میں خود رقم طراز ہیں کہ انگریزی نظموں کے ترجمے حاکسار نے ۱۸۹۲ء میں کئے تھے یہ نظمیں انگریزی نظموں کے تقریباً نظمی رنگ کے تھے اُن میں میرا کچھ نہیں ہے کہیں کہیں ضرورت دل ماخوذہ زمان کے لحاظ سے چھوٹی موٹی تبدیلی بے شک عمل میں آئی ہے ورنہ یوں سمجھئے کہ اُردو میں انگریزی نظمیں ہیں اُن میں ہر قسم کے مذاق کے نمونے شامل ہیں مزاح، سوز، تصور بیان، اخلاق، فلسفہ وغیرہ کئی عشقیہ کہانیاں بھی ہیں لیکن یہ عشق زبان اُردو کے عشق سے کچھ علیحدہ ہے

ان ترجموں کے علاوہ مہر نے اپنی طبیعت سے بھی اخلاق دیگر دیگر عنوانوں پر طبع آزمائی کر کے مختلف نظمیں کہی ہیں جس کا ذخیرہ کافی بڑا ہے ان نظموں میں دنیا سے بیزار ہو کر موت کا انتظار کرتے ہیں یہاں رہنے کے لئے نفس کشی کی زبردست تعلیم دیتے ہیں مہر کے کلام میں تصوف بھی کافی ہے راہِ سلوک کی اکثر باتیں اسی لکھی ہیں کہ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کے اقوال رسمی نہیں ہیں بلکہ ایک ایسے دل سے نکلے ہیں جو خود بھی سالک راہ تھا چنانچہ اس سلسلے میں مہر نے اکثر مستقل عنوانات پر طبع آزمائی کی ہے مثلاً رموزِ عشق، رموزِ عرفان، ترکِ جوئی ہمہ اوست، وصال وغیرہ

مہر عرصہ دراز تک محکمہ تعلیم میں ملازم رہے اس لئے انہوں نے "بچوں کے لئے نظمیں" بھی کہی ہیں مولوی اسمٰعیل کی طرح ان کو اُردو ادب سے ایسی چیزیں پیدا کرنے کے لئے اکثر ترغیب دیتے رہے ہیں یہاں زبان خاص طور سے رحم دل ہے بچوں کے لئے سبق آموز کارآمد موضوع پر قلم اٹھایا ہے لیکن اُن کا نہیں صرف بچوں تک محدود نہیں رہا بلکہ جوان اور بوڑھوں کی بھی دلچسپی کا سامان موجود ہے ایسے موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں جو دماغ پر اور سبق آموز ہیں مثلاً زمین کا مل تدریج حیاتِ انسانی کے لئے ناٹک، پیاگ، وغیرہ

مہر نے اُردو ادب کے اکثر اصناف شاعری پر طبع آزمائی کی ہے، قصیدہ، غزل، مسدس، مخمس، مثنوی، مستقل نظمیں، قطعات وغیرہ سب ہی ان کے مجموعہ میں شامل ہیں کلام ابتدائی

سے یک قلم پاک ہے سادگی و صفائی خوب ہے شعریت البتہ کہیں کہیں کم ہو جاتی ہے طرز بیان نہایت صاف ستھرا ہے کلام خلوص کا آئینہ ہے اور زبان و محاورات کا منتخب ذخیرہ

# نوبت رائے نظر

آپ لکھنؤ میں ۱۸۶۶ء میں پیدا ہوئے آپ کا خاندان نہایت معزز کا نتھ خاندان تھا جس کے اکثر افراد شاہی زمانے میں معزز عہدوں پر مامور تھے نظر کی تعلیم و تربیت زیادہ تر لکھنؤ ہی میں ہوئی علمی ذوق بچپن ہی سے تھا اس شعور کے پہنچتے ہی شعر گوئی کا بھی شوق ہوا آغا مظہر لکھنوی سے اصلاح سخن لینے لگے اور رفتہ رفتہ وہ مشق بہم پہنچائی کہ خود بھی استاد سمجھے جانے لگے

زندگی کا بیشتر حصہ علم و ادب کے لئے نظر نے وقف کر دیا تھا نثر و نظم دونوں میدانوں میں یوں فکر رواں رہتا اُردو کو ترقی دینے کے لئے مختلف رسالوں کی قابل قدر خدمات انجام دیتے رہے ۱۸۹۵ء میں لکھنؤ سے ایک رسالہ "خدنگ نظر" ماہانہ نکالنا شروع کیا یہ رسالہ دراصل اُردو عربیات کا ایک ماہانہ گلدستہ تھا اس وقت ملک میں اس قسم کے گلدستوں کے نکالنے کا عام رواج تھا نظر نے اس میں ایک اضافہ یہ کیا کہ مرکے مضامین بھی لکھنا شروع کر دیئے کچھ عرصہ تک یہ رسالہ نہایت کامیابی کے ساتھ نکلتا رہا مگر زیادہ دنوں تک زندہ نہ رہ سکا

۱۹۰۴ء میں نظر رسالہ زمانہ کے مدیر مقرر ہوئے ان کی خدمات کی وجہ سے زمانہ کی ابتدائی شہرت میں خاطر خواہ اضافہ ہوا جنوری ۱۹۱۰ء میں انڈین پریس الہ آباد سے اُردو کا مشہور رسالہ ادیب ٹری آف دکتاب کے ساتھ نکلا اس کی ایڈیٹری کے

---

ماخوذ از زمانہ جنوری ۲۴ء

لے جناب نظر منتخب کئے گئے اس رسالہ کو آپ نے اس حسن و خوبی کے ساتھ شائع کیا کہ دنیائے ادب میں ادیب کو تھوڑے ہی عرصہ میں ایک ممتاز جگہ نصیب ہو گئی۔ افسوس کہ چند وجوہ سے نظر کو ادیب سے علیحدگی اختیار کرنی پڑی اور ۱۹۱۲ء میں وہ پھر "زمانہ" کے دفتر میں چلے گئے اور وہاں تقریباً دو سال تک قیام رہا ۱۹۱۴ء میں نظر سلسلہ ملازمت لوکلٹوریریس لکھنؤ چلے گئے اور وہاں سے اودھ اخبار نکالتے رہے۔ اس اخبار سے ۱۹۲۳ء تک تعلق رہا۔ ۱۹۲۳ء میں بعارضہ صحق النفس آپ کا انتقال ہوا۔

نظر کی شہرت کا دارومدار نظموں سے زیادہ غزلیات سے وابستہ ہے۔ ان کی غزلوں میں سوز و گداز سے بھی خصوصیت ہے جو پڑھنے والے کو اپنی طرف فوراً متوجہ کر لیتی ہے۔ سدش کی جیتی محاوروں کی خوبی سے کلام کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے غزل کے استعار عموماً نہایت صاف اور سادے ہوتے ہیں معنویت اس خوبی سے عگر مانی ہے کہ تاثیر کے ساتھ معنی آفرینی نظر کی غزلیات کی ایک امتیازی شان ہوتی ہے کلام کی پختگی اور صفائی کے ساتھ ساتھ حدت طراری بھی ہے اس کی غزلوں میں الفاظ کا انتخاب نہایت پسندیدہ ہے فارسی و عربی کے ملائم و شیریں الفاظ و محاورات سے شعر کے حسن میں نہایت خوبی سے اضافہ کرتے ہیں

نظر نے مستقل نظموں پر بھی طبع آزمائی کی ہے مگر ان کا فطری ذوق غزلوں کی طرف معلوم ہوتا ہے زمانہ کی رفتار دیکھ کر انھوں نے بھی نیچرل اور دوسری نظموں کے لکھنے کے لئے قلم اٹھایا ہے مگر وہ خوبی نہیں پیدا ہو سکی جو غزل میں ہے اس کے یہ معنی نہیں کہ ان کی نظموں کا کوئی مرتبہ نہیں ہے اور ضرور ہے مگر غزل کے مقابلہ میں پست نظر آتی ہیں ہاں جہاں کہیں انھوں نے نظموں میں تغزل کی چاشنی پیدا کر دی ہے وہاں مایہ کافی ہو جاتی ہے نظمیں عموماً صفائی و سادگی کی سرمایہ دار ہیں، متانت و سنجیدگی ہر جگہ ہے۔ ان ہی وجوہ سے دلکشی بھی قائم رہتی ہے بعض اوقات منظر نگاری میں ان کا قلم مصور کے قلم کی طرح مختلف صورتوں کو نہایت حسن و خوبی سے تفصیل کے ساتھ نظروں کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔

# اکبر

سید اکبر حسین نام تھا اور اکبر تخلص۔ میر بندہ حسین کے بیٹے تھے اکبر کی ولادت کا فخر الہ آباد کو حاصل ہے ۱۶ نومبر ۱۸۴۶ء کو بمقام بارہ ضلع الہ آباد پیدا ہوئے جہاں ان کے چچا تحصیلدار تھے۔ اکبر ابتدائی تعلیم میں بھی اپنی ذہانت کی وجہ سے ہمیشہ اپنے درجوں میں ممتاز رہے ۱۸۶۶ء میں مختاری کا امتحان اول درجے میں پاس کیا کچھ دنوں کے بعد نائب تحصیلدار ہو گئے رفتہ رفتہ ترقی کر کے ہائی کورٹ کی وکالت پاس کر کے منصف ہو گئے آخر میں جج حقیقہ کے عہدہ پر مامور ہوئے بالآخر ۱۹۰۱ء میں پنشن لے کر علمی زندگی بسر کرنے لگے

اکبر کی ترقی اور شہرت کی اہمیت سرکاری خدمات کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کے نئے انداز بیان و طرز تخیل میں مضمر ہے اس کو شعر و شاعری کا ذوق بچپن ہی سے تھا وحید کو اپنا کلام دکھاتے تھے جو خواجہ آتش کے بیک واسطہ شاگرد تھے ابتدا میں اکبر بھی اسی رنگ میں شعر کہتے جو اس زمانہ کا خاصا تھا یعنی مقررہ مضامین کو سیدھے سادے الفاظ میں نظم کرتے تھے اس رنگ میں بھی جو کچھ اکبر نے کہا ہے وہ آسانی سے نظر انداز کرنے کے قابل نہیں جذبات کو یوں ادا کرتے ہیں جیسے کسی پر خود گزر رہی ہو، صفائی اور سادگی اس زمانہ میں بھی ہر جگہ نمایاں ہے۔

اکبر کی شہرت اس وقت سے ہوئی جب انھوں نے قدیم رنگ کو خیرباد کہہ کر اپنے لئے ایک نہایت کارآمد میدان تلاش کیا۔ بچپن سے اکبر کی طبیعت میں شوخی و ظرافت موجود تھی جب انھوں نے نئے میدان میں قدم رکھا تو یہی دونوں باتیں ان کے طائر کلام کے لیے پر و بال ثابت ہوئیں

ملک اور قوم کی حالت کو تباہ ہوتے دیکھ کر ان کا دل بھر آتا مگر آہ و فریاد سے

زمانہ کو چونکا یا مناسب نہ سمجھا کبھی چٹکیاں لے کر کبھی طنز آمیز باتیں کہہ کر دلوں کو اُبھارنے کی کوشش کی مغرب کی کورانہ تقلید دیکھ کر اہل مشرق کو طرح طرح سے سمجھائے ہیں کہ آنکھ بند کر کے یورپ کی ہر بات کو قبول نہ کرو بلکہ وہ جوہر پیدا کرو کہ جس سے تمہاری اور ملک کی حالت بہتر ہو۔ روزمرہ کی زندگی کی اصلاح چھوٹی چھوٹی نظموں میں اس طرح کرتے ہیں کہ فلسفی اور واعظ کی لمبی لمبی تقریریں و تحریریں ہیچ ہیں سیاسی معاملات کو بھی دور اندیشی کی عینک سے دیکھتے اور ایسے اشعار سے لوگوں کو نتائج کی خبر دیتے۔ اُن کی ظرافت اور بذلہ سنجی کسی نہ کسی تعلیمی مقصد کی طرف اشارہ کرتی ہے اور خوبی یہ ہے کہ ان کی نصیحت کبھی ناخوش گوار نہیں معلوم ہوتی ایسے طرز بیان سے وہ تلخ باتوں کو بھی شربت کا گھونٹ بنا دیتے ہیں

اس عہد کی شاعری ۴) اکبر نے تصنع اور بارک خیالی سے کبھی مشکل سے کام لیا ہوگا سامنے کے مضامین کو نئے الفاظ اور نئے ڈھنگ سے اس طرح پیش کیا ہے کہ سنتے ہی دلوں پر اُن کا جادو چل جاتا ہے ان کے مخصوص الفاظ کی فہرست پر نظر ڈالئے تو بظاہر مکروہ معلوم ہوں گے مگر جب اکبر اپنی طباعی اور دہانت سے اُن ہی الفاظ کو شعر کے جامے میں پیش کرتے ہیں تو ہزار معنویت کا سامان پیدا ہو جاتا ہے مثلاً ہومن کلوریج۔ اوسٹ ٹیو ریل گاڑی وغیرہ ایسے الفاظ ہیں جو سنگ اور معمولی نظر آتے ہیں مگر اکبر اُنھیں سے وہ کام لیتے ہیں کہ دقیق اور بھاری بھرکم فقروں سے بھی نہیں ہو سکتا اکبر کی شاعری کا مقصد زیادہ تر اصلاحِ قوم و ملک ہے جس میں وہ ہندو اور مسلمان سب ہی کو مخاطب کر لیتے ہیں۔ مگر زیادہ تر مسلمانوں کی طرف روئے سخن ہوتا ہے

اکبر نے انگریزی الفاظ کثرت سے استعمال کئے ہیں جن میں بیشتر نظر ثقیل اور ناقابل قبول ہیں مگر اکبر کے کلام میں یہی الفاظ نہایت نادرہ معلوم ہوتے ہیں افسوس کہ اس طرح پر ہنسا ہنسا کے کام لینے اور اصلاح کرنے والا ۱۹۲۱ء میں راہی ملکِ بقا

ہوا اکبر کا یہ کارنامہ وقتی ضرورتوں کے لحاظ سے وجود میں آیا جس میں اصلاحی مقصد تمام تر پیش نظر رہا ممکن ہے کہ ادب اکبر کو اس کارنامہ پر حساب جاوید عطا نہ کرے مگر اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ اپنے ماحول کی ترجمانی اور سماج کی درستی بھی شاعر کا ایک بڑا فریضہ ہے۔

اکبر کی وہ نظمیں جو کسی تبلیغی مقصد کے تحت میں نہیں کہی گئیں ہیں اُن کی اہمیت سے نہ ادب انکار کر سکتا ہے اور نہ کوئی بڑے سے بڑا شاعر ایسی نظمیں کہنا۔ اکبر میں بہت کم ہیں مگر جتنی بھی ہیں نہایت قابل قدر و لازوال محمد جلوۂ دربار دہلی، مانی کا بہاؤ، بزم کلیسا ہر ملہمانہ شاعر کے لئے باعثِ افتخار ہو سکتی ہیں

# شاد

شاد[1] کے والد سید عباس مرزا کی ولادت کا بھی فخر صلع الہ آباد ہی کو حاصل ہے چودہ پندرہ برس کی عمر میں وہ یہاں سے عظیم آباد چلے گئے جہاں شاد کی ولادت ۱۸۴۶ء میں ہوئی شاد کا خاندان عرصہ دراز سے اپنے کمال اور دستاہی خدمات کی وجہ سے مشہور و معروف رہا ہے شاد کی تعلیم کا سلسلہ چار برس کی عمر سے شروع ہو گیا تھا کئی ایک مولویوں سے ابتدائی کتابیں پڑھا ہیں لیکن ترتیب سر سید مرحوم کے ذمہ تھی جو اُردو زبان کے بہت بڑے محقق تھے ان ہی کی تربیت کا اثر تھا جس نے آتش چل کر شاد کی زبان کو اس درجہ فصیح و بلیغ کر دیا تھا کہ وہ اپنے وقت کے میر سمجھے گئے عربی فارسی کی کتابیں پڑھنے کے بعد ایک بزرگ کے اصرار سے انگریزی بھی شروع کر دی لیکن یہ سلسلہ دیر تک قائم نہ رہ سکا تھوڑے ہی عرصہ میں اس تعلیم سے دست بردار ہو جانا پڑا

---

[1] ماخوذ از گلشن حیات

شاد کے کلام پر اصلاح شروع میں دو شخصوں سے لی ناظر اور سر علی عرشی اور مولانا پیر بصدر حسین رحمی ادبیات دونوں شاعری کی اکثر کتابیں انھیں دونوں بزرگوں سے پڑھیں لیکن اس کی تکمیل شاہ اُلفت حسین فریاد سے کی جو خواجہ میر درد کے شاگرد تھے

شاد کی ہمہ گیر طبیعت نے اُن کو محض اسلامی علوم پر اکتفا نہ کرنے دیا بلکہ عیسائیوں کے عہد نامجات عتیق و جدید، پارسیوں کی ژند و پاژند اور ہندوؤں کی رامائن و گیتا وغیرہ کی سیر کا بھی موقع دیا

شاد نے اپنی کل عمر اُردو ادب کی خدمت میں گزاری کئی ایک تصنیفات یادگار ہیں ان کی علمی خدمات کا صلہ گورنمنٹ کی طرف سے بھی ملتا رہا۔ چنانچہ مولف گلشن حیات رقم طراز ہیں "کہ آپ کے کمالات و ریاضت اور ان علمی خدمات کے عوض میں جو آپ نے اپنی مستقل بہا تصانیف کے ذریعہ اپنے وطن کی کی ہیں گورنمنٹ نے آپ کو ۱۸۷۳ء میں "خان بہادر" کا خطاب عطا کیا سرکار سے ایک ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ ملتا رہا شاد نے ۱۸۷۳ء میں اس دنیا سے رحلت کی

شاد کے کلام کی سب سے نمایاں خوبی زبان کی صفائی و سادگی ہے بہایت شیریں و منتخب الفاظ استعمال کرتے ہیں جو اسقدر کو اثر تاثیر سادہ ہیں کہ فوراً دل و دماغ میں جگہ پیدا کر لیتے ہیں لطف یہ ہے کہ وہ عام فہم الفاظ میں وہ ادبی سے ادق مضامین بہایت کامیابی کے ساتھ نظم کر جاتے ہیں جو اُن کی اُستادی و کہنہ مشقی کا ثبوت ہے ان کے کلام میں اخلاق، فلسفہ اور توحید کا عنصر غالب ہے عموماً اندازِ بیان میرے بہت کچھ ملتا ہے محاورات اس خوبی سے لاتے ہیں کہ دل میں ایک آگ پیدا ہو جاتی ہے تصوف و زہد کی روحانی تعلیمات کے مطالعہ سے نہ صرف شاد کی مظہریت وسیع ہو گئی تھی بلکہ تمام کلام میں ایک ایسا کیف پیدا ہو گیا جو حس کو تڑپ کر خود کو ایک روحانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے

شاد نے بہت سے کہنہ مشقوں کی صحبت اٹھائی تھی جس کی وجہ سے کلام میں پختگی اور مصطلحی مدرسہ کا نظر آتی ہے میر انیس و مونس کی آنکھیں دیکھ چکے تھے لہذا کلام میں ان لوگوں کی زبان و بیان کا حاکہ پیش کرنے کی کوشش کرتے رہے اس اعتبار سے ان کا تعلق عہد قدیم سے بہت کچھ ہے

یوں تو شاد نے اردو کے اکثر اصناف شاعری پر طبع آزمائی کی ہے لیکن مرثیہ اور غزل کے میدان میں انھوں نے خاص جوہر دکھائے ہیں مرثیہ میں زبان و خیال وغیرہ کے اعتبار سے میر انیس کا تتبع کیا ہے، فصاحت سلاست مضمون آفرینی بلند پروازی کردار نگاری منظر نگاری شاد کے مرثیوں کی نمایاں خصوصیات ہیں

۱۹۳۸ء میں شاد کی غزلوں کا دیوان ان کے عزیز شاگرد حمید عظیم آبادی نے مرتب کر کے تحفۂ الہام کے نام سے شائع کیا ہے دیوان مرتب کرنے والے اگر عالمانہ طریقۂ انتخاب پر عمل کریں تو شاید نقصان میں نہ رہیں دیوان شاد میں یہ رویہ نہیں رکھا گیا مقصد یہ ہے کہ رطب و یابس سب کچھ ایک جگہ جمع ہو گیا ہے اور مجموعی حیثیت سے کلام اتنا پُر اثر نہیں ہو سکا جتنا انتخاب سے ہو جاتا

# نظم طباطبائی

ان کے والد کا نام میر مصطفےٰ حسین طباطبائی تھا سلسلۂ نسب حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جو حضرت امام حسین علیہ السلام کے شاید ٹر بوئے یا لوے ہوتے تھے ملتا ہے نظم ۱۶ محرم روز جمعہ ۱۲۶۹ھ کو بمقام حیدرگنج لکھنؤ پیدا ہوئے سولہ سال کی عمر تک آپ نے اپنے وطن میں رہ کر ملا طاہر نحوی سے عربی فارسی صرف و نحو کی تعلیم حاصل کی ان ہی ایام میں

---

ماخوذ از رسالہ اگست ۳۳ء

پنڈت دلال رائے سے علوم متداولہ اور فن سخن حاصل کرتے رہے۔

نظم اپنی خداداد ذہانت اور قابلیت کی وجہ سے شاہ اودھ کے شاہزادوں کی اتالیقی کے لیے منتخب کیے گئے شاہ رخ بیگ کر اُستادی شاگردی دونوں کا سلسلہ ایک ہی وقت میں قائم رکھا یعنی شاہزادوں کو تعلیم دیتے رہے اور خود علامہ قائمۃ الدین مرزا سمد علی مجتہد سے معقولات کا درس لیا کرتے تھے۔

جب واجد علی شاہ کا انتقال ہوا تو نظم نظام کالج حیدرآباد میں پروفیسر کی حیثیت سے طلب کیے گئے جہاں کچھ دنوں تک قائم مقام رہے لیکن سال بھر کے بعد مستعفی ہو گئے تقریباً تیس سال تک آپ طلبائے نظام کالج کو اپنے حقیقی علم و فضل سے سیراب کرتے رہے اس کے بعد آپ کو نظام سرکار سے جس خدمت کے صلہ میں وظیفہ مل گیا لیکن نظام نے قدر دانی فرمائی اور ولی عہد کی تعلیم کے لیے نظم کو مقرر فرمایا جنھوں نے یہ خدمت بھی کچھ اس حسن و خوبی سے انجام دی کہ سرکار نظام سے نواب حیدر یار جنگ کا خطاب عطا ہوا

جب عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام ہوا تو قدر دانوں نے نظم کو دارالترجمہ کی طرف کھینچا جہاں ناظر ادبی کی حیثیت سے آپ نے کام شروع کیا حتیٰ کہ ابھی اس محکمہ سے ترجمہ ہوئیں آپ اس کو شائع ہونے سے پہلے ایک بار ادبی نقطۂ نظر سے دیکھ لیا کرتے ۲۳ مئی ۱۹۳۳ء کو اس قابل قدر ہستی کی خدمات سے اُردو ادب ہمیشہ کے لئے محروم ہو گیا

طباطبائی کی ذات فضل و کمال کے لحاظ سے اس زمانہ میں عدیم المثال تھی باوجود اس کے کہ آپ پرانے لوگوں میں سے تھے مگر پھر بھی مغربی خیالات و افکار سے متاثر ہو کر جدید قسم کی نظموں میں آپ نے وہ نام پیدا کیا کہ گھر گھر شہرہ ہو گیا کچھ نظمیں تو ایسی ہو گئی ہیں جن کا جواب مشکل سے ہو سکتا ہے انگلستان کے مشہور شاعر "گرے" کی ایک نظم (گرے ایلیجی) کا ترجمہ "گورِ غریباں" کے نام سے اس خوبی سے کیا ہے کہ اُن کی شہرت میں چار چاند لگ گئے کسی زبان سے دوسری زبان میں نظم کا ترجمہ کرنا یوں بھی آسان کام نہیں جیسا جائے کہ

اُس کی تمام خوبیاں منتقل کرنا اسی نظم کے متعلق عبدالعظیم شرر نے لکھا ہے کہ "ایسی مقبول روزگار ایسی سرمایۂ ناز نظم جس کا ترجمہ ہمارے واجب التعظیم علامہ اور مستند زمانہ شاعر جناب مولوی علی حیدر صاحب نے کیا ہے مگر کس خوبی سے جس کا اظہار کرنا ہمارے اختیار سے باہر ہے، ایسی جانگداز اور موثر بطیں اور بحیل طور پر بھی اُردو میں کم کہی گئی ہیں نہ کہ ترجمہ اور پھر اس پابندی کے ساتھ کہ جس طرح پہلے مصرع کا قافیہ پیچھے مصرع سے اور دوسرے مصرع کا پہلے مصرع سے انگریزی میں ملتا ہے اسی طرح ہمارے مولانا نے بڑے لطف سے اسی طرح قافیہ بندی کو چھوڑ کے اُردو میں ملایا ہے"۔ اگر اصل انگریزی میں دیکھ کے اس ترجمہ کو ملاحظہ فرمایئے تو معلوم ہوتا ہے سوز و گداز کے علاوہ قدرتاً کا مطلب عرب حقیقت جملہ خوبیوں کے ساتھ گورِ غریباں میں جلوہ افروز ہیں اور اُردو کا دامن کہیں ہاتھ سے نہیں جانے پایا محاورات اندازِ بیاں مصرعوں کی ساخت ترتیب غرضکہ پورا ماحول اُردو کا ہے

نظم نے مختلف موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں مثلاً مناظر قدرت، اخلاقیات، تاریخ وغیرہ اور ہر ایک میں خیال و حقیقت کے ساتھ شاعری کا مرقع پوری طرح قائم رکھا ہے گلاب کا پھول ایک مختصر سی نظم ہے مگر دنیا کی بے ثباتی اور انجام کا بہترین مرقع ہے۔ ساقی نامہ متشقیہ نے اپنے طرز بیان اور تاثیر کی وجہ سے کافی شہرت پائی۔ اس نظم میں روانی اور برجستگی کے علاوہ سراپا کی مدحت نہایت پُر اثر طریقہ پر کی گئی ہے

نظم کے کلام میں عام طور پر روانی اور بستہ الفاظ کی وجہ سے ترنم پیدا ہو جاتا ہے جو ہر کلام کے لئے باعثِ دلکشی ہو سکتا ہے جب کہ اس میں دوسری خوبیاں بھی موجود ہوں اس معرکہ میں وہ نظم جو شاہزادہ البرٹ کے ورود پر لکھی گئی ہے عالیانہ پر وقعت رکھتی ہے علاوہ اور خوبیوں کے مولانا اپنے کلام میں محاورات کے صرف سے ایک خاص دلکشی پیدا کر دیتے ہیں تشبیہات میں ندرت و شگفتگی کافی ہے بڑا کمال یہ ہے کہ ایک

بات کو سیکڑوں تشبیہوں کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور بے لطفی نہیں پیدا ہونے پاتی بلکہ رغبت بڑھتی جاتی ہے "طلوع آفتاب" یہ جو نظم لکھی وہ خاص طور سے اس بیان کی تائید کرتی ہے

نظم نے اُردو ادب میں نظموں کے ترجمہ کرنے والوں کی خاص رہنمائی کی نظموں کا ترجمہ کرکے یہ بتا دیا کہ اُردو میں کس طرح ترجمہ کرنا چاہیے محض لفظی ترجمہ کرنے کے اسالیب بیان محاورات اور ترکیبیں اُردو کی اس خوبی سے صرف کی ہیں کہ نظموں کا لطف دوبالا ہو گیا اور وہ اُردو کی دنیا میں اجنبی نہیں معلوم ہوتیں بلکہ اُسی کی چیز ہو گئیں

نظم نے قصیدوں کو ایک نئی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کیا اُن میں تاریخی عنصر کا اضافہ کیا ان کے قصیدوں سے علم و فضل کا بھی اندازہ ہوتا ہے وہ اسلامی جنگیں جو مسلمانوں میں ایک خاص اہمیت رکھتی تھیں اُن کے قصیدوں میں جگہ پاتی ہیں معرکہ آرائیوں کا ذکر اس وضاحت کے ساتھ ہوتا ہے کہ یہ صرف جنگ کا نقشہ ہی نظر ہوتا ہے ۔ بلکہ واقعات پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے اور لوگوں کی سیرت کا بھی پورا اندازہ ہو جاتا ہے

نظم کی عربی فارسی والی اساطیر اُردو شاعری میں بھی دکھائی جاتی ہے کبھی پورا شعر کبھی ایک مصرعہ فارسی یا عربی کا آجاتا ہے کہیں کہیں عربی و فارسی کے ادق و ثقیل الفاظ بھی اُردو کے اشعار میں مل جاتے ہیں جو خوش گوار نہیں معلوم ہوتے

نصیحت ہمیشہ تلخ ہوتی ہے مگر جہاں کہیں نظم نے ناصحانہ انداز سے قلم اُٹھایا ہے وہاں وہ انداز بیان اختیار کیا ہے کہ یہ صرف تلخی دور ہو جائے بلکہ اور دلکشی بھی پیدا ہو جائے

اُن کی حد لیہ طبیعت نے اُردو میں "ملیک درس" بھی کہا

نظم کے مرنے کے کچھ ہی دنوں بعد دیوان شائع ہوا اس دیوان میں زیادہ تر غزلیں ہیں تھوڑی سی رباعیاں اور کچھ تاریخیں ہیں مصنف نے خود اس مجموعہ کا خود دیباچہ کیا ہے اس کا یہاں لکھ دینا فائدے سے خالی نہ ہوگا لکھتے ہیں "یہ سب غزلیں شاعروں کی ہیں ۔

گلدستوں کی طرحوں میں یا بعض بعض احباب کی فرمائشی ردیفوں میں ہیں خود سے کبھی غزل نہیں کہتا ردیفیں پوری نہیں ہیں اور 'الف' بے کا پورا کرنا میں ہمیشہ سے فضول سمجھتا ہوں' غزل میں مقطع کا نہ ہونا میرے نزدیک یکساں ہے دیوان رسول سے مرتب ہو چکا تھا مگر چھپنے کا وقت اب آیا میری اُردو بھی فارسی سے کم نہیں ہے میں نے فارسی کی طرحوں میں جو غزلیں کہی تھیں وہ بھی اس مجموعہ میں شامل کر دیں ان غزلوں میں جا بجا معشوقانہ اداؤں کی تصویریں کھینچی ہوئی ہیں"

متانت و سنجیدگی کے ساتھ اشعار نظم کرنا اُن کا خاص حصہ ہے ان کا شمار عہدِ قدیم میں اگر کیا جائے تو بے جا نہیں مگر ان کی شاعری بالکل موجودہ زمانہ کی شاعری ہے مبالغہ سے بہت کم کام لیا ہے ابتذال کا کہیں نام بھی نہیں' محاورات و روزمرہ کا صرف بہت دلکش ہے اشعار کو دیکھ کر اکثر یہ خیال ہوتا ہے کہ سامنے کے مضمون کہے گئے ہیں

غزلوں میں عشق و جذبات کی کمی نمایاں ہے دورِ متوسط کے شعرا کی طرح اکثر غزلیں قافیہ پیمائی کے دوش میں شعر کہنے کا نمونہ ہیں سرد مہری کی کمی نے غزلوں میں تاثیر اُٹھ دی ہیں اشعار کی تعداد بھی غزلوں میں ضرورت سے زیادہ ہے جس کی وجہ سے کبھی کبھی ہدا ہو جاتی ہے دنیا کی بے ثباتی اور موت اُن کی غزلوں کی خاص خصوصیت ہے

نظم کا انتقال ۲۳ مئی ۱۹۳۳ء کو ہوا۔

(۱۱)

# دورِ حاضر

## عزیز

مرزا ہادی عزیز کے بزرگوار تیرا سے پہلے کشمیر آئے تھے شاہانِ اودھ کے دورِ حکومت میں کشمیر سے لکھنؤ آئے عزیز کی پیدائش لکھنؤ میں ہوئی علم و فضیلت اس خاندان میں موروثی تھی کئی پشتوں سے علمی خدمت انجام دی جا رہی تھی عزیز نے اپنے خاندان کی روایت کو قائم رکھتے ہوئے تحصیل علم میں بلیغ کوشش کی نتیجہ یہ تھا کہ اپنے عہد کے ممتاز صاحب علم سمجھے جاتے تھے۔

عزیز کی ولادت ۱۸۸۲ء میں ہوئی سات برس کا سن تھا کہ سایۂ پدری سر سے اٹھ گیا لیکن فطری شوق نے تحصیلِ علم سے منہ موڑنے نہ دیا اور کتب بینی کا مشغلہ آخر تک دونوں شوق کے ساتھ جاری رہا اساتذہ کے دوا دین اور مطالعۂ کتب نے ان کی شاعری میں اُستادانہ رنگ پیدا کر دیا فارسی و اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے فارسی میں حافظ عرفی نظیری کا رنگ مرغوب تھا اردو میں عام طور پر میر اور غالب کی تقلید کرتے تھے عزیز کا شمار اردو کے اُن چند شعرا میں ہے جنھوں نے دورِ جدید میں غزل کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کی

عزیز کے اشعار میں الفاظ اس خوبی سے نظم ہوتے ہیں کہ خود بخود ایک ترنم پیدا ہو جاتا ہے جس سے کلام کی دلکشی اور بڑھ جاتی ہے طرز ادا کی ندرت اور خیال آفرینی کا ہر قدم پر خیال رہتا ہے۔ اُن کے دل میں اتنا سوز و گداز ہے کہ عام طور سے عرفی واردات قلبیہ اور امور ذہنیہ کی سرمایہ دار ہو گئی ہیں زبان کے اعتبار سے کلام نہایت صاف اور سلیس ہے ایک اور خاص بات آپ کے کلام میں یہ نظر آتی ہے کہ تصنع سے پاک ہے آپ کے کلام پر عام طور سے یہ اعتراض ہوتا ہے کہ غزل میں اس قدر مرثیہ رونا اور ماتم کا عنصر نامناسب ہے کیونکہ طبیعت پراگندہ ہو جاتی ہے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ عزیز کبھی کبھی معنوی میں اتنے ڈوب جاتے ہیں کہ الفاظ ان کے خیالات کا پورا مفہوم نہیں ادا کرتے جس کی وجہ سے کلام میں نقص پیدا ہو جاتا ہے اور اشعار مبہم ہو جاتے ہیں لیکن اس کی مثال شاذ و نادر ہی ہو گی اُردو میں عزیز نے اکثر اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے قصیدہ میں ایک خاص امتیازی حیثیت پیدا کر لی ہے جو ہر طرح قابل داد ہے سکون الفاظ تسلسل معنویت، علو تخیل، ان کے ہر قصیدہ میں آپ کو خاص طور پر دکھائی دیں گے، نظمیں بھی خوب کہتے تھے جن میں سے بعض ایسی ہیں جو ہر متاعرہ کے لئے باعث افتخار ہو سکتی ہیں

گل کدہ (آپ کی غزلوں کا مجموعہ) اور قصائد عزیز آپ کی یادگار ہیں آپ کی وفات ۱۹۳۵ء میں ہوئی

# رواں

چودھری جگت موہن لال رواں ۱۴ فروری ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوئے۔ ۹ سال کے تھے کہ اُن کے والد چودھری گنگا پرشاد کا انتقال ہوا۔ اُن کی وفات کے بعد رواں

کے بڑے بھائی مالو کھیالال نے پرورش کی رواں بہت ذہین تھے جس سے پڑھنا شروع کیا امتحانوں میں برابر امتیاز کے ساتھ کامیاب ہوتے رہے ۱۹۱۳ء میں ایم اے پاس کیا اور ۱۹۱۶ء میں ایل ایل بی کرکے اناؤ میں وکالت شروع کی جلد ہی وہاں کے نامور وکیلوں میں شمار ہونے لگے شاعری کا لگاؤ بچپن ہی سے ساتھ رہا اور مرتے دم تک قائم رہا اُن کا انتقال اکتوبر ۱۹۳۴ء میں ہوا

رواں اسے کلام پر تحریر لکھنؤ سے اصلاح لیتے تھے جس کا اثر اُن کی غزلوں پر خاص طور سے نمایاں ہے رواں کے دیوان "روح رواں" میں غزل و قطعہ و رباعی کے علاوہ نظمیں بھی ہیں غزلوں میں رواں نے زبان کا خاص طور سے خیال رکھا ہے عامیانہ الفاظ و لہجہ سے اُن کو کوسوں دور رکھا ہے جس کی وجہ سے کلام میں تازگی اور بیان میں ندرت پیدا ہو گئی ہے اُن کے تمام کلام میں اور خاص کر غزلوں میں شستگی نہایت نمایاں طور پر نظر آتی ہے جو دلکشی اور تاثیر میں کافی اضافہ کر دیتی ہے ان کا رجحان بالعموم فلسفہ اور معنویت کی طرف ہے لیکن لطف یہ ہے کہ کلام میں خشکی نہیں آنے پائی اور چونکہ اثر لے کر کہتے ہیں اس لئے کلام میں درد و کیفیت کی وجہ سے ایک خاص مزہ پیدا ہو جاتا ہے

رواں کے کلام میں ایک روانی اور سخن کی ہر جگہ نمایاں ہے رواں اپنی نظموں میں غزل کی حاشیہ دے کر نہایت خوبی سے تاثیر کا اضافہ کر لیتے ہیں ان کی بعض نظمیں کردار کی بلندی کا نہایت عمدہ نمونہ ہیں صاف گوئی و صحیح کردار نگاری اُن کی نظموں کی دو نمایاں خصوصیات ہیں دارداب حسن و عشق کو جہاں کہیں بیان کرتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ خود اُن ہی کے دل پر کیفیتیں گزر رہی ہیں مناظر فطرت کے بیان میں خاص امور کو نہایت پُر اثر انداز و الفاظ میں نظم کرتے ہیں غیر مادی چیزوں پر طبع آزمائی کرتے وقت بلند مضامین لانے کی کوشش کرتے ہیں نظموں میں عام طور سے روانی و فارسی ترکیبیں ہیں لیکن کہیں کہیں ناہمواری بھی پیدا ہو گئی ہے۔

رواں نے رباعیات بہت کافی کہیں جن میں زندگی کے مختلف عنوانات پر دلچسپ طریقے سے طبع آزمائی کی ہے۔ ادق مضامین کو بھی نہایت سہل کر کے ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میدان میں بھی انھوں نے لطیف استعارے اور پسندیدہ تشبیہوں سے اپنے کلام کو دلچسپ بنانے کی کوشش کی ہے۔

# چکبست

ان کے بزرگوں کا وطن لکھنؤ ہے مگر بہ فیض آباد میں ۱۸۸۲ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیم و تربیت لکھنؤ میں حاصل کی اور ۱۹۰۵ء میں کیننگ کالج سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۰۸ء میں قانون کا امتحان پاس کر کے وکالت کے میدان میں قدم رکھا۔ اس پیشہ میں ایسی کامیابی حاصل کی کہ لکھنؤ کے ممتاز وکلاء میں شمار ہونے لگے۔

۱۹۲۶ء کی بارہ فروری کو ایک مقدمے کی پیروی کے لئے رائے بریلی گئے۔ سہ پہر تک بحث کی اور پھر واپس لکھنؤ آنے کے لئے اسٹیشن آئے۔ ریل میں بیٹھے تھے کہ بالچ گرانان بند ہو گئی اور کچھ گھنٹوں کے بعد اسٹیشن ہی پر انتقال ہو گیا۔ ۱۱ بجے رات کو آپ کی لاش موٹر پر رکھ کر لوگ لکھنؤ لائے۔ کاظم حسین محشر لکھنوی نے چکبست ہی کے ایک مصرعے سے تاریخ وفات کہی

اُن کے ہی مصرعے سے تاریخ ہے ہمراہ عزا
موت کیا ہے اسی احرا کا پریشاں ہونا

چکبست بچپن ہی سے شاعری کے دلدادہ تھے۔ اساتذہ اردو کے کلام کا بغور مطالعہ ان کی روحانی غذا تھی۔ اس سے اُن کے حافظہ پر صیقل کر دی تھی۔ آتش، عالب، اور انیس نے ایسی لاتعداد خوبیاں اُنھیں اپنا گرویدہ بنا لیا تھا جس کا اثر آج بھی اُن

کے کلام پر صاف نظر آرہا ہے۔ مسدس میں انیس کا اور غزل میں آتش کا انداز بیان ہر جگہ نمایاں ہے۔

چکبست کے یہاں فلسفیانہ خیالات بہت کم ہیں لیکن جو کچھ ہیں بہت خوب ہیں ایسے موقعوں پر وہ غالب کی تقلید کرتے ہیں لیکن ظلم ہوگا اگر اُن کی ذاتی وہبات و سحوری کی داد نہ دی جائے اور محض تقلید ہی تک اُن کی فکر و رسا کو محدود کر دیا جائے۔ غالب انیس اور آتش کے اندازِ بیان سے چکبست نے وہ کارِ نمایاں کیا جو اُن کے لئے ایک انفرادی مخصوص ہو گئی کیونکہ اُن ہی بزرگوں کے جمالِ کلام کے رنگ و بو سے انھوں نے سیاسی قومی تحریکوں اور اصلاحوں اور سانحوں کو متعدد شاہکار نظموں سے ایک نئی کیفیت عطا کر دی

چکبست کے یہاں حسن و عشق کے افسانے بہت کم ہیں اُن کی شاعری کا نام، مقصد وطن کو بیدار کرنا ہے چنانچہ غزلوں میں بھی اس بات کو مدِ نظر رکھتے ہیں، ان کو مغرب کی کورانہ تقلید سے گریز ہے مشرقی تہذیب و تمدن کا سرمایہ چھوڑنے بغیر وہ ترقی کے ساتھ میدانِ ترقی میں قدم رکھنا چاہتے ہیں جہاں کہیں وہ ناصحانہ انداز اختیار کرتے ہیں کلام میں بجائے تلخی کے ایک وارفتگی اور سرمستی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ چکبست کی شاعری کا ایک دوسرا دلفریب پہلو اُن مناظر میں نظر آتا ہے۔ جہاں وہ ہندوستان ہی کے واقعات اور قدیمی مناظر سے استعارات و تشبیہات پیدا کرتے ہیں چونکہ ان چیزوں سے ہماری طبیعتیں آشنا ہیں لہٰذا کلام میں ایک خاص لطف پیدا ہو جاتا ہے

چکبست نے اپنے احباب اور چاہنے والوں کے اکثر مرثیے کہے ہیں جن میں اپنے جذبات کا نہایت درد مند پیرائے میں اظہار کیا ہے۔ اس سلسلہ میں مردانِ قوم کا جہاں کہیں بیان ہے اس میں اُن کی سچی مسرت اور انفرادی حیثیت کو بہت خوبیوں سے نمایاں کیا ہے ایک اور خوبی اُن کے کلام میں بہت آسانی کے ساتھ نظر آتی ہے جو کسی اور شاعر

کے یہاں مشکل سے ملے گی۔ موجودہ زمانہ کے سیاسی اور قومی واقعات کو نہایت کامیابی اور شاعرانہ تاثیر کے ساتھ بیان کرنا چکبست کا خاص حصہ ہے جس میں وہ رسمی لفظ پروری نہیں کرتے بلکہ اپنی آزادی رائے کا ہر جگہ خیال رکھتے ہیں افسوس ہے کہ جس پیمانے پر یہ خوبیاں چکبست کے یہاں پائی جاتی ہیں اُتنی گہرائی اُن کے کلام میں نظر نہیں آتی لیکن بایں ہمہ مجموعی حیثیت سے زمانے نے اُن کی کافی قدر دانی کی اور آج اُن کی جگہ اُردو شعراء کے زمرہ اول میں نظر آتی ہے ہمارا ادب چکبست کے اس کارنامہ کو نہیں بھلا سکتا کہ اُنھوں نے اپنے دور کے سیاسی حالات و خیالات کو اُردو شاعری میں بڑی خوبی کے ساتھ جگہ دی انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہونے کے لئے جب سیاسی رہنما جدوجہد کر رہے تھے تو چکبست نے آگے بڑھ کر اپنی شاعری سے اس کو ہر دل عزیز بنا دیا

# اقبال

آپ کی ولادت ۱۸۷۷ء میں بمقام سیالکوٹ ہوئی ابتداء میں عام بچوں کی طرح ایک مکتب میں پڑھنا شروع کیا پھر مدرسہ میں داخل ہوئے رفتہ رفتہ انگریزی اسکول کی باری آئی تو انٹرنس کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کر لیا اسکاچ مشن کالج سالکوٹ سے ایف اے کا امتحان پاس کیا بی اے کی تعلیم کے لئے لاہور آئے ڈگری حاصل کرنے کے بعد حیدرآباد کے لئے اورینٹل کالج لاہور اور بعد میں گورنمنٹ کالج کے پروفیسر ہو گئے ۱۹۰۵ء میں تکمیل علم کے لئے انگلستان گئے۔ اقبال کو فلسفہ سے خاص شغف تھا ولایت جاکر اس شوق میں اور ترقی ہوئی یہاں تک کہ فلسفہ کے ڈاکٹر ہو گئے اور ساتھ ہی ساتھ بیرسٹری کا امتحان پاس کر کے ۱۹۱۰ء میں ہندوستان واپس آئے

اقبال کو شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا ابتدائی زمانہ تعلیم ہی سے طبع آزمائی

کرتے تھے اس زمانہ میں واقع کی شاعری کا تمام ہندوستان میں چرچا تھا اقبال نے بھی
بذریعہ خط و کتابت ان سے اصلاح لینی شروع کی جس کا اثر اقبال کی زبان پر خاطر خواہ پڑا
معانی و سیاست کا فن غالباً واقع ہی کی اصلاح کا نتیجہ ہے اقبال کی حد سے بڑھی
طبیعت کے لئے مشکل تھا کہ واقع کے محدود دائرے میں مقید رہتی۔ ان کی فکر کو بلندی
و وسعت کی ضرورت تھی جس کا سامان بحر عالمیت کے کسی کے یہاں نہ تھا وسیع تھا جس کو وہ
بے عالمیت کی تعلیم میں کہنا شروع کیا۔

غالب رہو ہے وہ شہر ہم جہاں کہ علی طبقہ اقبال کا اچھے الفاظ میں
ذکر کرنے لگا اسلام کی قومی شاعری کی ابتدا اعجاز "تمام اسلام سے ہوتی ہے جہاں
دوستوں کے اصرار سے اُن کو مختلف بطنوں کے ٹرسٹ [illegible] "مالیہ" "فریاد
"شکوہ" وغیرہ اعجاز کی یادگار ہیں ان چھوٹی چھوٹی نظموں نے لوگوں کے دل میں
بڑی جگہ پیدا کر دی ہم نے اقبال کو اور اقبال نے ہم کو پہچانا۔ اسلام کی گرتی ہوئی
حالت سنبھالنے کے لئے لوگوں کی نظر انتخاب اس ہو [illegible] بڑی حد تک دور [illegible]
نے اپنی شاعری کو آب سحر کیا اسکر مسلمانوں کی معاشرتی اور اخلاقی [illegible]
بیتی کیا ان کے سحر نے [illegible] میں مایوسی اور شکست کے [illegible] فراخ اور [illegible]
جس کو وہ مسلمانوں کے ہر رگ و پے میں پہنچانا چاہتے تھے [illegible]
[illegible] والوں کو وہ [illegible] شخصیت کے [illegible]
میں دوسری خاص بات یہ ہے کہ وہ ہندوستان کو یورپ [illegible] سے بچا کر
مادہ پرستی کے بجائے خدا پرستی کی طرف لے جانا چاہتے ہیں

[illegible] کے ساتھ [illegible] اس [illegible] نام [illegible] ہے
کہ دور حاضر میں کل سے کسی شاعر کو یہ فخر حاصل [illegible] ان کا کلام [illegible] وسیع [illegible]
[illegible] اور [illegible]

پہلے تک ہی دو ر رہی بلکہ گورنمنٹ نے بھی علم دوست ہونے کا ثبوت دیا اور اقبال کو معزز خطاب "سر" سے سرفراز کیا

اس عرصے سے ڈاکٹر اقبال کی صحت بہت خراب رہنے لگی تھی، اپریل ۱۹۳۸ء میں ایک طویل علالت کے بعد اردو کے اس عظیم شاعر کی زبان ہمیشہ کے لئے بند ہو گئی۔ ان کی موت سے ملک کو کئی حیثیتوں سے نقصان پہنچا، لیکن انھوں نے اپنا گہرا نقش چھوڑا ہے کہ موجودہ نسل کے بہت سے شاعر اور ادیب انھیں کو یہاں سے اپنی تسلی دوست کرتے ہیں

اقبال اردو کے ان شعراء میں ہیں جو مغربی خیالات سے متاثر ہو کر اردو میں کامیابی کے ساتھ مضمون کو جگہ دیتے ہیں اور فلسفیانہ تخیل سے مضمون کو بہت زیادہ سادہ ہیں اپنے عمیق مشاہدے سے مشاہدہ روز مرہ چاند تارے وغیرہ کو اس طرح مخاطب کرتے ہیں کہ گویا وہ بھی انسان ہیں اس طرح اردو شاعری کو ایک نیا مذاق دے دیا ہے

اقبال نے اردو شاعری میں صرف خیالات کا اضافہ کیا بلکہ نئی اور نئی تشبیہوں سے بھی تمام اردو کو سنوارنے کی کوشش کی ہے۔ فارسی کی ترکیبوں سے کلام میں زور پیدا کرتے ہیں کبھی کبھی الفاظ لفظ ہو جاتے ہیں جس سے ان کی شاعری ہو جاتی ہے لیکن بہت زیادہ پُر لطف ہو جاتی ہے۔ مطلب کا ہی ان کا قلم کسی اچھے مصور کے قلم سے کم نہیں ہے جو مطلب لکھتے ہیں بہت دلکش اور موثر ہوتا ہے اقبال کے اشعار میں الفاظ کی ترتیب اس خوبی سے ہوتی ہے کہ ایک نیا مزہ پیدا ہو جاتا ہے ان کا انداز بیان فلسفیانہ ہے یہاں تک کہ جزئی تھوڑی باتوں کو بھی وہ چیزوں کی حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس سے رموز جاودانی کا کوئی خاص معنی بیان کر جاتے ہیں

اقبال عورت کو وہ مقام دیتے ہیں جو اقبال کی شاعری میں بڑی اہمیت رکھتی ہے "بانگ درا" اور "بال جبریل" کے مضامین اور انداز بیان کے لحاظ

سے بڑا فرق ہے بلکہ تخیل اور تصور کے لحاظ سے بھی بالِ جبریل، ضربِ کلیم اور ارمغانِ حجاز میں اقبال کا اختصار، تمہید کی کمی اور خیال کی گہرائی ہمیں بغیر متوجہ کئے نہیں رہ سکتی وہ اقبال جنھوں نے ہمیں بانگِ درا میں رنگینیوں میں غرق کر دیا تھا آہستہ آہستہ تلوار کی تیزی بستر میں بھرنے لگے اس اختصار نے ان کے فکر کی دنیا بھی کسی قدر محدود کر دی، ادھر اُس کے انتقال کے بعد سے اُن پر نہ جانے کتنی کتابیں لکھی ہیں، نہ جانے کتنے رسالوں نے اقبال نمبر شائع کئے ہیں لیکن اُن کے دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے پوری طرح تنقید نگاری کے فرائض انجام نہیں دیئے ہیں بلکہ اقبال کی عظمت کا احساس سے اوپر طاری کر لینے کے بعد انھیں سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کہیں کہیں ایک دو مضمون ایسے بھی دیکھنے میں آئے جو دوسری جانب اشارہ ہیں اُن کے متعلق متوازن رائے قائم کی جائے گی

# حسرت موہانی

نام یہ فضل الحسن ہے اور حسرت تخلص لیکن تخلص اتنا مشہور ہو گیا ہے کہ بہت کم لوگ اصل نام سے واقف ہیں چنانچہ اک شعر خود فرماتے ہیں کہ

حسرت کہا سنا ہے حسرت مجھے
کوئی بھی کہتا نہیں فضل الحسن

یہ صاحب اصل قصبہ موہان کے رہنے والے تھے جو ۱۸۷۵ء میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی لیکن علم و ادب کی آخری منزل کے لئے علی گڑھ میں پیدا کر اور اس سے بی اے کا امتحان پاس کیا اُن کی دلی تمنا تھی کہ ڈپٹی کلکٹری ملے اور سرکار کی نوکری کچھ عرصہ تک اس کی تحصیل میں علمی و ادبی خدمات کی طرف رہا۔

مگر جب سے سیاسی معاملات میں دلچسپی لینے لگے ہیں اُس وقت سے پوری توجہ کے ساتھ یکسو ہو کر علمی حیثیت نہیں کر سکے مگر پھر بھی غزل گوئی میں آپ کا مرتبہ نہایت بلند و امتیازی ہے اور اس میں شک نہیں کہ اُردو کی موجودہ غزل کو نکھارنے اور سُدھارنے میں حسرت نے بڑا کام کیا ہے۔ یعنی کو دور کر کے تغزل کو تبرکرا ان کا خاص کارنامہ ہے۔

حسرت لکھنؤ کے مشہور شاعر تسلیم کے شاگرد تھے جن کو نسیم دہلوی سے تلمذ تھا اور وہ مومن کے خاص شاگرد تھے حسرت کو قدیم اُستادوں کے کلام سے فطری شغف تھا جیسا کہ دہلی کی تقلید کا اثر ان کی طبیعت میں کئی لحاظ سے نمایاں ہے۔ سانی ریختہ، تیغ و پردار، انگلی و مسل وغیرہ اُن کے خاص موضوع کلام ہیں کبھی کبھی پرانے لوگوں کی تقلید میں مسلسل غزلیں بھی کہتے تھے۔ قریب قریب ہر ردیف پر الف سے لے کر ی تک طبع آزمائی کی ہے خواہ ایک ردیف میں ایک ہی غزل کیوں نہ ہو۔ اسی طرح بعض بعض پرانے الفاظ بھی روا رکھے ہیں جو اب متروک ہیں مثلاً "وعید" "آں پیچے" "ماسے" لیکن اسی کے ساتھ ساتھ کلام الحاد اور بیکار باتوں سے پاک ہے۔ صداقت تیزی خاص طور پر اُن کے یہاں قریب قریب ہر جگہ موجود ہیں۔

استدلال اور تکرار سے حسرت نے اپنے کلام میں بہت کم کام لیا۔ اشعار میں درد و اثر کے ساتھ ساتھ گیرائی خیال کا زیادہ لحاظ رکھا ہے۔ ان کا کلام نہ تو سراپا یاس و نامرادی کا مرقع ہے اور نہ عیش و نشاط کی محفل اگر آپ کو اُن کے اشعار میں دکھ درد کا وجود ملے گا تو مسرت و شگفتگی بھی جا بجا نظر پڑے گی جس کی وجہ سے طبیعت اکتا نہیں سکتی۔ وسعت کے لحاظ سے حسرت زاہد خشک نہیں اُن کے کلام میں رنگینی ہے لیکن یہ کہیں تو حد مناسب کے حاشیہ سے باہر ہو گئی ہے۔

حسرت کو زبان کے انتخاب کا خاص ملکہ ہے جس کی وجہ سے ان کے کلام میں روانی اور تسلسل پیدا ہو جاتا ہے، زبان چال کا بھی کافی لحاظ رہتا ہے۔ الفاظ کے

اصحاب میں کمی وہ بہت احتیاط سے کام لیتے ہیں عام طور سے ملائم اور عام فہم لفظوں کو اپنے کلام میں جگہ دیتے ہیں ہاں یہ ضرور ہے کہ کبھی کبھی فارسی کی ایسی ترکیبیں بھی لاتے ہیں جو بعض لوگوں کے نزدیک پسندیدہ نہیں غالباً یہ غالب کی تقلید کا اثر ہو دل شدگاں خود فراموش، دھڑکو میدی نسار فریاد از دست عشق ہا ہزاراں آرزو وغیرہ غالباً اُن کے اشعار میں ہیں جہاں کہیں کلام میں پختگی ہے وہ نہایت ہی لطف و دلکش ہے مومن کی طرح اکثر اشعار میں تھوڑی سی ایسی پیچیدگی پیدا کرتے ہیں جو طبیعت میں اُلجھاؤ نہ پیدا ہونے دے بلکہ معنویت و لطف زیادہ کر دے

حسرت نے غزل کو محض حُسن و عشق کی واردات تک محدود نہیں رکھا بلکہ جو کچھ اور جس عنوان کا خیال اُن کے دل پر اثر کر جاتا ہے اس کو وہ غزل میں جگہ دیتے ہیں چنانچہ آپ اُن کے یہاں دوستوں کا شکوہ احباب کا ماتم، سیاسی و مذہبی عقائد وغیرہ سب ہی کچھ پائیں گے ان سب میں جہاں کہیں ملکی معاملات کا تذکرہ علامہ آگیا ہے وہاں زور تو ضرور ہے مگر شعریت کی کمی ما یر کو اُبھرنے نہیں دیتی لیکن اس قسم کے اشعار بہت کم ہیں حسرت اُن چند مخصوص شعراء میں ہیں جو غزلوں میں تغزل کا بہت خیال رکھتے ہیں یہ خصوصیت اُن کے کلام کا امتیازی پہلو ہے

حسرت تمام عمر سیاست سے دلچسپی لیتے رہے مگر تعجب ہے کہ اُنہوں نے کبھی کوئی مستقل سیاسی خیالات کا اظہار نہیں کیا اس کی وجہ یا تو تغزل سے بے پناہ اُنس ہو سکتا ہے یا پھر یہ کہ سیاست کو اُنہوں نے غزل کا اہل نہیں سمجھا کہ مستقل عنوان بنا کر کچھ کہتے۔

حسرت کا انتقال ۱۳ مئی ۱۹۵۱ء کو ہوا۔

# فانی بدایونی

شوکت علی خاں نام، فانی تخلص ولادت ۱۳ دسمبر ۱۸۷۹ء کو ہوئی۔ آباؤ اجداد کابل کے رہنے والے تھے۔ شاہ عالم بادشاہ دہلی کے زمانہ میں آپ کے جد امجد نواب مشارت خاں نے ہندوستان آ کر سکونت اختیار کی۔ موضع صوبہ بدایوں کے گورنر رہے۔ اُن کی جائداد ایک سو چوراسی مواضعات معافی پر مشتمل تھی۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد کچھ بھی باقی نہ رہا۔ فانی کے والد مرحوم محمد شجاعت علی خاں نے اپنی قوت اور قابلیت کے بل پر عزت و آبرو کمائی۔ ڈپٹی کمشنر محکمہ پولیس میں انسپکٹر تھے۔ مگر ملازمت کو غلامی سے کم نہ سمجھتے تھے۔ چاہتے تھے کہ ان کا بیٹا کوئی آزاد پیشہ اختیار کرے۔ چنانچہ انھوں نے فانی کو وکالت کے امتحان کے لیے مجبور کیا۔

فانی نے انٹرنس تک بدایوں میں تعلیم حاصل کی۔ رہیلی کالج سے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد میور سنٹرل کالج الہ آباد اور محمڈن کالج علی گڑھ میں ایل ایل بی کی تکمیل کی۔ لیکن وکالت کے پیشے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ صرف ماں کے مجبور کرنے پر آپ نے وکالت کا امتحان پاس کر لیا تھا۔ طبیعت اوائل عمر ہی سے شعر و سخن کی طرف مائل تھی۔ پہلی غزل ۱۸۹۹ء میں کہی تھی۔ ان کے والد ہمیشہ شعر کہنے سے روکا کرتے تھے۔ چنانچہ تو کہ فانی کہا کرتے تھے۔ وہ بہایت پوشیدہ طور پر اس سے ظاہر ہے کہ فانی کو کسی صاحب فن سے مستفید ہونے یا اصلاح لینے کا موقع بھی نہ مل سکا تھا۔ ایک مرتبہ بذریعہ خط و کتابت واجع سے اصلاح لینی چاہی مگر یہ راز بھی افشاء ہو گیا اور پھر کبھی والد کے خوف سے کوئی غزل اصلاح کے لیے بھیجنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اصلاح شعر کا کام آپ کو خود اُس مذاق شعری سے لینا پڑا جو آپ کی فطرت میں ودیعت تھا۔

۱۸۹۹ء سے ۱۸۹۸ء تک تو تمام ہمارے ہی علم میں تھا کہ ۱۸۹۹ء میں ایک حادثہ
جانکاہ سے متاثر ہو کر اصول سے اپنا تخلص فانی رکھا [illegible] تھی [illegible]
[illegible] ایک [illegible] اور دوسرا [illegible] اور [illegible] اس کے بلانے
[illegible] مگر یہ [illegible] کے [illegible] مگر عدم [illegible] وقت
[illegible] ہزار [illegible] کچھ باقی رہ گیا [illegible] "فانی" کے [illegible]
اسی [illegible] میں [illegible] کر [illegible] ۱۹۱۷ء کا [illegible] سال [illegible]
[illegible] اصرار [illegible] روش [illegible] کرنی پڑی[1]
[illegible] کے کلام [illegible] فانی کا [illegible]
[illegible] کر [illegible] عالت [illegible]
[illegible] اور [illegible] فانی [illegible]
[illegible] کی تشریح و تفسیر [illegible] ہوتی [illegible]
[illegible] کو [illegible] ہے مگر بہر حال [illegible]
[illegible] کی [illegible] طرح [illegible] پہلو کا [illegible]
[illegible] "فانی" [illegible] کے کلام کا ایک [illegible] مجموعہ
"عرض [illegible] فانی" کے [illegible] کی وہی [illegible]
[illegible] فانی [illegible] البتہ [illegible]
[illegible] کام لیا گیا ہے

فانی کے کلام کی ایک خاص خوبی [illegible] ہے ان کے دیوان کا
کوئی صفحہ ایسا نہ ملے گا جس میں دو چار اشعار [illegible] حاصل [illegible]

---

[1] ماخوذ از مرگ جاں فروری ۱۹۲۲ء

شعر کو اتنا جانتے اور مانتے ہیں کہ تاثیر دوبالا ہو جاتی ہے اور موجودہ دور کے بہت کم غزل گو شعرا ان کے قریب دکھائی دیتے ہیں۔

# ناصری

آپ کی ولادت لکھنؤ ہے جہاں ۱۹۱۵ء میں پیدا ہوئے چونکہ طبیعت میں ذہانت اور غیر معمولی سمجھ تھی لہٰذا چودہ برس کے سن میں اردو، فارسی، عربی کی تعلیم سے اچھی خاصی حد تک فراغت حاصل کر لی لیکن عام مطالعۂ کتب سے استعداد علمی کو بڑھاتے رہے انگریزی تعلیم کا بھی بندوبست ہوا چنانچہ ۱۹۳۱ء میں سحاب یونیورسٹی سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا اور ۱۹۳۶ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے عالمی طور پر ایف اے کا امتحان پاس کیا اسی سال میں منشی کا امتحان بھی پاس کر لیا اس کے دوسرے سال فاضل کے امتحان میں شریک ہو کر کامیابی حاصل کر لی لیکن اس سے پہلے ہی یعنی ۱۹۳۹ء میں اسی قابلیت کی وجہ سے گورنمنٹ کالج لکھنؤ میں فارسی کے پروفیسر مقرر ہو چکے تھے اور وہیں سے پڑھتے پڑھاتے ۱۹۴۳ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے بی اے کر لیا اس کے ایک سال بعد یونیورسٹی کالج الہ آباد میں اسسٹنٹ پروفیسر عربی و فارسی مقرر ہوئے اور یہاں سے ایم اے کا امتحان پاس کر کے چھ برس تک الہ آباد میں رہ کر انھوں نے نہ صرف عربی و فارسی کی خدمت کی بلکہ اردو کی بھی ہمہ تن گوش رہے۔

کالج اور اسکولوں میں مشاعروں کا رواج دے کر لوگوں میں مذاق سلیم پیدا کرنے کی کوشش کی اردو شاعری کے عیوب و محاسن کو سمجھا کر ایک سائستہ اور صحیح راستہ طلبا کی نظروں کے سامنے پیش کر دیا جس کا اثر اب تک باقی ہے ۱۹۴۲ء میں الہ آباد سے ان کا تبادلہ گورنمنٹ ہائی اسکول لکھنؤ میں بہ حیثیت ہیڈ ماسٹر کے ہوا وہاں سے دو سال بعد

ضلع بارہ بنکی کے گورنمنٹ اسکول میں تشریف لے گئے ۱۹۲۹ء تک وہیں رہے بعد ازاں علی گڑھ تبادلہ ہوگیا اور وہیں ۱۹۳۱ء میں راہیٔ ملک بقا ہوئے

زندگی میں اپنے ذاتی اخلاق اور علمی قابلیت کی وجہ سے وہ اتنے ہر دل عزیز تھے کہ اس صوبہ کی مختلف علمی درسگاہوں میں بحیثیت ممبر کے منتخب ہوتے رہے ان کی قیمتی رائے سے الہ آباد، لکھنؤ، علی گڑھ وغیرہ کی یونیورسٹیاں فیض یاب ہوتی رہیں۔ انٹرمیڈیٹ بورڈ جب سے وجود میں آیا تھا ہمیشہ ان کی ذات سے مستفیض ہوتا رہا اور گورنمنٹ نے ہمیشہ ان کو اس بورڈ کا ممبر نامزد کیا

ناصری کی قابلیت صرف اسلامی علوم تک محدود نہ تھی بلکہ جرمن، اعرانی، فرانسیسی زبان سے بھی ایک بڑی حد تک واقفیت رکھتے تھے وہ نہ صرف عربی اور فارسی کے ادیب تھے بلکہ اردو کے بھی ایک زبردست انشاء پرداز شاعر اور محقق تھے۔

ناصری کی ایک خاص خدمت آسانی سے نہیں بھلائی جاسکتی وہ یہ کہ اسکول اور کالج اسکول کو ایک مرکز پر جمع کرنے کی ہمیشہ کوشش کرتے رہے ان کے کلام میں اگر پرانے دور کی خصوصیات یعنی زبان کی صفائی شعر کی مضمونی اور آرٹ موجود ہیں تو موجودہ زمانے کی سائنسی بلندیٔ خیال اور حقیقت بھی پائی جاتی ہے

یہی نہیں کہ ناصری نے درس و تدریس کا سلسلہ اسی زندگی کا جزو لاینفک سمجھ لیا تھا بلکہ تصنیف و تالیف کا بھی سلسلہ برابر جاری رکھا چنانچہ متعدد کارنامے آپ کی یادگار ہیں مجملہ چند کتابیں حسب ذیل ہیں

۱۔ سرور اسماء۔

۲۔ محرر الفوائد۔

۳۔ کرارت

۴۔ ریت وحش وطیر (جانوروں کے متعلق ہے)

۵ عمادِ عجم (تاریخ زبانِ فارسی)
۶ مصنوعی سرگزشت۔
۷ دیوانِ حصہ اوّل (نذرِ احباب)
۸ دیوانِ حصہ دوم
۹ محمودِ نصائح

**اختلاف و عداوت** جو لوگوں کو ناصری کی صحبت میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا ہے وہ بخوبی واقف ہیں کہ کبھی کسی شخص کا اُن کے پاس سے مغموم ہو کر اٹھنا تو کیا معنی ملا مسرور ہوئے جانا بھی مشکل تھا آپ کے حلقۂ احباب میں ہر مذہب و ملت کے لوگ یکساں شامل تھے اور حق تو یہ ہے کہ جانے اپنے شاگردوں کو اولاد سے کم نہ سمجھتے تھے اور جہاں تک ہو سکتا اُن کی فلاح کی صورتیں پیدا کیا کرتے

ناصری کو خود نمائی و خود ستائی سے ہمیشہ تنفر رہا یہ جذبہ کبھی کبھی ضرورت سے بھی زیادہ ہو جاتا تھا یہاں تک کہ اپنا کلام بھی شائع کرنا عار سمجھا کئے لیکن حسنِ فارسی کا دیوان خود ہی چھپوا لیا اور اسی کے اصرار سے اُردو کا کلام جمع کرنے لگے کہ اُردو کا دیوان بھی شائع ہو جائے تھا جس کی صورت بقول پروفیسر سید صابر علی صاحب یہ تھی کہ کچھ مسودے کتابوں میں رکھی ہوئی ملیں کچھ رسائل احباب کے پاس نکلیں اور کچھ حافظہ سے لیے گئے۔ ان سب کو اکٹھا کرنے کے بعد گم شدہ کلام کی جانب توجہ ہوئی تو استعارہ یار آئے اُن کو قلم بند کر کے اس مجموعہ کو مرتب کیا[1] افسوس کہ زندگی نے وفا نہ کی اکثر یہ مجموعہ مسودہ کی صورت میں پوری طرح صاف بھی نہ ہو چکا تھا کہ داعیِ اجل کو لبیک کہا ناظر ان کی وفات کے بعد دیوانِ احباب کے نام سے دو حصوں میں کلیاتِ ناصری ہدایت خوانی کے زیر اہتمام پریس الہ آباد میں چھپا۔"

---

[1] مقدمہ دیوانِ ناصری

ناصری صاحب کی خوش قسمتی تھی کہ اُن کو پیارے صاحب رشید سا کامل اُستاد نصیب ہوا اُن کی رہنمائی سے ناصری صاحب کے کلام میں صفائی اور سادگی خاص طور سے آئی ناصری نے اپنے اسلوب بیان میں اصولِ ملاحت کا خاص طور سے خیال رکھا ہے اکثر اشعار میں کسی کا کوئی ایسا جذبہ بیان کرتے ہیں جس سے اثر دوبالا ہو جاتا ہے مگر بعض طرح طرح کے نتائج خود نکال کر روح کو کیف سے سرشار کر دیتا ہے کبھی "خدا جانے" کبھی "الامان" کبھی "الوداع" کبھی "معاذ اللہ" یا اس قسم کے ٹکڑوں سے اُن کے کلام میں معنوی کافی پیدا ہو جاتی ہے سمجھنے والے سمجھتے ہیں اور لطف اُٹھاتے ہیں

عشق کی شدت، انتہائی کیف کو پورے مزے کے ساتھ معمولی الفاظ میں بیان کرنا ناصری کا خاص جوہر ہے وہ دارستہ ترکیب، ارتقا الفاظ اور فصل ترکیبوں سے بہت کم کام کرتے ہیں لیکن فارسی کی پُر اثر ترکیبیں اور دلکش الفاظ کے استعمال سے کبھی اُنھوں نے دریغ نہیں کیا چنانچہ ناصر زاں صفا نظر دیدۂ درد گر کا دل دل سا رعیرہ سے اپنے کلام کو آراستہ کیا ہے اسی وجہ سے سرور اور درد اُن کے کلام کے دل و جان ہیں نواب حیدر علی خاں صاحب اثر اپنے مقدمہ میں رقم فرماتے ہیں کہ "دردبھرے الفاظ سے ناصر نے عشق بیان کیا ہے اُن کی شاعری کا نصف العلس سماں اور بیشتر حصہ کلام تاثیر کا طلسم ہے"

وہ قدماء کے اصول کی تقلید کرتے تھے مگر گوارا نہیں پیچ در پیچ استعارات اور تشبیہوں کو ترک کر کے ناکارہ و دلفریب پھولوں کو شوق لیتے تھے محاورات کے صرف میں اُن کو پورا عبور تھا جہاں کہیں استعمال کرتے ہیں ایک خاص موقع سے دکھاتی ہے اس کو چاہے آپ قدما کی تقلید کہیئے یا الفاظ کی واقفیت کہ معشوق کو "میرا جان" اور "صنم" کہہ کر اب تک یاد کیا کرتے تھے۔

ناصری کا کلام حسرت و حرمان کا آئینہ ہے مگر اس میں جھوٹ موٹ کی ہائے وائے نہیں ہے بلکہ ایک ٹوٹے ہوئے دل کی فریاد ہے جو سننے والے کے تارِ رگِ جاں کو مضراب سے چھیڑ دیتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص جو فلسفۂ حزن کا ماہر ہے نفسیات کے راز دلگداز نغموں میں دہرا رہا ہے اور سننے والوں کے جسم و روح میں سنسناہٹ بھر رہا ہے کہیں کہیں خوشی کی ترنگ بھی ہے مگر اس کا مستاع صرف اس قدر ہے کہ المناکی اور اُداگر ہو جائے جس طرح راگ کی دل آویزی سرگم سے بڑھ جاتی ہے۔

ناصری نے اپنی زندگی ہی میں تمام حوائج و صبح پیری کو موت کا پیام سمجھا تھا چنانچہ ان کی رباعیوں اور غزلوں میں اکثر آپ کو اس قسم کے اشعار ملیں گے کہ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ قبل از وقت موت کا انتظار کر رہے تھے ۴۶ برس کے سن میں فالج کے عنوان سے علی گڑھ میں موت کا پیام آ ہی گیا میں نے ایک مرثیہ اور اس کے ساتھ تاریخ وفات کہی

ناصری خلد بریں کو پہنچے
۱۳　　ھ　　۴۹

# ضامن

آپ کی ولادت ۱۸۸۸ء میں قصبہ مصطفےٰ آباد ضلع رائے بریلی میں ہوئی آپ نے علوم متداولہ کی تعلیم لکھنؤ میں حاصل کی آپ کا قیام عرصہ تک لکھنؤ میں رہا البتہ انگریزی تعلیم کے لئے دوسرے شہروں کو بھی جانا پڑا چنانچہ ایف۔ اے آگرہ سے پاس کیا اور بی اے و ایم۔ اے کی ڈگری الہ آباد سے حاصل کی

ضامن کو بچپن ہی سے شعر و شاعری سے دلچسپی رہی ۱۲ برس کے سن سے

شعر کہنا شروع کر دیا تھا میر علی عباد میساں الہ آبادی بڑے پایہ کے شاعر تھے۔ صائم کے جوہر دیکھ کر خود بخود اصلاح کلام کی متوجہ ہوئے۔ اُستاد کی شفقت اور طبیعت کے خداداد جوہر نے کلام میں پختگی اور دلکشی پیدا کر دی۔ میساں کے انتقال کے بعد رفتہ رفتہ آپ کے کلام میں ایک خاص تبدیلی شروع ہو گئی جس کی طرف آپ خود ارشاد فرماتے ہیں ؎

حضرتِ میساں کے دم تک لطف تھا اُس رنگ کا
اب کہو صائم غزل اس میں جو رنگ عام ہے

گویا اُس وقت سے آپ نے رنگِ مائج کو ترک کر کے صفائی کے کوچے میں قدم رکھا آپ کا کلام دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسہب طبع شاعری کے ہر میدان میں رواں ہے۔ غزل قصیدہ رباعی مخمس۔ سلام وغیرہ پر کامیابی کے ساتھ طبع آزمائی کرتے ہیں

الفاظ کے انتخاب، محاورات کے برمحل صرف فارسی تراکیب کی دلآویز آمیزش نے آپ کی شاعری میں ایک خاص مزہ پیدا کر دیا ہے تشبیہات اور استعارات کی زیادتی سے غزل میں قدیم رنگ کی جھلک بھی آجاتی ہے

آپ کے قصائد میں تخیل کی پرواز اور معنویت کی فراوانی ایک خاص رفعت پیدا کر دیتی ہے آپ کا خیال ہے کہ سودا انیسویں صدی کا ایک زبردست شاعر ہے، اور شاید یہی سودا کی محبت تھی جس نے قصائد میں آپ کو اس باکمال شاعر کو اساتذہ کی صف میں محسوس کیا تشبیب میں اکثر جدت ہے

چونکہ آپ کے کلام کا زیادہ حصہ غیر مطبوعہ ہے جو آسانی سے ہر شخص کو فی الحال دستیاب نہ ہو سکے گا لہٰذا بہت اختصار کے ساتھ چند غزلیں اور متفرق اشعار بطور نمونہ ملاحظہ ہوں ؎

دنیا میں پھر وہ کام کے قابل نہیں رہا
جس دل کو تم نے دیکھ لیا دل نہیں رہا

اس رنگ گل نے بزم میں الٹی ہے جب نقاب
گلشن میں سیر ہجوم عنادل نہیں رہا

رخسے نگاہ قیس نے اتنے تباہ دیے
حاجب نظر کا پردۂ محمل نہیں رہا

کشتی اشک آ کے کنارے ہوئی تباہ
ساحل بھی اعتبار کے قابل نہیں رہا

ٹکرائی جب ہے کشتی طوفاں زدہ کوئی
خاموش اس گھڑی لب ساحل نہیں رہا

خوں ریزیوں کا ذکر ہی کیا ہے کہ عمر بھر
رسم خنجر قاتل نہیں رہا

جھکا ہے سر دریا اک صنم کے رماں بہ لیکن وہاں نہیں ہے
بار ٹھہرا ہوں اہل دل کی کہ جس میں بانگ اذاں نہیں ہے

عجب ہے درد جگر کا جھگڑا وہ ہر جگہ ہے کہاں نہیں ہے
عیاں ہے جتنا وہ چھپنے والا اسے اتنا پنہاں نہیں ہے

تری نگاہوں نے لے لیا دل مگر جلش درد کی ہے باقی
طلسم ٹوٹا ہے یہ محبت مکیں تو ہے یاں مکاں نہیں ہے

یہ سے ہوئے ہیں ہر اہل دل کو یہ چھٹکے ہوئے دل مارے
یہ کہاں ہے کوئے جاناں رہیں ہے آسماں نہیں ہے

ٹوٹے ہو سب ہیں مٹ دل میں کوئی ہیں ہے ہمارے والا
عدم خبر ملا کہ ہے کہ جس میں رہیں تو ہے آسماں نہیں ہے

مرد دکھی ہے میری صورت ہوئی تو یہ ماحول کی حالت
سب اس طرح سے ہیں جب کہ گو اسی کے سہ یں ماں ہیں ہے
کلی کلی مسکرا رہی ہے ترا سے نمری بھی گا رہا ہے
تمھیں کو کیا ہو گیا ہے عاتمس تو رآہ دعا رہا ہے

رُخ کی زردی صدا اُلفت سے دور ہوتی گئی
رازِ دل ہنا چھپا ا ا ا ا ا ا ا ا ا ا ا ا

کھل جائے حال آپ ہٹا س نقاب اگر
وہ اور ہوں گے عشق حسین آتا ہے ہم ہیں
کرتی دلیل و حوار ہے حاجت فقیر کو
دارِ عرض ہے دست گدا میں دم ہیں

جیتے سیاں ساتھ لے سہ ساری زندگی
گردان تلاش موت میں ہم کو کو ا ا ا

میں اپنے دل کو ستارِ مالی سہ ادکرتا ہوا
ذی دولت تھی جس کو عشق یہ سہ ادکرا

شوق دیدار رُخ یار الٰہی تو ہو آپ ہم عمر کہ ا ا ا ا
عاتمس کا انتقال ۲۷ اپریل ۱۹۹۶ء کو الہ آباد میں ہوا

# اثر

۱۲ جولائی ۱۸۸۵ء کو لکھنؤ میں ولادت ہوئی ۱۹۰۶ء میں لکھنؤ سے بی اے پاس کیا ۱۹۱۹ء میں عہدۂ ڈپٹی کلکٹری پر مامور ہوئے

اثر کے اکثر بزرگوار ایرانی قابلیت اور کمال کی وجہ سے سربلند و ہر دلعزیز رہے شعر و سخن کا بھی چرچا عرصے سے گھر میں رہا آپ کے والد بزرگوار سکیم مرزا فضل حسین حال صاحب بھی ایسے وقت کے اچھے شاعر تھے۔

اثر نے ایسے ماحول میں پرورش پائی تھی کہ بچپن ہی سے شعر و سخن کا ذوق پیدا ہو گیا تھا لیکن شعر کہنے کا بہت کم اتفاق ہوا جوانی میں شعر کہنا شروع کیا اور اب آپ کا مجموعۂ بہاراں ایک خاص وقعت کے ساتھ دلوں میں گھر کئے ہوئے ہے

اثر کے اشعار کو اگر غور سے دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا کہنے والا دربارِ عشق کا بہت بڑا رمز شناس و نکتہ داں ہے جو اکثر معمولی الفاظ و اشارہ میں ایسی بہت کی باتیں بیان کر جاتا ہے کہ سمجھنے والے سمجھتے ہیں اور محو ہو جاتے ہیں آپ کی رباعی کی تصویر الفاظ میں اس خوبی سے کھینچتے ہیں کہ اس کا ہر گوشہ منور ہو جاتا ہے روزمرہ و صفائی زبان کا ہر قدم پر خیال رہتا ہے جس کی وجہ سے کلام میں دلکشی اور زیادہ ہو جاتی ہے ہمیشہ نرم و شیریں الفاظ صرف کرتے ہیں، غالباً یہ خوبی اس وجہ سے اور زیادہ ہو گئی ہے کہ آپ کو میر کے کلام سے نہایت درجہ شغف ہے اور اکثر اسی بزرگ کی تقلید کا میابی کے ساتھ کی ہے ہندی الفاظ بھی کبھی کبھی استعمال کرتے ہیں مگر بہت مزے کے ساتھ، بدھری آنکھیں، لول مالا روگ، وغیرہ ہندی و عربی الفاظ کے ساتھ سونے میں سہاگا کا کام کرتے ہیں۔

۱۹۴۴ء میں اثر کے نظموں کا مجموعہ "رنگ بست" شائع ہوا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف کو جتنی غزل کہنے پر قدرت ہے اتنی ہی مہارت نظموں میں بھی ہے مناسب الفاظ کا تسلسل، جوش اور زور ان نظموں کی خصوصیت ہے موجودہ زمانے میں اثر کی وہ ذات ہے جو پرانے رنگ کی غزلوں کے ساتھ ہی ساتھ ایسی نظمیں لکھتے ہیں جن میں جدید و قدیم طرز سخن کی خصوصیات یکجا نظر آتی ہیں

زبان و بیان کے لحاظ سے اثر کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ تقلید نے ان کو میر کے قریب پہونچا دیا ہے۔

اثر نثر میں بھی کچھ نہ کچھ لکھا کرتے ہیں جسے تنقید کہا جا سکتا ہے ان کی تنقید نگاری زبان و بیان کی دیکھ بھال سے تعلق رکھتی ہے اور اس میں شک نہیں کہ وہ اس معرکہ میں بڑی کاوش و نکتہ رسی سے کام لیتے ہیں ان کے مضامین کا ایک مجموعہ "چھان بین" شائع ہو چکا ہے نثر میں دوسری کتاب میر انیس کی مرثیہ نگاری ہے

# جلیل

نام جلیل جس سے مولوی حافظ عبدالکریم کے بیٹے ہیں ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی ۲ برس کی عمر میں امیر مینائی کے شاگرد ہوئے عرصہ دراز تک ملکہ آصف کے آخر زمانہ تک دفتر امیر اللغات کے سکریٹری رہے ایسے بزرگ اُستاد کے ہمراہ حیدرآباد دکن گئے اور ان کے انتقال کے بعد وہیں اقامت پذیر ہو گئے اب آپ امیر کے ہمسر شاگرد شمار کئے جاتے ہیں آپ کی فارسی اُردو کی قابلیت مسلم الثبوت ہے عروض و قوافی میں عالم دخل ہے سلطنت آصفیہ نے بجا قدر دانی کی ہے اور آپ کو فصاحت جنگ کا خطاب دیا ہے۔

جلیل کا کلام دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ نہایت خوبی کے ساتھ آپ اپنے اُستاد امیر مینائی کے قدم بقدم چلتے ہیں انھیں کے رنگ میں شعر کہتے ہیں وہی شوخی وہی سادگی خواجہ کے کلام کا جوہر بھی یہاں بھی ایک عام فہم صورت میں کچھ اس طرح چمکی کہ جلیل کی غزلیں ہر طرف چشم زدن میں پھیل گئیں اُن کے کلام کی اس مقبولیت نے اُردو اور صحیح اُردو کا جو ذوق عوام الناس میں پیدا کر دیا اُردو زبان ہمیشہ اس کی رہین منت رہے گی ان خوبیوں کے علاوہ جلیل کی عام مقبولیت کے دو خاص وجوہ معلوم ہوتے ہیں

(۱) غزلوں میں شستہ الفاظ سے ایسا ترنم پیدا ہوجاتا ہے گویا یہ غزلیں موسیقی ہی کے لئے کہی گئی تھیں

(۲) حسن و عشق کے اظہار میں اس درجہ سلاست اور روزمرہ ہے کہ خود بخود دل کھنچ جاتا ہے

اس طرح جلیل نے شاعری کو عوام الناس کے لئے بہت کچھ دلچسپ بنا دیا ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اُن کے یہاں شعر و شاعری کی وہ بلندیاں نہیں جو شاعری کو دوسرے فنون پر فوقیت دیتی ہیں اور شاعری کا رتبہ عوام سے بلند تر کر دیتی ہیں

اُن کے کلام کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد اُن کی شاعرانہ عظمتوں کا پتہ چلتا ہے اگر اخلاقی اور ناصحانہ مضامین کو انھوں نے غزل میں اس طرح جگہ دی ہے کہ عوام و خواص دونوں یکساں لطف اٹھاتے ہیں صوفیانہ رنگ بھی جا بجا ان کے کلام میں موجود ہے لیکن یہ اُن کا خاص میدان نہیں جلیل کا اصل رنگ جذبات عشق اور اظہار اُلفت میں زیادہ نمایاں ہے گویا تغزل میں اُن کو خاص ملکہ ہے جس کو انھوں نے اپنی سادگی اور دل کشی ادائے بیان سے سراپا لطف زبان سے دل آویز بنایا اور خیالات کے زیور سے آراستہ کیا غرض جلیل کا کلام سادہ اور رواں ہے مجموعہ کلام "تاجِ سخن" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

# جوش

آپ لکھنؤ کے ایک مشہور خاندان کے چشم و چراغ ہیں جو عرصہ سے علمی خدمات انجام دیتا رہا ہے اور اس حیثیت سے سب سے پہلے فقیر محمد خاں گویا کا نام آتا ہے جنھوں نے ابتدا میں تیغ آبدار کی بدولت نواب امیر الدولہ بہادر کی فوج میں رسالداری حاصل کی اور تیغ زباں کے جوہر میدانِ ادب میں دکھا کر ایک دیوان اور ایک نثر کی مشہور کتاب نستاں حکمت یادگار چھوڑی گویا کے فرزند احمد محمد خاں آگاہی صاحب دیوان تھے

شبیر حسن خاں جوش گویا کے پر نواسے ہوتے ہیں آپ ۱۸۹۴ء میں ملیح آباد میں پیدا ہوئے خداداد ذہانت و سلیم الطبعی اور فطری ذوق نے راہ راست سے کبھی قدم ہٹنے نہ دیا علمی مذاق کسی نہ کسی صورت میں ہمیشہ قائم رہا شاعری کا چسکا بچپن ہی سے رہا

جوش کچھ عرصہ تک دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ میں بھی ادبی نقاد کی خدمت انجام دے چکے ہیں یہ وہ اہم خدمت ہے جس پر کبھی طباطبائی بھی مامور تھے حیدرآباد میں آپ ۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۴ء تک رہے

جامعہ عثمانیہ سے الگ ہو کر آپ نے دہلی سے ایک رسالہ "کلیم" شائع کرنا شروع کیا جو باوجود اپنے ممتاز اوصاف کے بھی زیادہ نہ چل سکا۔

کلیم کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ علاوہ شاعری کے جوش میں نثر نگاری کی بھی بے نظیر صلاحیت موجود ہے دلیل کے ساتھ تنقید اور اثر کے ساتھ رد ہر جگہ نمایاں ہے صرف ادبیات تک جوش کی دنیا محدود نہیں بلکہ اپنی صحافت نگاری سے انھوں نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ اُن کو سیاسیات اقتصادیات وغیرہ سے بھی لگاؤ ہے

جوش کا ادبی کارنامہ دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے (۱) غزل (۲) نظم،

اُن کی مستقل نظمیں اُن کی حیات جاوِدانی کا ذریعہ ہو گئی ہیں اس لئے کہ دلکشی حو قبول عام کا شرف دِلواتی ہے ان کے کلام کا خاص جوہر ہے خیالات کی تہہ میں ڈوب کر مضامین کے نہایت آبدار موتی نکالتے ہیں طرزِ بیان میں جدت ہے فارسی کی ترکیبوں کا صرف مصرعوں میں اس خوبی سے ہوتا ہے کہ تمام کلام میں جان آجاتی ہے اور ایک خاص لطافت پیدا ہو جاتی ہے۔

جوشؔ تشبیہات کے خاص ماہر ہیں، اُن کی تشبیہات میں مقامی اثر بھی ہوتا ہے وہ زیادہ تر اُن چیزوں کو تشبیہات کے لئے چُنتے ہیں جو ہمارے متاہدے میں روزمرہ آتا کرتی ہیں اور ایسی معنویت در محل استعمال کی وجہ سے شعر کی جان بن جاتی ہیں بعض وقت جوشؔ تشبیہات ہی سے پوری فضا کو ایک مکمل تصویر بنا دیتے ہیں اور متعدد تشبیہات و استعارات سے مفہوم کو اتنا واضح اور دلکش کر دیتے ہیں کہ اُردو ادب میں کوئی دوسرا شاعر اُن کا اس معرکہ میں حریف نہیں

اُن کے کلام میں ایک اور خاص بات نظر آئے گی کہ جوش اور زور کا دریا ہر جگہ موجزن ہے جس کی وجہ سے پڑھتے وقت ایک خاص اُمنگ دل میں پیدا ہو جاتی ہے

وہ اپنے کلام سے دنیا کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اقبالؔ کی طرح حسنِ عمل کی طرف متوجہ کرتے ہیں اور دنیا کو غلامی سے نجات دِلا کر اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی تعلیم دیتے ہیں اگر بعض وقت لوگوں کی برائیوں پر روشنی ڈالنے میں اتنے جوش اور تیزی سے کام لیتے ہیں کہ نظروں میں حیرگی پیدا ہو جاتی ہے اور ان کی تیز کلامی تلخ نوائی سے مل جاتی ہے خواہ اُسے اُن کے شدید احساسات پر محمول کیجئے یا خوابِ گراں سے چونکانے کی تدبیر سمجھئے۔

مناظرِ قدرت کی تصویر کشی میں جوشؔ کو کمال حاصل ہے عموماً پوری تصویر نظر کے

سامنے آجاتی ہے، البتہ کبھی کبھی بچپن حالت کا نقشہ جوشؔ کے جذبات کی رنگ آمیزی میں کسی قدر دھندلا ہو جاتا ہے ان کا پیمانۂ قلب جذبات سے اس قدر لبریز ہے کہ کائنات کے ہر ذرہ پر وہ جذباتی نگاہ ڈالتے ہیں چاہے "راب وریل" ہو یا "گاؤں کا بازار" "تارک الدامانِ کالج سے خطاب ہو "کسان" ہر نظم میں وہ اثر و کیف پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس سے شاعری میں تاثیر ضرور بڑھ جاتی ہے لیکن اصلی حدوخال پوری طرح صاف نظر نہیں آتے

جوشؔ کے کلام کی یہ بھی امتیازی خصوصیت قابل قدر ہے کہ یاس و حرماں نصیبی بہت کم ہے وہ بزدلی کو پاس نہیں آنے دیتے بلکہ اظہار افسوس کے بعد ہمت و جرأت کہہ کر آخر میں ہمت افزائی کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ موجودہ بیکسی کا علاج کیا ہے اُن کا خیال ہے کہ ہر مصیبت کے بعد خوشی آتی ہے صرف ہوشیار ہو جانے کی ضرورت ہے اُردو میں اشتراکی شاعری کی ساخت جوشؔ سے بڑی حسن میں مزدور بیچارہ کی حمایت، سرمایہ داری کی مخالفت خاص موضوع ہے بے باکی اور زور اُن کے کلام کی جان ہے معاشرتی و سیاسی نظام پر رائے زنی کرتے وقت وہ نہ کسی بادشاہ کا خیال کرتے ہیں نہ کسی مذہبی پیشوا یا جماعت کا ہر ایک کی خامیاں آوازِ بلند پکار کر بیان کر دیتے ہیں اُن کا کلام زیادہ تر تنقید حیات پر مبنی ہے سماج کی خرابی چاہے مذہب کی غلط ترجمانی سے ہو یا دانی اقتدار کی خام خیالی سے ہر ایک کی اصلاح کرنا وہ اپنا فرضِ منصبی سمجھتے ہیں اُن کی نظموں میں یہ خصوصیات ہر جگہ نمایاں ہیں

جوشؔ کی ایسی نظمیں بھی کافی دلکش ہیں جن میں تلمیحی انداز کے علاوہ حسن و عشق کے جذبات و واردات ہیں اُن میں واقعیت و اصلیت کا عنصر بہت حسین ہوتا ہے مناظرِ قدرت اور دیہات کے بازار۔ کھیت۔ ریل وغیرہ کو سادگی و حقیقت کے ساتھ دلچسپ شاعرانہ انداز میں پیش کرنا جوشؔ کا ایک خاص کارنامہ ہے

خوش کی غزلیں سرمستی و کیفیت کا بیان ہیں محبت کے واقعات کی تفصیل حسن کی کرشمہ ساریوں کی داستانیں نہایت خوبی سے اشعار میں جگہ پاتی ہیں چونکہ وہ خود راہِ محبت میں گم ہو چکے ہیں اس لئے جو کچھ بیان کرتے ہیں دل کی چوٹ ہوتی ہے، دماغ کی کاوش نہیں

خوش کے کلام کے بہت سے مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن کے متعدد ایڈیشن بھی نکل گئے ہیں ان میں روحِ ادب نقش دلگار شعلہ و شبنم۔ حرف و حکایت جنون و حکمت فکر و نشاط آیات و نغمات۔ عرش و فرش سلسل و سلاسل وغیرہ ہیں

خوش عموماً اپنے کو مرحوم لکھتے ہیں لیکن حقیقتاً وہ ابھی بقیدِ حیات ہیں

# صفی لکھنوی

نام علی نقی، اور تخلص صفی ہے سلسلۂ نسب حضرت امام زین العابدین تک پہنچتا ہے آپ کے مورث اعلیٰ سدید الدین شاہ مبارک سلطان شمس الدین التمش کے زمانے میں عرب سے آکر دہلی میں سکونت پذیر ہوئے وہیں بالائے حوض شمسی اُن کا مزار ہے۔ سید احسان علی صفی کے پردادا جاٹوں کے مظالم سے تنگ آکر فیض آباد چلے آئے اور وہیں سکونت اختیار کی نصیر الدین حیدر کے زمانہ میں سید سلطان حسین صفی کے دادا فیض آباد سے آکر لکھنؤ میں مقیم ہوئے

صفی ۱۸۶۲ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے دس بارہ سال کے سن تک درسیات فارسی و عربی کی تکمیل مولوی نجم الدین کاکوروی اور شیخ حافظ علی مہروی سے کی بارھویں یا تیرھویں برس ہائی اسکول میں انگریزی شروع کی اور سال بھر کے بعد کیننگ کالیجیٹ اسکول

میں داخل ہو کر انٹرنس تک تعلیم انگریزی حاصل کی۔ اسی درمیان میں دو تین سال تک اکثر علوم معقول و منقول کا استفادہ اپنے خسر علامہ مولوی احمد علی اور اپنے چچا سید محمد حسین سے کیا۔ ۱۸۸۳ء سے ملازمت سرکاری میں داخل ہوئے اور محکمۂ دیوانی میں مختلف مقامات اور مختلف عہدوں پر رہ کر ۱۹۲۳ء میں ۴ سال کام کرنے کے بعد پنشن پائی۔

صفی کی ذات اُن لوگوں میں ہے جنھوں نے لکھنؤ اسکول کی شاعری کے دامن کو بدنامی کے دھبے سے پاک کیا اور ایک پاکیزہ اور کارآمد جامہ پہنا کر بازارِ اردو میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ اُن کے کلام میں نہ تو رعایتِ لفظی کی بھرمار ہے نہ مبالغہ سے اشعار کا دامن گرانبار ہے اور نہ اعتدال سے دامن اُلجھ رہا ہے بلکہ زیادہ تر پاکیزگی کے ساتھ صفائی حقیقت دلکشی تمام کلام میں نمایاں ہے قصیدہ و رباعی مثنوی وغیرہ کے علاوہ خصوصیت کے ساتھ اُن کا کلام دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ایک غزلیات کا اور دوسرا مستقل نظموں کا

غزل میں سب سے پہلی چیز جس کو جانِ غزل کہا جاتا ہے وہ تغزل ہے صفی عاشقانہ مضامین جس صفائی اور پُر درد طریقہ سے نظم کرتے ہیں اُس کی مثال اُردو میں زیادہ نہیں ملتی سادگی آپ کی غزلیات کا خاص جوہر ہے، زبان میں بھی سادگی، خیال میں اور طرزِ بیان میں بھی سادگی ہے اور خوبی یہ کہ ان چیزوں میں کبھی عامیانہ پن نہیں آنے پاتا

محاورات اور تشبیہات کی خوبیوں سے کلام میں جاشنی اور دلکشی بڑھ جاتی ہے۔ ان کی غزلوں کا امتیازی رنگ یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے۔ کہ معنی دل پسند بیاں کو اُردو میں اس خوبی کے ساتھ اُس وقت لانے جب دوسروں کے یہاں یہ عنصر نایاب تھا کہ جس کے سبب سے نہ صرف ندرت پیدا ہوتی گئی بلکہ اُردو ادب میں خیالات کا اضافہ بھی ہوتا گیا اپنی غزلوں میں موجودہ زمانے کے گوناگوں مسائل اس خوبی سے نظم کرتے ہیں کہ نہ تو اُردو غزل کے لیے وہ بیانات بار ہوتے ہیں اور نہ اجنبی معلوم ہوتے ہیں

صفی کی زبان اتنی نرم اور شیریں ہے کہ پڑھنے والے کو ایک غزل کئی بار پڑھنے پر بھی سیری نہیں ہوتی، پھر اس میں بول چال کا لطف دلکشی میں اور چار چاند لگا دیتا ہے ثقیل الفاظ کہیں نہ ملیں گے، فارسی کی ترکیبیں البتہ غزلوں میں موجود ہیں کلام کی پختگی معنی آفرینی کے ساتھ مل کر اشعار میں ایک کیفیت پیدا کر دیتی ہے

نظم لکھنے کو تو سب ہی لکھتے ہیں مگر جب شعریت پیدا نہیں ہوتی تو نظم بجائے دلکش ہونے کے پڑھنے والوں کے ذہن پر بار ہو جاتی ہے یہ وہ میدان ہے جہاں شاعر اور متشاعر کا فرق بہت آسانی سے معلوم کر لیا جاتا ہے صفی کی نظموں میں اس بات کا بہت زیادہ خیال رکھا گیا ہے کہ دلکشی کہیں ہاتھ سے جانے نہ پائے شعر میں شگفتگی، بیانات میں حسن مذاق تشبیہات میں جدت دل و دماغ کو اس طرح اپنی طرف متوجہ رکھتی ہیں جس طرح حسین صورتیں نگاہوں کو۔

صفی کی نظموں کے موضوع مختلف ہیں اُن کی فہرست دینا طوالت سے خالی نہیں بعض موضوع ایسے ہیں کہ جو شاید اُردو ادب میں اس کے پہلے بہت کم لکھے یا نہ ہوئے کے برابر تھے مختلف شہروں کے تاریخی مقامات کا دلچسپی کے ساتھ منظوم بیان اور اُن کے تاریخی اور جغرافیائی حالات اور اس کے ساتھ عمارتوں اور مقامات کا ذکر اس خوبی کے ساتھ کرتے ہیں کہ باوجود اس کے یہ موضوع خشک ہیں مگر پھر بھی لطف پُر لطف ہو جاتے ہیں کہ دلکشی کی کوئی انتہا نہیں رہتی اس لحاظ سے الہ آباد بمبئی حیدر وغیرہ کے متعلق نظمیں قابلِ دید ہیں جو شائع بھی ہو چکی ہیں

طولانی نظموں کی بدمزگی دور کرنے اور نظم کی دلکشی قائم رکھنے کے لئے جہاں کہیں تغزل کا رنگ پیدا کرتے ہیں وہاں بڑی لذت سدا ہو جاتی ہے صفی کی نظمیں زیادہ تر شیعہ کانفرنس کے سالانہ جلسوں کے لئے لکھی گئی ہیں ایسی نظموں کا مجموعہ "لختِ جگر" کے نام سے شائع ہو چکا ہے

اس کے یہ معنی نہیں کہ صفی کی نظموں کا دیرا ایک فرقہ تک محدود ہے ان کی بہت سی نظمیں ایسی ہیں جن سے کل ملک اور ہر قوم کے لوگ یکساں لطف اندوز ہو سکتے ہیں ہندوستان کی بدقسمتی اور اہلِ وطن کی بربادی پر اکثر ماتم کر کے اہل وطن کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے اسی طرح بعض نظموں میں "اُردو" کی بگڑی ہوئی حالت پر آنسو بہائے ہیں اور راہِ راست پر لانے کے لئے نہایت معقول مشورے دیئے ہیں

نظموں میں کبھی کبھی شگفتگی زیادہ کرنے کے لئے مزاح کا پہلو اس خوبی سے پیدا کر دیتے ہیں کہ نہ تو اسفال پیدا ہوتا ہے اور نہ متانت و سنجیدگی کو ٹھیس لگتی ہے بلکہ دل و دماغ تازہ ہو جاتے ہیں اب عالباً یہ اندازہ ہو گیا ہو گا کہ صفی نے مختلف موضوع پر طبع آزمائی کر کے اُردو کے میدان کو وسیع کرنے کی خوبی کے ساتھ کوشش کی ہے

صفی کا انتقال ۲۶ جون ۱۹۵۰ء کو ہوا۔ دیوان ابھی تک شائع نہیں ہوا لیکن غزلوں کا ایک انتخاب "صحیفۃ الغزل" کے نام سے شائع ہو گیا ہے

# ثاقب لکھنوی

مرزا اکبر حسین نام ثاقب تخلص ہے پیدائش اکبر آباد (آگرہ) میں ۱۸۶۹ء میں ہوئی ان کے جدِ امجد حاجی علی قزلباش شاہ طہماسپ صفوی کے خاص امراء دربار میں سے تھے دو سو برس کا زمانہ گزرا کہ یہ خاندان ہندوستان میں سلسلہ تجارت دار ہوا اور اکبر آباد میں سکونت اختیار کی ثاقب ابھی چھ مہینے کے تھے کہ ان کے والد اکبر آباد کو چھوڑ کر لکھنؤ چلے آئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی

ثاقب نے فارسی کی طرف زیادہ توجہ کی عربی میں ابتدائی کتابیں پڑھ لیں اور انگریزی میں انٹرنس تک لیاقت حاصل کی تلاش معاش میں کبھی ثاقب لکھنؤ میں قسمت آزمائی

کرتے رہے اور کبھی کلکتہ چلے گئے بالآخر ۱۹۰۸ء میں ریاست محمود آباد میں ٹھکانا ہو گیا۔

اس کتاب کے دوبارہ شائع ہونے کے پہلے ہی ثاقب کا دیوان شائع ہو چکا ہے جس کی روشنی میں ہم کو اپنی اس رائے کو ترمیم کرنا پڑا جو پہلے ایڈیشن میں کلام ثاقب کے اسحاب کی مدد سے قائم ہوئی تھی ثاقب، میر و غالب کے مقلد ہیں لیکن دیوان شائع کرنے میں اگر وہ میر کے بجائے غالب کی تقلید کرتے تو بہتر ہوتا۔ صحامت کی خواہش نے رطب و یابس سب ہی ایک جا کر دیا غزلوں کے علاوہ سہرا، تاریخ، قصیدہ سب کو اس دیوان میں جگہ مل گئی

مرزا ثاقب اگر غالب کی نظر اسحاب سے کام لیتے تو ان کے اچھے اشعار کو دیر تک چمکنے کا موقع ملتا اب موجودہ صورت میں نظموں کو تلاش کرنا پڑتا ہے ویسے وہ خود متوجہ کر لیتے معنویت و زبان کا اثر یکساں قائم رہتا۔ سب سے پہلا اثر جو دیوان ثاقب کے مطالعہ کرنے سے ہوتا ہے وہ زبان کی صفائی اور مضمون کے تلاش کی لے درپے کوشش ہے خیالات کو بلند کرنے کے لئے ثاقب نے بڑی محنت سے کام لیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ کبھی کبھی کامیاب بھی ہوتے بڑے سے بڑے خیالات کو کم از کم الفاظ میں نظم کرنے کی اچھی کوشش کی ہے لیکن یہ خصوصیت ہر جگہ قائم نہیں رہ سکی ان کے دیوان میں ایسے اشعار بہت کافی ہیں جن سے خودداری کا احساس تو دیا حاصل کر سکتا ہے سحصدت کو اپنا اہم سمجھا کہ انسان، انسان معلوم ہو سکے اس کی ہستی اپنی انفرادیت کا دوسروں پر نقش قائم کر سکے ان کے کلام کی بڑی نمایاں خصوصیت ہے پاکیزگی و لطافت کے ساتھ ساتھ ہموار کلام خاص طور پر پورے دیوان میں موجود ہے

طرز بیان و صفائی زبان کے اعتبار سے دیوانِ ثاقب قابلِ داد ہے مصرعوں کی ساخت عالمانہ اختیار کئے ہوئے ہے بہت جچے تلے ہوئے الفاظ، بہترین محاورے،

شاعرانہ پیرایہ کے ساتھ نظم ہوتے ہیں۔ مارداب حسن و عشق کو لطیف اشاروں میں بیان کر دیا ثاقب کا ایک کارنامہ ہے جس سے اُن کی فطرت شاعری اور نازک جذبات کے احساس کا پورا اندازہ ہوتا ہے

خود داری، زورِ کلام و سردارِ تخیل کی کوشش ثاقب کے اشعار میں ایک انفرادی حیثیت پیدا کر دیتی ہے غالباً اُن ہی خصوصیات کی وجہ سے کلام میں گمشدگی و بیخودی کے جذبات بہت کم ہو سکے جس کی کمی جا بجا محسوس ہوتی ہے

ثاقب کا انتقال ۱۹۴۶ء میں ہوا

# ظریف

سید مقبول حسین ظریف کی ولادت ۲۴ فروری ۱۸۷۰ء میں لکھنؤ میں ہوئی اُن کے والد کا نام سید فضل حسین تھا ظریف بچپن ہی سے شوخ اور بے باک تھے۔ اس زمانہ کے رواج کے لحاظ سے ظریف کی ابتدائی تعلیم قرآن مجید سے شروع ہوئی اس کے بعد اُردو پھر فارسی کی طرف توجہ کی گئی انگریزی کم پڑھی مگر کسب سیمی کے مشغلہ نے روز روز اُن کی معلومات میں اضافہ کیا ظریف، صفی کے چھوٹے بھائی تھے اور اُن ہی کی فیض صحبت سے شعر و شاعری سے واسطہ ہوا صفی اس وقت اُردو شاعری اور خاص کر صنفِ غزل کی ذہنی تبدیلی کرنے والوں میں نمایاں حصہ لے رہے تھے، فرسودہ طرزِ بیان اور مبتذل مضامین سے غزل کو پاک کرنا چاہتے تھے اُردو کے دورِ متوسط میں جو خرابیاں طرزِ تخیل اور ذہنیت میں آگئی تھیں اُن کو دور کر کے صحت مند عناصر غزلوں میں داخل کرنا چاہتے تھے صفی کی اس ذہنی کاوش کا اثر ظریف پر خاطر خواہ پڑا۔ چنانچہ جب ظریف مشاعروں میں شرکت کرتے تو اُن کے پیش نظر یہ رجحان رہتا اور مرزا سیہ اندار میں معشوق کو قاتل کہنے والے، معشوق سے قربان کرنے

والے، چاک گریبان پر شعر کہنے والے اور اسی قسم کے تقلیدی راہ پر لگاہ کو شاعری کا جزو اعظم ماننے والے، کا وہ ہمیشہ مذاق اُڑاتے ظریف کے نزدیک یہ زبان کی بڑی خدمت تھی جس کو مرتے دم تک نباہتے رہے

ظریف کی شاعری اکبر کی شاعری کی طرح ایک مقصد پر مبنی تھی بادی النظر میں وہ محض تفریح کے لئے ہوتی مگر باطن میں اس کا منشا اصلاح مذاق ہوتا وہ ہنسا ہنسا کر ادب کی خرابیوں کو دور کرنے کی کوشش کرتے یہ نظریہ یہیں تک محدود نہیں تھا بلکہ سیاسی و سماجی خرابیوں پر بھی وہ ایسے انداز میں وار کرتے جیسے کرتے رہے۔ کل ہند تحریک ہو یا صوبائی، سیاسی تحریک، مقامی ہو یا سماجی خرابی وہ ہر ایک میں اپنی شاعری سے اصلاح کرنے کا نکتہ چینی سے اپنی بیداری کا ثبوت دیتے اس کا ثبوت آپ کو ان کی متعدد نظموں میں ملے گا مثلاً محل آب رسانی کونسل الیکشن، رس، ہمارے لیڈر، زلزلۂ بہار، دعائے لکھنؤ، ہوم رول، وغیرہ

ظریف کا کلام اگرچہ ہنسانے کا مرقع ہے مگر اسی مجموعہ میں ایسی نظمیں بھی نظر آتی ہیں جن میں سنجیدگی اور دردمند دل کی پکار بھی ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کبھی کبھی یہ ہنسانے والا ایسے محسوسات سے مجبور ہو کر رو بھی دیتا ہے ایسے موقع پر ظریف کی نظموں میں بڑی تاثر و گداز کا سامان مل جاتا ہے

ظریف کے کلام میں تاثیر کی کئی وجہیں معلوم ہوتی ہیں سب سے پہلے تو زبان کی ماہرانہ اور محاورات کی صحت ہے اسی کے ساتھ نئی خوبیاں بھی شامل کر لیجئے تو بڑی حد تک کامیابی کا راز معلوم ہو جاتا ہے مگر ان باتوں سے بڑھ کر اُن کا رادیہ نگاہ تھا ہر خرابی پر ان کا دل دھڑکنے لگتا تھا وہ انفرادی احساس سے بلند ہو کر قومی و اجتماعی شعور سے کام لیتے تھے اور جب احساس میں شدت ہو جاتی تھی تب خیالات کو استعارہ کا جامہ پہناتے تھے اُن کا طرز بیان نہایت پُر اثر تھا عموماً ایسی زبان کلام میں استعمال کرتے تھے اور ایسے مزے

کے اعتراضات کرنے جو عام فہم بھی ہوتے اور ہمہ گیر بھی اس سے انکار نہیں کہ ان کے دیوان میں بعض جگہ ایسا کلام بھی ملتا ہے جو صرف کہنے کے لئے کہا گیا ہے جنہیں مروت سے مجبور ہو کر ایسے مشاعروں کی شرکت اور ایسے اشعار کہنے پر مجبور ہوئے جو ان کے محسوسات سے بیگانہ ہوتے کہیں کہیں ایسے موقعوں پر ایسے عجز کا اعتراف بھی ظریف نے کر لیا ہے

ظریف ایسے زمانہ کے سب سے بڑے ظریف شاعر سمجھے گئے اور اس کچھ میں لوگ حق بجانب تھے اس لئے کہ دوسرے مزاحیہ نگار شاعر صرف ہنسنے ہنسانے کے لئے تفریح کا سامان مہیا کرتے ہیں برخلاف اس کے ظریف کا ایک مقصد ہوتا ہے اور عموماً شدتِ احساس کے بعد وہ اپنا کلام پیش کرتے ہیں اور یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ زبان اُن کی کافر تھی، دل مومن تھا یعنی مزاحیہ انداز بیان ظاہری پہلو تھا اور مقصد کلام اُن کے دردِ دل کی آواز تھی وہ ہر صحت مند شعبۂ حیات کو آباد و تندرست دیکھنا چاہتے تھے ہنسا ہنسا کر انجام کی طرف زمانہ کو متوجہ کرنا چاہتے تھے ان کی ہر دل عزیزی کا ثبوت ان بیانات اور اظہارِ تعزیت سے ملتا ہے جو ان کے مرنے کے بعد اکثر ادبی حلقوں اور اشخاص نے اُن کے غم میں بھیجے ظریف کا انتقال ۳ر دسمبر ۱۹۳۷ء کو لکھنؤ میں ہوا ان کا مجموعۂ کلام اُن کے مرنے کے بعد ۱۹۴۹ء میں "دیوان حی" کے نام سے شائع ہوا۔

## آرزو

آرزو کے جد امجد نواب تہور جاں ہرات سے اورنگ زیب کے زمانے میں ہندوستان آئے۔ اجمیر میں قیام رہا پھر ان کے پوتے نواب سیف الدین خاں اجمیر سے لکھنؤ چلے آئے غدر میں ریاست گڑھ گئی گھر لٹ گیا آرزو کے والد میر داکر حسین دل آرام کی باڑوری (لکھنؤ) میں قیام پذیر ہوئے اسی باڑوری میں ۱۲۸۹ھ میں آرزو کی ولادت ہوئی۔

پانچ سال کی عمر سے سلسلۂ تعلیم شروع ہوا۔ فارسی و عربی کی کتابیں لکھنؤ کے مشہور علماء سے پڑھیں علم عروض حکیم میر صاحب علی جلال سے حاصل کیا اور اُن ہی سے اصلاحِ سخن بھی لینے لگے بارہ برس کی سن سے شعر کہنے کا شوق ہوا۔ رفتہ رفتہ اُستاد کی توجہ اور اپنی محنت سے وہ مشق بہم پہنچائی کہ تھوڑے ہی عرصہ میں دنیائے استاد مان لیا

آرزو اردو کے اُن چند باکمال شعراء میں ہیں جن کا قلم نثر کے میدان میں بھی رواں رہتا ہے چنانچہ کئی قابلِ قدر ڈرامے مثلاً متوالی جوگن، دل علی، میراگن، شرارۂ حسن وغیرہ نثر میں آپ نے لکھے اور ایک رسالہ قواعد زبان اُردو کے متعلق نظام اردو کے نام سے بیس سال کی محنتِ شاقہ کے بعد تصنیف کیا، جو اُردو ادب میں ایک خاص اضافہ خیال کیا جاتا ہے

نظم کے میدان میں بھی آرزو نے مختلف اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کی ہے، غزل قصیدہ، مثنوی، رباعی، قطعہ، مستقل نظموں کے علاوہ سلام، مرثیے بھی بکثرت کہے ہیں جن کے دیکھنے سے موصوف کی پُرگوئی اور زبان پر حاکمانہ تصرف کا اندازہ ہوتا ہے تو جیر سے زیادہ آرزو کی ماموری کا باعث ہوئی وہ غزل ہے غزلوں میں عموماً ایک دردانگیز یاس ہے، جس کے اظہار کے لیے موصوف ایسے اثر کرنے والے الفاظ استعمال میں لاتے ہیں کہ رنج والم کے ساتھ ایک کیف بھی پیدا ہو جاتا ہے انداز بیان اور استعار کی تازگی سے کہیں کہیں میر کا پرتو نظر آجاتا ہے

شگفتہ بحر، ملائم الفاظ اور دل پذیر ترکیبوں کے ساتھ سوز و گداز کا عنصر استعار میں بہایت موثر ہو جاتا ہے زبان بہایت صاف و شیریں ہے اس وجہ سے کلام میں دلکشی بہت ہے ہندی کے مستعمل الفاظ اور فقروں سے کلام میں دل کشی پیدا کرنے کا خاص مادہ ہے جیسے ؎

وہ جھونکے سرد ہواؤں کے وہ دل کے کنول کا لہرانا

دل کے کنول کا لہراتا ایسا ٹکڑا ہے جو ایک وجدانی کیفیت پیدا کرنے کے لئے بہت کافی ہے، آرزو کی غزلوں میں باوجود متانت و سنجیدگی کے شوخی، ادا بندی اور چھیڑ چھاڑ کا بہت دلچسپ دھرہ موجود ہے

دوق کی طرح آرزو کو بھی محاورات اور ضرب الامثال کے نظم کرنے کا خاص شوق معلوم ہوتا ہے لیکن بہت اعتدال کے ساتھ اس کی بھرمار سے شعر بے لطف ہوتے نہیں پاتا بلکہ ایک لطف پیدا ہو جاتا ہے آرزو کے کلام میں رعایت لفظی کو بھی جگہ ملی ہے، جو غور کے بغیر نظر آتی ہے لیکن اس صنعت کا جو لطیف خرد ہے وہ آپ اشعار کی زینت کے لئے لیتے ہیں شوخ اور لطیف وہ عنصر سے ہمیشہ گریز کرتے ہیں ایسی صورت میں آورد کا پتہ نہیں رہتا بلکہ آمد سے دلچسپی بڑھ جاتی ہے

بے ثباتی عالم اور عدم کے جانے کو آرزو نے بہت یاس انگیز لہجہ میں دنیا کے سامنے غزلوں میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے، ایسے موقع پر وہ ناصح نہیں بنتے بلکہ ایسے ہی کو مخاطب کر کے کچھ اس انداز سے ان ہی باتوں کو کہتے ہیں کہ دل پر خاص اثر ہوتا ہے انکی غزلوں میں ایک اور چیز بھی ہے جو خاص طور پر ایسی طرف متوجہ کر لیتی ہے عالم تنہائی کا مطلب، اس کا اثر آپ ہی آپ کبھی رونا، کبھی ہنسنا سب باتیں ایسی خوبی کے ساتھ نظم ہو جاتی ہیں کہ ایسے اشعار کو بار بار پڑھیئے مگر سیری نہیں ہوتی

یہ تنقید نامکمل رہ جائے گی اگر آرزو کی خالص اردو کا تذکرہ نہ کیا جائے آرزو نے ایسی غزلیں کافی کہی ہیں جن میں وہی الفاظ اور محاورے آسکتے ہیں جو خاص اردو کے ہوں نہ عربی و فارسی الفاظ ہوتے ہیں نہ ترکیبیں، ایسی غزلوں کا کہنا کتنا مشکل ہے ظاہر ہے مگر آرزو نے بڑی فنکاری سے ایسی غزلوں کو دلچسپ بنایا ہے اس سے اور فائدوں کے علاوہ ایک یہ بھی اہم فائدہ متصور ہے کہ اردو غزل عام فہم اور ہر دل عزیز ہو جائے اور جو ہندی اور اردو میں فرق ہو چلا ہے وہ بھی جہاں تک ممکن ہو کم ہو جائے۔ ایسی

غزلوں کو آرزو نے خالص اُردو کے نام سے یاد کیا ہے اور یہ ایسی چیز ہے کہ اُردو داں تو کیا ہندی داں بھی آسانی سے سمجھ سکتے ہیں اس سلسلہ میں خالص اُردو کے نمونے کے لئے ہم ایک غزل پیش کر دینا نامناسب نہیں سمجھتے۔

رس بن آنکھوں کا ہے کہے کو ذرا سا پانی
سیکڑوں ڈوب گئے پھر بھی ہے اتنا پانی
آنکھ سے بہہ نہیں سکتا ہے بھرم کا پانی
پھوٹ بھی جائے گا چھالا تو نہ دے گا پانی
چاہ میں یاد ہیں کہاں آس کا میٹھا پانی
پیاس بھڑکی ہوئی ہے اور نہیں ملتا پانی
دل سے لوکا جو اُٹھا آنکھ سے ٹپکا پانی
آگ سے آنچ نکلتے ہوئے دیکھا پانی
کس نے بھیگے ہوئے بالوں سے یہ جھٹکا پانی
جھوم کر آئی گھٹا ٹوٹ کے برسا پانی
پھیلتے دھوپ کا ہے روپ لڑکپن کی اُٹھان
دوپہر ڈھلتے ہی اُترے گا یہ چڑھتا پانی
ٹکٹکی باندھے وہ تکتے ہیں میں اس عوت میں ہوں
کہیں کھانے لگے چکر نہ یہ ٹھہرا پانی
کوئی متوالی گھٹا تھی کہ جوانی کی اُمنگ
جی بہا لے گیا برسات کا پہلا پانی
بل بھر حل جائے گا چھالا یہ کلیجے کا چھوڑ
آگ مٹھی میں دبی ہے نہ سمجھنا پانی

رس ہی رس جس میں ہے پھر سل ذرا سی بھی نہیں
مانگتا ہے کہیں ان آنکھوں کا مارا پانی
نہ سستا اس کو حویلی رہ کے بھرے ٹھنڈی سانس
یہ ہوا کرتی ہے پتھر کا کلیجا پانی!
یہ پسینہ وہی آنسو ہیں جو پی جاتے ہیں ہم
آرزو لو وہ کھلا بھید وہ ٹوٹا پانی!

مدرم رنگ میں آپ کے دو مجموعے "جوالا آرزو" اور "دھواں آرزو" کے نام سے ہیں خالص اردو میں بھی ایک مجموعہ آپ نے "سرخی ماسہ" کے نام سے شائع کیا ہے جو تمام تر متذکرہ بالا سے دلچسپ و رواں و اصول پر مبنی ہے۔

آرزو ایک مدت سے سینما کی دنیا میں گانے اور مکالمے لکھتے تھے اور بمبئی میں قیام کر لیا تھا مگر مرنے سے پہلے کراچی چلے گئے تھے دس اپریل ۱۹۵۱ء میں انتقال ہوا

# ریاض

ریاض کے جد امجد کرماں کے رہنے والے تھے یہ پتہ نہیں کہ کب اور کیوں ان کے بزرگوار ہندوستان آئے اور حیدرآباد صلع سیتاپور ہی میں کس لئے سکونت اختیار کی بہرحال ریاض کی ولادت اسی شہر میں ۱۲۷۰ھ میں ہوئی ریاض نے ابتدائی تعلیم پیر داد سید طفیل احمد سے حاصل کی موصوف اپنے عہد کے مشہور عالم تھے

ریاض نے ابتدا میں آسر سے فیض حاصل کیا اس کے بعد اثیر کے شاگرد ہوئے ادب سے دلچسپی ان کو ابتداء زندگی سے رہی پہلے ایک اخبار "ریاض الاخبار" کے نام سے حیدرآباد سے جاری کیا پھر جب گورکھپور گئے تو ریاض الاخبار بھی وہیں سے نکالنے لگے ملک ان کے ساتھ دستہ

وعظ قصہ بھی نکالنے لگے ان اخبارات میں ریاض کا کلام بھی شائع ہوتا رہا جو ان کی شہرت کا خاص باعث ہوا

ریاض نے گورکھپور کو دل سا لیا تھا زندگی کا زیادہ حصہ یہیں گزرا اس سرزمین نے بھی داد و دہائی طرح دی ان کے مرنے کے بعد ان کا مجموعۂ کلام "ریاضِ رضواں" کے نام سے بڑی آب و تاب کے ساتھ شائع ہوا

ریاض کا کلام شروع سے آخر تک شباب کی رنگینیوں اور حسن و عشق کی عملی زندگی کی داستان ہے کہیں معشوق سے چھیڑ چھاڑ ہے تو کہیں پیر مغاں و ناصح سے دل لگی کبھی کسی کی اداؤں کا پُر لطف ذکر ہے تو کبھی کسی لمبی ڈاڑھی والے کی ہجو بلیغ غرض کہ ریاض ہر وقت سرشار معلوم ہوتے ہیں وہ رندِ ازل سے ایسا دل لے کر آئے تھے جس کو بہار حسن کی دلچسپیوں سے کبھی سیری نہ ہوئی ریاض نے دنیائے عشق میں عاشقِ ستم زدہ بن کر کبھی نہیں زیادہ کیا دل پر اگر کبھی گہری چوٹ لگی ہے تو اس کا اظہار آہ و فغاں سے نہیں کیا بلکہ ایک معنی خیز تبسم سے اور ایک ایسی ادا سے کہ معشوق کو خود پیار آجائے وہ معشوق کی خوشامد بہت کم کرتے تھے بلکہ کبھی کبھی تو خود رُوٹھ جاتے ہیں کہ کوئی گدگدا کے ہنسا کے منالے

یہ سچ ہے کہ ریاض کے کلام میں سوز و گداز نہیں مگر اس کا کیا جواب کہ اس عصر کے بجائے ان کے کلام میں کیف و سرور کی ایک لہر پڑھنے والے کے دل کو ہر وقت سرشار کئے رہتی ہے جس کی وجہ سے انسان مرا آجاتا ہے کہ شاید ریاض کو "میکدہ والی" سے بھی مل کر نہ آتا ہو ریاض کا یہ ایک خاص کارنامہ ہے کہ انھوں نے معشوق کے کردار کو اسی کے الفاظ حرکات و سکنات سے اپنے اشعار میں اس خوبی سے دکھایا ہے کہ پورا نقشہ ایک پُر لطف طریقہ سے پیش نظر ہو جاتا ہے اور پھر یہ بھی قابلِ داد مذاق ہے کہ ایسے موقعوں پر باوجودے ناکی و شوخی کے متانت کا دامن عارِ ارِ اسدال سے مجروح نہیں ہونے پاتا شراب اور اس کے متعلقات پر قریب قریب ہر شاعر نے کچھ نہ کچھ لکھا ہے

مگر ریاض نے اس خوبی سے اس موضوع پر طبع آزمائی کی ہے کہ اُن ہی کا حصہ ہو گیا ہے جب کبھی وہ میکدہ کا ذکر کرتے ہیں تو اس انداز سے کہ لفظ لفظ سے سُرور ٹپکا پڑتا ہے یہاں ان کا ہر قدم سراپا متوالی چال ہے طرزِ بیان سے وہ سماں پیدا کر دیتے ہیں کہ ساقی صراحی سبو پیر میکدہ، بلکہ در و دیوار تک مست نظر آتے ہیں اور وہ مزہ تو کبھی نہیں بھول سکتا جب وہ شراب کو کبھی میکدہ والی، اور کبھی "وہ" کہہ کر اس کا پتہ دیتے ہیں، گویا ایک معشوق ہے کہ جس کا نام صرف اشاروں سے بتایا جاتا ہے ریاض کا طرزِ اسلوب عالی ہے کہ وہ پی کر کبھی سرشار یا مدمست نہیں ہوتے یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ کسی ایسے شخص کا نتیجۂ فکر ہے کہ جو سرمستی میں از خود رفتہ ہو گیا ہے اور آپ کو بھی اتنی پلا جاتا ہے کہ آپ بھی باہوش نظر آئیں

ریاض کے تمام کلام کو پڑھ کر ایک خاص بات آپ کو نظر آئے گی کہ اُن کا معشوق متوالی یا خیالی نہیں، یہ ان کا عشق غیر معمولی انسان کا عشق ہے وہ ایسے معشوق کو ایک حسین اور دلچسپ ہستی سمجھ کر پیار کرتے ہیں یہ اس کو سراپا ظالم بیان کرتے ہیں، نہ اتنا بلند کر دیتے ہیں کہ گدایانہ شان سے بھی آستاں پر گزر نہ ہو سکے وہ اُسے ایسے پیار کا ایک شخص لطیف سمجھتے ہیں جس سے شوخی، چھیڑ چھاڑ، ہنسی، مذاق سے پوری دل لگی حاصل کر سکیں وہ اس پر فقرے بازی بھی کرتے ہیں، اس کو طنز سے کبھی کبھی سرمست کر کے محظوظ ہوتے ہوئے بھی دیکھنا باعثِ لطف سمجھتے ہیں اور کبھی کبھی اس سے آتش کی طرح بگڑ بھی جاتے ہیں نتیجہ یہ ہے کہ ان کے کلام میں ایک خاص قسم کی شوخی، پُر لطف طنز، مزے دار تمسخر اور عجب تلخیاں اور حقیقت آمیز معاملات کی دنیا نظر آتی ہے

# اصغر

اصغر کا اصلی وطن گورکھپور کے ضلع میں تھا لیکن آپ کے والد سلسلۂ ملازمت میں اتنے عرصۂ دراز تک گونڈہ میں رہے کہ لوگ اصغر کو گونڈوی کہنے لگے۔ اصغر ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت معمولی اور غیر مستقل طور پر ہوئی۔ کچھ دنوں انگریزی مدرسوں میں تعلیم پاکر اسکول چھوڑ دیا۔ انٹرنس کے امتحان کے لئے ساری کوششیں اور پرچہ نویسیوں کی وجہ سے امتحان نہ دے سکے۔ تاہم اس تھوڑی سی مدت میں فطری صلاحیت کی وجہ سے اتنی استعداد پیدا ہوگئی کہ انگریزی کی ادنیٰ کتابوں کا کافی لطف اٹھا سکتے تھے۔ یہی حال عربی اور فارسی کا تھا جو کچھ قابلیت انھوں نے پیدا کی وہ صرف اُن کے ذاتی مطالعۂ کتب اور غور و فکر کا نتیجہ تھی۔

اصغر ابتدا میں اپنا کلام مسیح علیل احمد وجد ملگرامی کو دکھاتے رہے بعد میں کچھ عرصہ مسیح امیر اللہ تسلیم کو دکھایا۔ اخلاقی حیثیت سے اصغر ایک نہایت قابلِ قدر آدمی تھے باوجود زہد و تقویٰ کے مزاج میں رنگینی اور ظرافت کا عنصر کافی تھا۔ بادۂ تصوف کے خاص طور سے خواستگار تھے۔ چنانچہ ان کو قاضی شاہ عبدالحی سے شرف بیعت حاصل تھا۔ عرصہ تک آپ کا قیام الہ آباد میں بسلسلۂ ملازمت رہا۔ ہندوستانی اکیڈیمی کے رسالہ ہندوستانی کے ایڈیٹر عرصہ تک رہے۔

اسلوب بیان کے لحاظ سے اصغر سبھوں سے الگ ہیں اور اس میں شک نہیں کہ جہاں تک زبان و بیان و خیال کا تعلق ہے اتنا غیر تقلیدی اور نرالے انداز کا غزل کا نمونہ اردو میں کیا ہے۔ ممکن ہے کہ اس دشوار گزار راہ میں کہیں کہیں شاعر کے قدم ڈگمگا گئے ہوں لیکن ان کے کارنامے کی اہمیت اور اس کی دردو مسرت اس سے کم نہیں ہو سکتی۔

اصغر بہت کم گو اور دقت پسند شاعر تھے۔ اتنا کم کہنے پر بھی اہلِ نظر کو اپنی طرف خاص طور پر متوجہ کر لینا اس بات کی کافی دلیل ہے کہ ان کے کلام میں قابلِ قدر چیزیں کافی ضرور ہیں۔

دوسرا دور یعنی "نشاطِ روح" اور اس کے بعد کا کلام ان کی ابتدائی شاعری سے بالکل الگ ہے۔ اُن کی پرانی شاعری میں تقلید و تتبع کا عنصر غالب ہے لیکن نشاطِ روح سے عنصرِ تقلیدی رنگ کا آغاز ہوتا ہے جو اصغر کی امتیازی خصوصیت ہے جس شعرا نے امیر و داغ و جلال کے بعد اردو غزل میں نئی روح پھونکی وہ صفی، محشر، عزیز اور تاثر ہیں۔ ان حضرات نے سنجیدگی، پیرایۂ ترنم اور معنویت کے لحاظ سے غزل کو اتنا بلند کر دیا کہ اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا لیکن "تنگنائے غزل" کی وسعتیں لامحدود ہیں۔ ان سے ایک جادوئیت کی وجہ سے اصغر، جگر، فانی، فراق کو اس طرف رجوع کیا تاکہ ان کے علاوہ کچھ اور ہاتھوں کا اضافہ کریں، چنانچہ طرح یہاں میں رہا۔ تو ان شعرا نے بالکل نئی روش اور نیا لب و لہجہ اختیار کیا

اصغر کے کلام میں سب سے پہلی چیز لب و لہجہ کی وہ وحدت آمیز رنگینی ہے جو پڑھنے اور سننے والوں کو ایک سوگوار طرز سے بھیر کر متاثر کر دیتی ہے۔ دوسری چیز سکون اضطراب کی وہ معتدل آمیزش ہے جو ایک خاص کیف پیدا کر دیتی ہے۔ اکثر ایک لطیف ترنم اور دل کشی بھی کلام میں پائی جاتی ہے

اصغر کی غزلوں میں عاشق و معشوق کے باہم اختلاف اور ٹھیٹ انسانی جذبات تو بہت کم ملتے ہیں لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ موجودہ غزل گوئی میں اس چیز کا قریب قریب فقدان نظر آتا ہے۔ چنانچہ اصغر کے یہاں بھی یہی چیزیں مختلف عنوان سے جلوہ گر ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان خیالات اور تجربات میں ایسے معانی میں ڈھونڈتے ہیں جو ایک لطیف نوعیت رکھتے ہیں

سامنے کی باتیں ہوں یا عام واردات قلبی ہوں ان سب کو اصغر بیان کر کے ایک خاص انداز سے بیان کر دیتے ہیں جس سے کلام میں ایک لوچ اور ندرت پیدا ہو جاتی ہے ایسے اشعار باریک نشتر کی طرح دل میں اُترے تو ضرور ہیں اور دل کو زخمی بھی کرتے ہیں لیکن دل کو چھیڑتے اور گدگداتے ہوئے بھری ماورائی فضا میں محو ہو جاتے ہیں جہاں سے عالم بالا پیدا ہوتے تھے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ انسان ہمیشہ دل پر چوٹ کھانے کے لئے سینہ سپر بھی نہیں رہتا بلکہ ان میں بھی اُسے ایک خاص لطف آتا ہے اور تیر نشانے کو چھوتا ہوا مُڑ کر نکل جاتا ہے

اصغر کے پورے کلام میں ایک نشاط اور سرمستی ہے جو ایک وجدانی کیفیت پیدا کر دیتی ہے اور بعض اوقات وہاں ہوتے وہ عشق کی منزلیں طے کر جاتے ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ کہا ہے ؎

غزل کیا اک شرارِ معنوی گردش میں ہے اصغر
یہاں انسوس گنجائش نہیں فریاد و ماتم کی

اصغر کے کلام میں فلسفیانہ تحمل حقائق و معارف کے رموز شعریت لئے ہوئے نہایت خوبی کے ساتھ جگہ پاتے ہیں عام کلام میں خیالات کی نازکی، مناسبت و لطافت کا پہلو لئے ہوئے ہے اور یہ خصوصیت ان کی فارسی ترکیبوں سے بہت زیادہ نمایاں اور دل آویز ہو جاتی ہے اصغر کے وہ اشعار خاص طور پر دلکش ہوتے ہیں جن میں "عبوری روح" اشیاء یا کیفیات مجردہ کو روح فرض کر لیا جاتا ہے۔

اصغر تشبیہ و استعارے میں خاص کاوش کرتے ہیں عامیانہ و فرسودہ چیزوں سے گریز کر کے نہایت غور و خوض کے بعد ایسی لطیف و دلآویز چیزیں پیدا کرتے ہیں کہ بعض لحاظ سے اسے دور حاضرہ ادب میں ایک اضافہ سمجھا جا سکتا ہے

اصغر کا انتقال ۱۹۳۶ء میں الہ آباد میں ہوا اور یہیں دفن ہوئے

# جگر

نام علی سکندر ہے وطن مراد آباد ہے ۱۸۹۹ء میں پیدا ہوئے بزرگوں کا وطن دہلی تھا آپ کے مورث اعلیٰ مولوی محمد سمیع شاہجہاں کے اُستاد تھے لیکن عتاب شاہی کی وجہ سے دلی چھوڑ کر مراد آباد آ بسا اور وہیں کے ہو رہے۔ عرصے سے اس خاندان میں علم کا چرچا تھا جگر کے والد مولوی نظر علی بھی شاعر اور صاحب دیوان تھے۔ خواجہ وزیر لکھنوی کے شاگرد تھے

جگر کی ابتدائی تعلیم و تربیت نہایت معمولی ہے عربی سے بالکل ناواقف ہیں فارسی یوسف زلیخا اور سکندر نامہ تک دیکھی ہے انگریزی بھی بہت کم جانتے ہیں

جگر نہایت شگفتہ مزاج اور رنگین طبع آدمی ہیں ایک عمر تک حسن مجازی کی تلاش و جستجو میں مختلف مقامات کی سیر کرتے رہے یہی وجہ ہے کہ وہ حسن کی ایک داستان سے واقف ہیں اسی سیر و سیاحت کے سلسلے میں آگرہ میں پانچ چھ برس تک مقیم رہے۔

جیسا اوپر بیان ہوا ہے جگر کو شاعری ترکہ میں ملی بچپن ہی سے اس کا شوق ہوا ۱۳ ۱۴ برس کے سن سے شعر کہنا شروع کر دیا ابتدا میں اصلاح اپنے والد سے لیتے رہے ان کے بعد داغ کو کلام دکھانے لگے اور داغ کے بعد منشی امیر اللہ تسلیم کو کئی غزلیں دکھلائیں

جگر کی قدیم شاعری پر سب سے زیادہ داغ کا رنگ نظر آتا ہے شوخی، معاملہ بندی، الفاظ کی تکرار، معشوق کا سراپا اثر پذیر الفاظ میں بیان کرنا، یہ داغ کے پرتو فیض کا نتیجہ ہیں جگر نے بہت خوبی سے ان چیزوں کو اپنے کلام کا جزو بنا لیا ہے یہی نہیں کہ یہ خصوصیت دنیاوی حسن و عشق کے واقعات تک محدود ہو بلکہ حقائق و معارف کو بھی نہایت کیف آور و پُرمعنی طریقے سے بیان کر کے کلام کی تاثیر کو بڑھا دیتے ہیں

جگر کی شاعری میں کیف و رنگینی اور بے خودی کی لہر قریب قریب ہر جگہ ہے جو کلام میں ایک امتیازی شان اور شاعر کے انہماک، ذوق و جوشِ فکر کا پتہ دیتی ہے اُن کی آنکھیں حسن کی ادا شناس ہیں اور ان کا دل لذتِ عشق کا سرمایہ دار ہے جس کے اثر سے کلام میں رنگینی و دلکشی کا ایسا اضافہ ہو جاتا ہے جس سے پڑھنے والے پر ایک خاص محو یت طاری ہو جاتی ہے

جگر کو محبت سے محبت ہے وہ اس شراب سے اس قدر سرشار ہیں کہ کبھی کبھی اپنے کو خود معشوق سمجھنے لگتے ہیں کبھی کبھی مونس کی طرح معشوق سے طنزیہ گفتگو کر کے اس کو چھیڑ دیتا بھی اپنا اک خوشگوار فرض خیال کرتے ہیں آپ کے کلام میں جہاں کہیں درد ہے اس میں حسرت کا پہلو بھی شامل نظر آتا ہے جس سے تاثیر کے ساتھ ایک وجدانی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور دل پر ایک ایسی چوٹ لگتی ہے جو اسی جگہ پر خود پر لطف ہوتی ہے

جگر کے کلام کی ایک نمایاں خصوصیت سادگی و روانی ہے وہ ثقیل الفاظ کبھی استعمال نہیں کرتے جو فارسی ترکیبیں کام میں لاتے ہیں وہ عموماً مناسب اور دل نشین ہوتی ہیں جس سے روانی اور لطف میں اضافہ ہو جاتا ہے، محاورات کے بامحل صرف سے کلام میں برجستگی اور ایک خاص مزہ پیدا کرتے ہیں جگر کو یہاں اچھا سلیقہ ہے "داغِ جگر" کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جگر کو رعایتِ لفظی اور ہوٹ کا کتنی کسی قدر چسکا ہے

الفاظ کی تکرار سے وہ اپنے اشعار میں لطف پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس میں سبک بھی ہیں کہ عموماً کامیاب ہوتے ہیں لیکن کبھی کبھی یہ تکرار بھدی اور زائد بھی معلوم ہوتی ہے لیکن یہ سب حسن اُن کے موجودہ کلام میں بہت کم ہو گئی ہیں اُن کا رجحان اب زیادہ تر مضمون و معنی کی طرف ہے

جگر کا موجودہ رنگِ شاعری پرانی شاعری سے کسی قدر الگ ہے "شعلۂ طور" (دوسرا دیوان) "داغِ جگر" سے بحیثیتِ مجموعی بہتر ہے، اس میں زیادہ متانت اور رنگینی ہے تخیل میں بھی پہلے سے زیادہ بلندی ہے حقائق و معارف کے مسائل اکثر بڑی خوبی اور

شدد مدسے ات بات میں مسطرِ عام پر آگئے ہیں یہاں میں فارسیت زیادہ آگئی ہے کہیں کہیں تو پورے مصرعے فارسی کے ہو گئے ہیں

جگر نے عمیق مضامین کی تلاش میں قابلِ قدر کوشش کی ہے لیکن کہیں الفاظ ان کے مفہوم کو پوری طرح واضح کرنے میں قاصر نظر آتے ہیں اور پُر گوئی کی وجہ سے خیالات میں تکرار آگئی ہے

# سائل دہلوی

سراج الدین احمد خاں نام، سائل تخلص تھا ولادت ۱۸۶۸ء اور وفات ۵ ستمبر ۱۹۴۵ء میں ہوئی آپ کا خاندان دہلی کا قدیم و صاحبِ اعزاز خاندان تھا سائل نے اپنی تعلیمات و وضعداری سے خاندانی وقار کو قائم رکھنے کی کامیاب کوشش کی انسانیت کے لحاظ سے وہ نہایت خوش اخلاق و پُر خلوص آدمی تھے

سائل کو مرزا داغ دہلوی کی دامادی کا بھی شرف حاصل ہے جس کا اظہار وہ بار بار کرتے ہیں داغ ہی سے کلام پر اصلاح بھی لی تھی اپنی قابلیت اور استاد کی شفقت سے بہت جلد خود اُستاد ہو گئے غزل کو حُسن و عشق کے لطیف مضمون تک محدود رکھا۔ رہ تو فلسفہ کے دقیق مضامین نظم کرنے کی فکر کی ہے اور نہ تصوف کے پیچیدہ مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی ہے، ایک صاحبِ دل کی طرح دنیائے محبت میں قدم رکھا اس کے مارد پیار کو دیکھ کر خاموشی سے مضمون لیا اور اثر لینے والی طبیعتوں کے سامنے نہایت مزے کے ساتھ بیان کر دیا۔

سائل کی غزلوں میں شوخی اور لطافت ساتھ ساتھ ہیں کلام شگفتگی اور انبساط کا مخزن ہے مگر اعتدال اور عامیانہ پن سے کوسوں دور، معنوی سے چھیڑ چھاڑ بھی ہے

لیکن حفظ مراتب کے ساتھ جہاں اشعار مرے دار گفتگو کا مرقع پیش کرتے ہیں وہاں دل کشی کی حد نہیں رہتی اُن کی پُرگوئی کا یہ عالم تھا کہ سخت سے سخت زمین میں بہت سے شعر کہہ دیتا معمولی بات تھی استادی کا یہ حال تھا کہ جس مضمون کو چاہتے نہایت خوبصورتی سے عاشقانہ رنگ میں رنگ دیتے تھے شعر کی مضمونی اور الفاظ کے دار و بست کا خاص طور پر خیال رکھتے تھے۔

سائل کی زبان کا کیا کہنا، پُرانی دلی کی شستہ اور شیریں زبان کا مکمل نمونہ ہے نہ کبھی ثقیل الفاظ لاتے تھے اور نہ کبھی بے لطف ترکیبیں اس وجہ سے روانی اور لطف میں کمی نہیں ہوئے پاتی اس زمانہ میں کم لوگوں کو محاورات برتنا عبور ہوگا جتنا سائل کو تھا، ان محاوروں کا بامحل صرف مصرعوں کو نہایت مزے دار بنا دیتا ہے

مومن کی طرح سائل بھی اپنے تخلص سے اکثر فائدہ اٹھاتے ہیں خوبی اس بات کی ہے کہ ہر جگہ لطف قائم رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ رعایت لفظی کی تکرار ایسی یا اتنی نہیں ہوئے پاتی کہ سننے والوں کو اُلجھن ہو جائے بلکہ ہر جگہ ایسے مزے کے ساتھ سائل کا لفظ آتا ہے کہ ایک سا لطف پیدا ہو جاتا ہے حالانکہ کلام میں کہیں کہیں سقوط بھی ہے، لیکن اس حسن کے ساتھ کہ اس کا کھٹکا پن تکلیف دہ نہیں ہوتا بلکہ ایسے موقع پر صفائی اور مزے کی آمیزش ایک لطافت کی صورت اختیار کر لیتی ہے افسوس کہ اب تک آپ کا دیوان شائع نہیں ہوا، حالانکہ کلام کی ضخامت اتنی ہے کہ ایک کیا کئی دیوان تیار ہو سکتے ہیں چونکہ آپ کا کلام ابھی تک مستقل کتاب کی صورت میں نہیں ہے اس لئے ہم یہاں چند غزلیں اور اشعار نمونہ کے طور پر نقل کئے دیتے ہیں

وفا کا بندہ ہوں، اُلفت کا پاسدار ہوں میں
جفا کی دیر دامنہ و ہزار ہوں میں
جس میں حسن کے ہم نغمہ ہزار ہوں میں
ادا سے تیر لگا دے کوئی شکار ہوں میں

خدا جانے نظر آتی ہے جلوہ کی تاثیر
قرار ہو گیا موسیٰ کو بے قرار ہوں میں

خمار حس سے نہ واقف ہو وہ سرور ہیں آپ
سرور حس سے نہ آگہ ہو وہ خمار ہوں میں

سما گیا ہے یہ سودا عجیب سر میں مرے
کرم کا اہلِ ستم سے اُمیدوار ہوں میں

عوض دوا کے دعا دے گیا طبیب مجھے
کہا تو میں نے غمِ ہجر سے دوچار ہوں میں

ستم بات کر دیا میرا تباہ اُلفت نے
جہاں کے ہاتھ کی لوٹی ہوئی بہار ہوں میں

قرار دادِ گریباں ہوئی یہ دامن سے
کہ پُرزے پُرزے اگر تو ہو تار تار ہوں میں

مرے مزار کو سمجھا نہ جائے ایک مزار
ہزار حسرت و ارماں کا خود مزار ہوں میں

ن

رفیق کرتے ہیں ارادت کیوں مخلص پر
ہنر کو چھوڑ کے نسبت سے باوقار ہوں میں

طہیر و ارشد دعا کا ہوں جگر گوشہ
حساب داغ کا تلمیذ و یادگار ہوں میں

امیر کرتے ہیں عزت مری ہوں وہ سائل
گلوں کے پہلو میں رہتا ہوں اسا خار ہوں میں

فصلِ گل اب آگئی وحشت کا ساماں دیکھئے
سنگِ طفلاں دیکھئے، عارِ بہ ساماں دیکھئے

اشک خونیں کی بہاریں نوک ماحس دیکھئے
دیکھنا ہے آپ کو میرا گریباں دیکھئے

دعوئے آہن گداری میرا گر باور نہیں
تیر کچھ دل میں چبھو کر اُن کے پیکاں دیکھئے

کیوں کسی سے پوچھئے خسرو سری کا ماجرا
قفل کھلوا کر درِ دیوارِ زنداں دیکھئے

عزۃً اہلِ ورع کو دیکھئے گا تا کجا!
اب گنہگاروں کا رنگِ شرمِ عصیاں دیکھئے

ایکساں ہیں جوہرِ اہلِ سکوں و اہلِ درد
صورتِ ملسل ۔ نکہتِ گل کو پریشاں دیکھئے

ناخنوں سے ملتمس ہوں توڑ کر تارِ قفس
کار فرمائے جنوں سعیِ رگِ جاں دیکھئے

جائے آسیب ہستی سے اُسی کو مطمئن
ذرّہ ذرّہ خاک کا جس کی پریشاں دیکھئے

کھل گیا عیبہ کا جامہ پھٹ گیا مُنسل کا دل
آگیا عہدِ درازیٔ گریباں دیکھئے

جامہ ریبی جسم ہے سودا نہانِ عشق پر
اختصارِ دامن و طولِ گریباں دیکھئے

صاص[1] و گلش[2] کے در کو جو اک کر ساتی بحیر
نوح[3] کے اشعار کا پر جوش طوفاں دیکھئے

ہمیں کہتی ہے دیا رحم دل زخم جگر والے
ورا تم بھی لو دیکھو تم بھی ہو آخر نظر والے

یہ لسو پیغام بر یہ ما سح پیام تھا
اس نا ملکی تھا آما آج اس کو کام تھا
محتسب تسبیح کے دانوں پہ گنتا رہا
کس نے پی کس نے پی کس کس کے آگے جام تھا
اہل محشر دیکھ لو اقبال کو تو سحار لو
بھولی بھالی شکل تھی اور کچھ بھلا سا نام تھا

# یاس دیگانہ

مراد احمد حسین پہلے یاس تخلص کرتے تھے بعد میں یگانہ ہو گئے آپ کے جد امجد ایران سے ہندوستان آئے اور سلطنت مغلیہ کے دامن سے سلسلۂ سرگرمی وابستہ ہوئے پرگنہ جھانسی عظیم آباد میں جاگیر میں ملی اور وہیں سکونت پذیر ہو گئے

۱۸۳۳ء میں مراد احمد کی ولادت عظیم آباد کے مشہور و معروف محلہ مغلپورہ میں ہوئی مرزا یگانہ کی ابتدائی تعلیم وطن ہی میں ہوئی جو فارغ التحصیل ہو کر لکھنؤ آئے

---

[1] پروفیسر سید صاص علی صاحب ۔ اہل صاحب الدآباد میں ہمیشہ آپ ہی کے یہاں مہمان ہوتے تھے
[2] دیوان رادھے ماتھ کول گلش جن کے متعلق یہ عرض کی گئی
[3] نوح ناروی

استاد مولوی سید علی خاں بیتاب سے اصلاحِ سخن لینے لگے کچھ دنوں کے بعد مرزا صاحب کو حضرت بیتاب نے اپنے استاد مولانا شاہ عظیم آبادی کے سپرد کر دیا جن کے فیضِ صحبت نے سب سے زیادہ مرزا صاحب کی دماغی نشو و نما میں مدد پہنچائی

۱۹۴۷ء میں یگانہ مٹیا برج کلکتہ تشریف لے گئے اور وہاں ایسے بیمار پڑے کہ امیدِ زیست بھی باقی نہ رہی علاج کے لیے لکھنؤ آئے اور ایسے آئے کہ اچھے ہو کر بھی یہاں سے جانا گوارا نہ کیا بلکہ اسی کو اپنا وطن بنا لیا اور یہیں ایک معزز گھرانے میں شادی کر لی یگانہ کا لکھنؤ میں قیام کرنا نہایت ہنگامہ خیز ثابت ہوا جس کا اثر ان کی شاعری پر بھی پڑا ایک وقت میں لکھنؤ کے اکثر شعراء سے اور یگانہ سے سعرو شاعری کے سلسلے میں بے لطفی ہو گئی افسوس اس کا ہے کہ اس جنگ کا خمیازہ مرزا غالب کو بھگتنا پڑا کچھ ایسے اسباب ہو گئے کہ یگانہ مرزا غالب سے بھی خفا ہو گئے اور ایسے خفا ہوئے کہ آج تک دل سے غبار نہ گیا کبھی کبھی اپنے اشعار اور مصرعوں میں اب تک ان کو ایسے الفاظ سے یاد کرتے ہیں جن کو سن کر اہلِ ایمان کو حیرت ہوتی ہے

یگانہ کی شاعری میں جو چیز سب سے پہلے دل پر اثر کرتی ہے وہ زورِ کلام ہے سادگی کی جستجو کے علاوہ ایک مصرعوں کے لئے ایسے الفاظ لانے میں جو پوری طرح مفہوم کو ذہن نشین کرا دیں اور خیال کو اُبھار دیں دوسری چیز جو آپ کے کلام میں دلکشی پیدا کرتی ہے وہ "طنز" ہے یہ عنصر کہیں کہیں اشاریہ اور سکھلانے کے زور پر یاں کا لطف دوبالا کر دیتا ہے

یگانہ کے کلام میں تخیل کی بلندی اور ذہن کی پرواز نمایاں ہے وہ حقائق و معارف کو خیالات کے عالمِ بالا سے چُن کر لاتے ہیں اور بہت صفائی کے ساتھ اشعار میں پیش کر دیتے ہیں معنی و مطلب آسانی سے سمجھ میں آجاتے ہیں الفاظ اور ترکیب کی پیچیدگی میں مفہوم اُلجھے نہیں یا ایسے عموماً جس کو کسی ذات میں تصور کر کے اس کے اثرات نہیں بیان کرتے بلکہ جس کو سراپا تجسم ایک مستقل ہستی سمجھ کر خیالات کا اظہار کرتے ہیں جس سے بیان

میں ندرت اور اشعار میں معنویت بڑھ جاتی ہے کلام میں زیادہ تر ہمت افزائی اور حوصلہ کی لہریں نظر آتی ہیں مصیبتوں میں گھر جانے رہنے یہی پیام ملتا ہے کہ ہمت نہ ہارنا چاہیئے ان کے یہاں یاس کے مضامین بھی ملتے ہیں مگر بہت کم ایسے موقع پر اکثر وہ انسانی کمزوریوں کا ذکر نہیں کرتے بلکہ "فطرتِ محسور" پر طنز کرتے ہوئے حسرت کے ساتھ اپنی بے بسی پر ہاتھ ملتے ہیں

یگانہ کا کلام صفائی اور بے باکی کے اعتبار سے آتش کے کلام کا اکثر دوآتشہ معلوم ہوتا ہے خیالات میں آتش کے کلام سے زیادہ بلندی ہے مگر کیف و سرمستی کا وہ عالم نہیں جو خواجہ آتش کے یہاں ہے حسن و عشق کے وہ وارداتِ جو محبت کی عملی زندگی میں پیش آتے ہیں ان کی بہت کمی آیات وجدانی (دیوانِ یگانہ) میں نظر آتی ہے جس کی وجہ سے ایک گونہ دلچسپی میں کمی ہو گئی ہے۔ بلند خیالی کی تلاش نے تغزل کا عنصر کافی نہیں پیدا ہونے دیا۔ بلکہ جوش اور مدرسہ بیان نے غزلوں میں بھی ایک حد تک نظم کا انداز بیان پیدا کر دیا ہے

یگانہ فارسی ترکیبوں کے دل دادہ ہیں اکثر تشبیہوں کی جدت سے طرز بیان میں تازگی پیدا ہو جاتی ہے زبان صاف و شیریں ہے زیادہ تر فارسی و عربی کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں مصرعے بہایت چست ہوتے ہیں سلاست الفاظ سے اشعار میں ایک خاص اُبھار پیدا ہو جاتا ہے

رباعیات میں یگانہ نے ایک اجتہاد کی کوشش کی ہے کہ اور شعراء سے اُن کا رنگ الگ ہو جائے مگر قول عام میں رکاوٹیں اس درجہ سے پیدا ہوئیں کہ الفاظ اور محاورے ایسے آگئے ہیں جو ترشے ہوئے نہیں ہیں اور جن پر زبان کی صفائی نے ابھی تک جلا نہیں کی (یا یوں سمجھیے کہ جس کو انگریزی میں سلینگ (SLANG) کہتے ہیں) اُردو میں سلینگ کا استعمال ابھی تک بہت کم ہوا ہے غالباً اکبر الہ آبادی اور طریف لکھنوی کے علاوہ اس کی نمایاں مثال

اور کہیں نہ ملے گی یگانہ کے "سلیقہ" میں اور اکبر و ظریف کے سلیقہ میں یہ فرق ہے کہ یگانہ کا مقصد محض ظرافت و تفریح نہیں ہے بلکہ روزمرہ بات کہنا ہے اور ادبی طور پر غیر مستعمل الفاظ و محاورات کی پذیرائی کے امکان کو نمایاں کرنا ہے حملہ باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے بھی یہیں رکھنے میں مائل ہے کہ یگانہ کی رباعیاں ہر لحاظ سے کامیاب ہیں

# فراق

رگھوپتی سہائے فراق گورکھپور کے رہنے والے ہیں وہیں ۱۸۹۶ء میں پیدائش ہوئی آپ کے والد منشی گورکھ پرساد عبرت مشہور وکیل اور اچھے شاعر تھے

فراق کی ابتدائی تعلیم گھر پر اردو سے شروع ہوئی، سات سال کے تھے کہ انگریزی تعلیم کے لئے اسکول میں داخل کر دیئے گئے ایسی وجہ سے ہر درجہ میں ممتاز کامیابی حاصل کرتے رہے بی اے میور سنٹرل کالج الہ آباد سے امتیاز کے ساتھ پاس کیا گورنمنٹ نے ڈپٹی کلکٹری کے لئے منتخب کر لیا مگر قبل ڈپٹی کلکٹری کے آپ کانگریس میں شریک ہو گئے اور تحریک ترک موالات کو قبول کر لیا پھر کے خود جیل چلے گئے

فراق کا دور شاعری اس وقت زیادہ بڑھا جب وہ الہ آباد تحصیل علم کے لئے آئے یہاں کی فضا میں رہا ہوا شاعری چھڑا دیکھا تو خود شعر کہنے کی امنگ دل میں پیدا ہوئی اور اس کے چرچے اور پروفیسر ناصری کی دلکش صحبتوں نے فراق کے دل میں دبی ہوئی آگ کو روشن کر دیا جب بی اے کلاس میں آئے تو پہلی بار آپ نے غزل لکھ کر ناصری کی خدمت میں بغرض اصلاح پیش کی ناصری نے نہ صرف غزل پر اصلاح دی بلکہ اردو شاعری اور اس کے اصول پر باقاعدہ لکچر دیئے جو فراق کی راہ شاعری میں شمع ہدایت ثابت ہوئے چند دنوں کے بعد ناصری صاحب کی صحبت نہ رہی اور آپ نے وطن حیرآباد میں سے

اصلاح لینا شروع کی

شعر و شاعری کا چسکا اب گویا فراق کے دم کے ساتھ تھا جیل جانے گئے تو وہاں بھی یہ سلسلہ جاری رہا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ یہ جیلخانہ شعر و شاعری کا مدرسہ ہو گیا' یہاں نہ صرف شعراء سے ملاقات ہوئی بلکہ علم دوست احباب سے برابر صحبتیں رہیں مدآح عارف ہسوی حکیم آشفتہ' مولانا محمد علی' حسرت موہانی' مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ کی آئے دن کی صحبتوں نے برم سخن کی گرم بازاری میں اور زیادہ مدد کی ایک غزل میں کہتے ہیں ؎

اہل زنداں کی یہ محفل ہے جب اس کا فراق
کہ بکھر کر بھی یہ شیرازہ پریشاں نہ ہوا

۱۹۲۷ء میں جب فراق جیل سے چھوٹ کر آئے تو کرسچین کالج لکھنؤ میں ملازم ہو گئے' پھر اس کے بعد ساتھ دھرم کالج کان پور نے اردو پڑھانے کے لئے بلا لیا اس درمیان میں آپ نے ایم۔ اے پاس کر لیا اور الہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی کے لیکچرر مقرر ہو گئے اب آپ کا مستقل قیام الہ آباد میں ہے

فراق کی ابتدائی غزلوں میں امیر مینائی کا رنگ جھلکتا ہے لیکن اس سے دور بعد میں عزیز و صفی کا رنگ نظر آتا ہے کچھ عرصہ کے بعد میر کے کلام کا فراق پر اثر پڑا اور اس کی تقلید کرنے لگے مگر اب موجودہ حالت میں ان کا خود ایک رنگ ہو گیا ہے جس میں الفاظ کی تلاش فقروں کی برجستگی اور مضمون و بیان کی ہم آہنگی خاص طور سے نمایاں ہیں ان کی غزلوں میں اکثر کیفیات کا تدبر' محسوسی حیات کے اظہار رسا سعی' غم انگیز پہلو کی ترجمانی قابل دید ہے جذبات نگاری میں وقت فکر کا عنصر شامل کر کے فراق نہ صرف تاثیر کلام میں اضافہ کر دیتے ہیں بلکہ معنویت بھی ملتی نظر آتی ہے ان کی نظر جذبات نگاری سے گزر کر کبھی کبھی جذبات کی نفسیات و حقیقت پر بھی پڑتی ہے خود اردو ادب میں ایک خاص چیز ہو جاتی ہے اور اس کا سرچشمہ معنوی ادب خاص کر ڈرامہ و ناول وغیرہ کا مطالعہ ہے

غزلوں کے علاوہ فراق نے نظمیں بھی کہی ہیں کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں لیکن ان کی شہرت کی باعث غزلیں ہیں خواہی معنویت، طرزِ تخیل اور اظہارِ خیال کی ندرت کی وجہ سے اُردو ادب کے لئے ایک خاص سرمایہ ہو گئی ہیں اس کارنامہ کی وجہ سے فراق نے اسی جگہ اُردو کے صفِ اول کے شعراء میں قائم کر لی ہے کوئی دس سال سے فراق نے رباعیات پر زور دینا شروع کر دیا ہے اس صنف میں بھی انھوں نے گل بوٹے کھلائے ہیں سرآت کی غزلوں کی جھلک ان کی رباعیوں میں لطیف انداز سے نظر آتی ہے جہاں کہیں اس صنف میں حقائق بیان کرتے ہیں وہ رباعیات نصیرت آفرین ہو جاتے ہیں لیکن باوجود اس کے ان کی شہرت کا باعث اُن کی غزلیں ہیں جو ان کو صفِ اول کے شعراء میں جگہ دلاتی ہیں

# تلوک چند محروم

بہت لوگ عرصہ دراز سے محروم اُردو کے رسالوں میں اپنا کلام بھیج کر داد سخن لے رہے تھے لیکن ان کے مجموعۂ کلام کے شائع ہو جانے کے بعد سے اور بھی لوگوں کے دلوں میں ان کی قدر بڑھ گئی ہے انھوں نے گوناگوں مسائل پر طبع آزمائی کر کے اپنی وسعتِ نظر کا بہت بڑا ثبوت دیا ہے اور ایک خاص طرز کو رواج ڈالا ہے ان کے کلام میں ادبی، اخلاقی اور تخیلی دھاروں کا ذخیرہ ڈالا گیا ہے، اکثر انگریزی فارسی کے پاکیزہ خیالات کو اُردو کا جامہ پہنا کر ان کو مالا مال بنانے کی کوشش کی ہے

محروم کے یہاں مذہبی خیال ملتا ہے کہ ہر دو سال کے بعض مناظر کے حالات ملا دیدہ مست و ملت ہیں جو عنوان سے بیان ہوئے ہیں۔ اس لحاظ سے خواجہ جہانگیر، رجہاں کا مزار، مرزا غالب، مہاتما بدھ، سنیاسی کی فریاد وغیرہ قابلِ دید نظمیں ہیں غالباً اسی خوبی سے متاثر ہو کر سر عبدالقادر نے کلامِ محروم کے متعلق تحریر فرمایا ہے

کہ اس میں صلح و صلح کی تلقین ہے دنیا کے سب سے بڑے مذہبی پیشواؤں کی جو بیاں محروم کے پیش نظر ہیں وہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان والے سب کو عزت کی نگاہ سے دیکھیں اور ان کی پیش بہا رہنمائیوں سے سبق حاصل کریں[1] گردا نگاری کے وقت محروم کردار کی اہم خصوصیات بہت خوبی سے بیان کرتے ہیں جس سے نہ صرف ان کی دقت نظری کا پتہ چلتا ہے بلکہ شعر میں بھی دلکشی کا اضافہ ہو جاتا ہے

غم و اندوہ کے جذبات محروم اس خوبی سے نظم کرتے ہیں کہ یاس و درد کی تصویر نظروں کے سامنے پھر جاتی ہے جو دل کو ایک خاص کیفیت سے متاثر کئے بغیر نہیں رہتی جذبات اس کا دل کس مستی سے سنایا گیا ہے کہ بقول مرغ القادر "بہار ہو یا خزاں قدرت کے ہر منظر کو دیکھ کر ان کے دل کا کوئی نہ کوئی زخم تازہ ہو جاتا ہے"

تمام کلام پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ محروم کو زبان کی صفائی اور بیان کی سنجیدگی کا بہت زیادہ خیال رہتا ہے سادگی و پرکاری کے پھول ہر جگہ اشعار میں باعث زینت ہیں مذاق سلیم اور زبان پر عبور ہونے کی وجہ سے ترنم و روانی کلام میں عام طور سے نمایاں ہیں محروم کے اشعار میں بھی روانی و شگفتگی کا خاص لحاظ معلوم ہوتا ہے جو اپنے الفاظ کی سجاوٹ سے رنج و کلفت پیدا کر کے دلوں کو دیر تک مسحور رکھتا ہے

منظر نگاری کے وقت محروم کا قلم مصور کے قلم سے کم نہیں بلکہ اور زیادہ تصویر کشی کا کام کرتا ہے کلام کی روانی اور تحیر کی شگفتگی کی وجہ سے ان تصویروں میں ایک خاص دلکشی پیدا ہو جاتی ہے اور خود بخود ایک وجدانی کیفیت دلوں پر طاری ہو جاتی ہے معمولی مناظر و مظاہر قدرت بھی اس خوبی سے خامہ فرسائی کرتے ہیں کہ ان کی اہمیت بہت زیادہ ہو جاتی ہے

محروم اکثر ایسے خاص چیزوں اور مناظر قدرت کے تولی کرتے ہوئے میں روحانی تعلیم و تسکین قلب کا ایک سرچشمہ پاتے ہیں جس کا ذکر وہ بہایت پرکشش اور پرلطف طریقہ پر بیان کرتے ہیں

---

[1] دیوان گنج معانی ۔

# آنند نرائن مُلّا

آنند مُلّا کشمیری ہیں۔ کشمیریوں کی ذہانت اور جمالیاتی احساس کو دُنیا جانتی ہے۔ اُردو زبان و ادب کی ترقی میں ان کا جتنا حصہ ہے وہ بھی سب کو معلوم ہے۔ آنند نرائن مُلّا کے والد پنڈت جگت نرائن مُلّا لکھنؤ کی مشہور شخصیتوں میں سے تھے۔ مُلّا ۱۹۰۱ء عیسوی صدی کے آغاز کے ساتھ پیدا ہوئے۔ جوبلی اسکول اور کیننگ کالج کی انگریزی تعلیم کے علاوہ اُردو اور فارسی گھر پر پڑھی۔ انگریزی میں ایم اے کرنے کی وجہ سے انھیں علمی ادب کے رجحانات و میلانات سے بھی واقفیت کا موقع ملا۔ وکالت اس لئے اختیار کی کہ آبائی پیشہ تھا۔ اس میں بھی امتیاز حاصل کیا مگر مُلّا کی سلامت طبع کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ وہ وکالت کے ہو کر نہ رہ سکے اور نہ کلب اور جدید سوسائٹی کی تفریحات اُن کے دل کی خلش اور دردِ مندی کو مٹا سکیں۔ فی الحال (۱۹۵۵ء) میں وہ الہ آباد ہائی کورٹ کے جج ہیں۔

یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ لکھنؤ میں رہتے ہوئے بھی مُلّا لکھنؤ کے کسی شاعر سے زیادہ متاثر نہیں ہیں۔ ان کے چکبست کا کچھ رنگ ہے ورنہ وہ غالب اور اقبال سے زیادہ متاثر ہیں۔ انھوں نے کسی سے باقاعدہ اصلاح لی نہیں لی اور صرف اپنی انفرادیت کو سہارا رہا۔ مُلّا کے یہاں اس طرح لکھنؤ کے عام ماحول سے بغاوت ملتی ہے مگر لکھنؤ کی تہذیب کے اثرات اُن کی شخصیت اور مزاج میں ایک نکھرے اور ستھرے رنگ سے ملتے ہیں۔ دنیا نے اُن سے اچھا سلوک کیا۔ انھیں عالی حسب اور ٹوٹے ہوئے دل ہی پر قناعت نہ کرنی پڑی۔ خواہ ایک بغاوت کے الفاظ میں شاعروں کو خوف راس آتی ہے۔

"انھوں نے اسی دالانِ علمی کے رہنما ہیں۔ انیس، غالب اور اقبال کے استعار کے سہارے

---

۱۔ دیباچہ خوشے سمر (دیوان مُلّا) از آل احمد سرور

گئے اور انگریزی میں کچھ نظمیں کہیں پنڈت موہن لال رستی کے اشارے سے اس دیسی آوارگی کو ایک فطری راستہ مل گیا اور انھوں نے اردو شعر کہنے شروع کئے ملا کی شاعری میں حسن و دل حسن، انسان دوستی اور نئی دنیا کے محور ملتے ہیں ان کی شاعری ہمارے ادب کے تمام صالح میلانات کی آئینہ دار ہے اور ان کی شخصیت ہماری تہذیب کی وسیع المشربی اور ہمہ گیری کی ایک زندہ اور تابندہ تصویر"

ملا کی غزلوں میں بڑی سادگی اور سنجیدگی ہے ایک خاص رکھ رکھاؤ کے ساتھ وہ اظہارِ عشق کرتے ہیں اور اقتباری پہلوؤں کی غزلوں کا سہارا ہے کہ معصومیت سے لہجہ کا اظہار اتنا ہم آہنگ ہو جاتا ہے کہ دل و دماغ یکساں متاثر ہوتے ہیں اسی اندازِ بیاں کا اثر ہے کہ سپردگی و دروغگی کی کمی بھی محسوس ہوتی ہے جائے عشق میں کھو جانے کے وہ عشق کے دفاروں آداب کو غزلوں میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ان میں ہمہ گیری اور بے ساختگی ہے

ملا نظم کہنے پر بھی قادر ہیں، اگر ان کے دیوان "خوئے تیر" کا مطالعہ کیجئے تو اکثر نظمیں پُر اثر و قابل قدر نظر آئیں گی سیاسی، سماجی اور رومانوی نظموں کی ان کے یہاں کمی ہے لیکن جوش و ولولہ کی کمی ضرور محسوس ہوتی ہے طنز اور شدید احساس کا جہاں کہیں اظہار ہوتا ہے وہاں نظمیں بڑی دلکش ہو جاتی ہیں نظموں میں بھی ملا علامتی تخیل اور باریک بینی سے کام لیتے ہیں، مثال کی طرح وہ بھی معمولی باتوں کو، عام مناظر کو اس غور سے دیکھتے ہیں کہ فلسفہ و فکری عناصر بھی نظم کو وضع سادے ہیں

ملا کی زبان بڑی رچی ہوئی زبان ہے فارسی محاورات اور تراکیب نہایت خوبی کے ساتھ برمحل استعمال کر کے لہجہ کو بڑی اثر آفرینی عطا کر دیتے ہیں صنائع پر ملا کو خاص قدرت حاصل ہے عموماً اس سلسلے میں ان کی نظمیں بے ساختہ ہوتی ہیں مجموعی حیثیت سے ملا کے کلام میں بڑی تحیگی و روانی ہے

# حفیظ جالندھری

حفیظ جالندھری ۱۹۰۰ء میں جالندھر میں پیدا ہوئے ان کے والد شمس الدین حافظ قرآن تھے چنانچہ حفیظ نے بھی پہلے قرآن پڑھا پھر انگریزی تعلیم کے لئے گھر والوں نے اسکول بھیجا لیکن دو سالوں جماعت سے آگے نہ بڑھ سکے ابتدا ہی سے حفیظ کو شعر و شاعری کا چسکا لگ گیا تھا اس لئے انگریزی زیادہ نہ پڑھ سکے شعر و شاعری کو اوڑھنا بچھونا سا لیا محنت مزدوری کر کے پیٹ پالتے رہے لیکن بہت قلیل عرصہ میں اپنی شاعری کا سکہ ملک میں رواں کر دیا شاہنامہ اسلام لکھ کر ایک خاص شہرت کے مالک ہو گئے کلام کو قبول عام کا شرف حاصل ہو چکا ہے فردوسی نے محمود غزنوی کے اشارے سے شاہنامہ لکھ کر ایران کے بادشاہوں کی عظمتوں کو پھر سے زندہ کرنے کی جو کامیاب کوشش کی تھی وہ سب پر ظاہر ہے حفیظ نے اپنے ملی جذبات سے متاثر ہو کر اسلام کی قدیم عظمت و جذبات کو ارباب ذوق کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی ہے جس میں شاعرانہ حسن سے بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں یہ شاعری اور وہ بھی تاریخی دردناک واقعات کو نظم کرنا اور شستگی و سرعت سے محفوظ رکھنا آسان نہیں دشواری کے ساتھ ساتھ ایک خاص آن بان اس کام کے لئے درکار ہے حفیظ قابل ستائش ہیں کہ اس مہم کو بڑی خوبی سے سر کر گئے ہیں اسلامی تاریخ کا جاہ و فخر کی لہر بھی دوڑا دیتا ہے جس سے کلام میں ایک عظمت و دلکشی پیدا ہو جاتی ہے واقعات دلنشین ہو جاتے ہیں اور جذبات متاثر

شاہنامہ اسلام کے علاوہ ان کے نظموں کے اور مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں مثلاً نغمۂ زار، سوز و ساز جس میں علاوہ اور چیزوں کے مسدس نما ان خونی کیف و روانی کی ہے جس کے بہاؤ میں بہنے والا خود بہہ جاتا ہے ان مخصوص حسابات کو نمایاں کرنے کے لئے محرکوں کا خاص خیال رکھا گیا ہے جس کی خاص خوبی نرم آہنگی ہے، وارسی کی روانی، ملک کے مقامی

اثر نے ان نظموں کو ایک خاص انفرادیت عطا کر دی ہے۔ آپ کی دلسوزی و سرشاری و روانی ان کے کلام کے مخصوص جوہر ہیں جو دل و دماغ کو فوراً اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں۔ غالباً ان ہی خصوصیات کے بیان کرنے کی فکر، تخیل میں ملدیر داری اور کلام میں عمق نہیں پیدا ہونے دیا جس کی کمی کبھی کبھی شدت کے ساتھ محسوس ہوتی ہے۔

تعجب ہے کہ جو شخص نظم کے میدان میں اتنا بے فکر و غم و ناکو ہر قسم پر ٹھکرا کر مستانہ وار گزر جاتا ہے وہ غزل کی دنیا میں بالکل قنوطیت، مسدود مایوسیوں کا شکار نظر آتا ہے۔ غالباً سوز و گداز کی فکر جو غزل کے مدعی ہوتے ہیں اس انداز بیان پر مجبور کرتے ہوں۔ مسلسل کی غزلوں میں درد و گداز بہت کافی ہے۔ زبان بہت نرم و صاف ہے جو تغزل کے لئے پوری طرح موزوں ہے۔

حفیظ کے گیت بھی بڑے موثر ہیں، جو کہ محرومیوں کی دل کسی کا خاص لحاظ رکھتے ہیں اسی وجہ سے اثر اور زیادہ ہو جاتا ہے۔ نرم شیریں الفاظ کو سادگی کی خاصی سے کر موضوع کو سراپا تعمیر بنا دیتے ہیں۔ ٹوٹی ہوئی کسی کا تاج، سہوار کر ۱۱ یعنی ایسی نظمیں ہیں جن کو پڑھ کر حفیظ کی نظم نگاری کی صلاحیت کا قائل ہو جانا پڑتا ہے۔ سیاسی، تاریخی اور تمدنی کارناموں میں سیرت نگاری صداقت و سرعت کا ایک جگہ اسا کا میاب، سادہ ہر شخص کا کام نہیں۔

# سیماب

سید عاشق حسین نام، سیماب تخلص ۱۸۸۰ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ تعلیم ابتدا میں آگرہ اسکول میں ہوئی۔ اس کے بعد کالج کی تعلیم شروع ہوئی۔ انٹر تک پڑھا تھا کہ والد کے انتقال نے سلسلہ تعلیم قطع کرنے پر مجبور کر دیا۔ ۱۸۹۹ء میں داغ سے تلمذ حاصل کیا

اس وقت سے شعر و شاعری کی طرف زیادہ انہماک ہوا۔ آپ کا کمال دیکھ کر مختلف لوگ، مختلف اطراف سے فخرِ شاگردی حاصل کرنے لگے علمی مشغلہ زور کے ساتھ جاری ہوا چنانچہ ایک جگہ خود فرماتے ہیں

"تصنیف و تالیف کا شوق مجھے عہدِ طفولیت سے ہے اس وقت تک (۱۹۳۵ء) ۲۸ کتابیں مختلف موضوعات پر میرے قلم کی رہینِ کشش ہیں۔"

اپنے شاعرانہ معتقدات کو ایک مقام پر خود تحریر فرماتے ہیں "اوائلِ مشقِ سخن تک مجھے قدیم تغزل سے دلچسپی تھی لیکن زمانے کے ساتھ علم و معلومات کا دائرہ جس قدر وسیع ہوتا گیا رنگِ قدیم سے لگاؤ کم ہوتا گیا اب شاعری میں بلند خیالات اور بلند انسانی جذبات کی ترجمانی کا حامی ہوں میں شاعری میں فلسفہ، حقائق و معارف کے نکات بسر کرتا ہوں میں اس شاعری کا منکر ہوں جس کا موضوع صرف عورت اور اس کے متعلقات ہوں جو امرد پرستی کے بیان پر مشتمل ہو میری شاعری کا موضوع جس محض اور عشق محض ہے، میں نظم کو غزل پر ترجیح دیتا ہوں"

سیماب کے یہاں جذبات سے زیادہ خیالات اور فلسفہ کے مضامین آپ کو ملیں گے وہ انگریزی شاعری کے لورڈ ڈرائنڈن اور جانسن کے کلاسیکی اسکول سے زیادہ ملتے ہیں لیکن سادگی کی اُن کے یہاں کمی ہے جو ورڈز کی ممتاز صفت ہے وہ اگرچہ اصلاح دیتا بھی چاہتے ہیں تو اس کی کوشش کا عنصر بے ثبات ہو جاتا ہے

آپ کا کلام علاوہ اور حسوں کے زبان کی لطافت اس کی تکمیل کی پوری تصویر ہے، آپ کا دوسرا مجموعہ "کارِ امروز" نظموں کا دفتر ہے جس کے دیکھنے سے آپ کی وسیع النظری اور ہندوستان بلکہ دنیا کے ہمہ گیر مسائل سے دلچسپی کا ہر جگہ ثبوت ملتا ہے آپ کی متانت و سنجیدگی کی وجہ سے نظموں میں جوش و خروش زیادہ نہیں پیدا ہو سکا مگر اس کا یہ صاف جلوہ ہے کہ ہر طبقہ و مسئلہ پر آپ کی نظریں عالمانہ اندازِ سے پڑی ہیں سیماب کا انتقال ۱۹۵۱ء میں کراچی میں ہوا

# فطرت واسطی

اردو کی نظموں میں حسن حالی و آزاد و اکبر وغیرہ کے بعد نوجوان شعراء کو نورانی شاعری کی ضرورت محسوس ہوئی تو لطافت و رنگینی کے ساتھ اپنے محسوسات کو پیش کرنے کی فکر ہوئی فطرت واسطی بھی اُن ہی لوگوں میں نمودار ہوئے فطرت کے مختلف مناظر اور حسن و عشق کے متعدد مظاہرے ایک خاص لطف کے ساتھ قلم بند کرنے لگے ان کی شاعری ہندوستان کے متوسط طبقہ کے جذبات کی ترجمانی بھی ہے چنانچہ اُن کے کلام کا مجموعہ "حدیث دل" قدم قدم پر اس کا ثبوت دیتا ہے حسن و شباب، رنگ و نور، لذت و خواہش اُن کے کلام کی جان ہے محبت کی داستان ہو یا مناظر نگاری، وہ تشبیہات و استعارات ہمیشہ حسی دنیا سے لاتے ہیں جو اسی گوشت و پوست کی محبت اور مجازی بلکہ نسوانی حسن سے خلق ہوتی ہیں

فطرت کی زبان نہایت ماہرانہ اور پُراثر ہوتی ہے، وہ تشبیہ و استعارے میں بھی تازگی پیدا کرتے ہیں بحروں کے انتخاب میں بڑی کاوش سے کام لیتے ہیں نتیجہ یہ ہے کہ پورا کلام عموماً محسوس ہو جاتا ہے استعارہ میں درد و سرد کی بہت کافی ہے اُنھوں نے انگریزی صنف شاعری سانیٹ کو بھی اردو میں متعارف کرانے کی کوشش کی لیکن باوجود کاوش اور دلچسپی ہونے کے اُردو شاعری میں یہ صنف مقبول نہ ہو سکی فطرت کی نظمیں اس تعریف اور ہمیشہ کا دوسرا دل کشی کا باعث ہے۔

فطرت کے مجموعۂ کلام میں ایک کمی خاص طور پر محسوس ہوتی ہے یعنی عام حالات کے سوا اہم دوران کا ذکر کہیں نہیں ملتا ملکی و قومی مسائل پر جیسے فطرت کی نظر ہی نہیں، حسن و شباب کو مصیبتوں میں دیکھ کر فطرت کا حسن پرست دل بے چین ہو جاتا ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صرف ایک مخصوص سمت سے وہ دلچسپی لے رہے ہیں عوام سے اس احساس کا کوئی واسطہ نہیں اور اسی کمی سے غالباً اُن کو

شاعری کی دنیا میں اس فراغ سے محروم رکھا جس کے وہ مستحق ہو سکتے تھے کیونکہ اُن کو رہاں دنیاں پر اسا عبور تھا کہ اُن کے ہم عمر شاعروں میں کم لوگوں کو رہا ہوگا اب ادھر پانچ سال سے تو اک خرابی اور اُن کی ترقی میں سدِّ راہ ہو گئی ہے اُن کا کلام کہیں دیکھنے میں نہیں آتا جیسے وہ کچھ کہہ نہیں رہے ہیں حالانکہ ابھی اُن کو ترک شاعری سے گزر کرنا ہوا کیونکہ عمر زیادہ سے زیادہ کلام۔

# مجاز

۱۹۳۴ء سے ۱۹۳۶ء تک علی گڑھ یونیورسٹی میں ترقی پسند طلبا کا اک وفد رہا جنھوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں اپنا مقام حاصل کیا مگر ادب کی طرف سب سے زیادہ لوگ کی ان نوجوان ادیبوں اور شعراء میں مجاز کی کافی اہمیت ہے یونیورسٹی سے بی اے پاس کرنے کے بعد کچھ دنوں آل انڈیا ریڈیو دہلی میں اور پھر کچھ دنوں حکومت بمبئی کے محکمہ اطلاعات میں ملازم رہے پھر حلقۂ ادب لکھنؤ کے سرگرم کارکنوں اور "نیا ادب" کے ادارہ میں رہے کے بعد ہارڈنگ لائبریری دہلی میں ملازم ہو گئے

آج کل کی دنیا میں رہ کر کون حساس شخص یا ادیب ہوتا ہے جو اپنے ماحول سے مطمئن ہو، ملک کی ترقی ہوتی، متوسط طبقہ کی ابتری، بے روزگاری کا ہجوم جو تعلیم یافتہ نوجوان کو ڈرا رہا ہے روزمرہ کی جنگ، اور خون بہا اور اسی طرح سینکڑوں ایسی چیزیں ہیں جن کو دیکھ کر ہر انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور انسانیت کا جو یہیں اس نظام کے بدل دینے کے لئے دعوتِ عمل دیتا ہے ایک حقیقت نگار شاعر کا دل ان چیزوں کا اثر لئے بغیر نہیں رہ سکتا مجاز بھی اس ہیبت ناک سماج کے خلاف احتجاج کرتے ہیں اور دعوت انقلاب دیتے ہیں وہ سماجی کا پیغام سناتے ہیں اور ہمیں اس فرسودہ نظام کے

خلاف جنگ کرنے کے لئے آمادہ کرتے ہیں

مگر اپنی شاعری کے ابتدائی دور سے گزر کر مجاز نے محسوس کیا کہ شاعری کا مقصد خطیبانہ نظمیں لکھنا ہی نہیں ہے ایک فن کار کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے ارد گرد کی حالت کا مطالعہ کرے اُسے سمجھنے کی کوشش کرے اور ان حالات کے اثرات جو حیات کو رائیگاں کر دیتے ہیں انھیں ایک پیکر نظم میں سامعین کے سامنے پیش کرے مجاز نے ڈرامائی رنگ میں شعر کہنا شروع کیا وہاں سے اُٹھ کر ملا اشتراکی مقصد سے ہم آہنگ کھرس کی دنیا میں داخل ہو کر اسے حد اسکو اس طرح بیان کرنے لگے کہ اُن میں ہم گیری آگئی

یہ کہا جاتا ہے کہ مجاز اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے لیکن کچھ عرصہ آوارگی کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی اعلیٰ درجہ کی شاعری ختم ہو جاتی ہے مجاز کی شاعری کی ایک خاص اہمیت ہے ان کے کلام کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ عوام کے سامنے عوام کے سامنے کوئی تہذیب و تمدن کی ڈھیں کا نام نہیں بیٹھتے ہوئے ہیں ہمارا راستہ کے آرام اور ملامی سے کیا کھڑا کر سلاخ حیات کے محدود ماحول میں اپنی دوسرا کرے گی ہم ان سے انکار نہیں کرتے کہ اردو شاعری میں مجاز کا اضافہ کرنے والے مجاز کے ہاں جو خوبیوں کے ساتھ اس قسم کی شاعری آئی وہ اس کو ایسا ہی پیدا کر گئی

مجاز میں جذبات رنگا ہی کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے وہ محروم طبقے کے جذبات غریبوں کے جذبات اور گرانوں کے جذبات وغیرہ کو بہت سچائی اور لگن کے ساتھ بیان کرتے ہیں مفلسی کے ہیبتناک مناظر یا سرمایہ داری کے ظلم کا تذکرہ کرتے ہوئے بھی مغرب کے دامن کو ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیتے ان کے کلام میں روانی اُتھلاوٹ اور سرمستی بہت ہے

ان کی رومانی نظموں میں ایک خاص رومانیت ہے ایک سلگتی ہوئی نمود ہے ناامیدی اسے کو فنا کرنے کا جذبہ اور قنوطیت کے عناصر اس میں بہت کم ہیں جوانی کی سرمستی اور

اسکس ان کے کلام کو ایک خاص دلکشی بخشتی ہیں

نثار کے کلام کا مجموعہ ۱۹۱۰ء میں "آہنگ" کے نام سے شائع ہوا اور کافی مقبول ہوا ان کی کئی نظمیں مثلاً "رات اور رل" "آوارہ" "اندھیری رات کا مسافر" وغیرہ اردو داں نوجوان جماعت کی زبان پر ملیں گی ۱۹۴۵ء میں اپنے پرانے مجموعے "آہنگ" میں کچھ نظموں کا اضافہ کر کے اُسے "شب تاب" کے نام سے شائع کر دیا ہے اور اسی طرح ایک مجموعہ اور نکالا ہے جس کا نام "سارنگ" رکھا ہے۔ نثار کا انتقال ۱۹۵۵ء میں مقام لکھنؤ ہوا۔

# روشن

روشن جوالا پور ضلع سہارنپور کے رہنے والے ہیں اور شاہد عزیز نام ہے آپ ۱۹۱۱ء میں پیدا ہوئے گھر پر اردو فارسی اور انگریزی سے واقفیت پیدا کی اور اپنے والد سے مشورہ سخن کرنے لگے

رومانی شعرا میں روشن کو خاص اہمیت حاصل ہے آپ ایک نظم گو شاعر ہیں ان کی نظمیں شیریں اور لاد کے علاوہ اپنے ترنم کے لئے بھی مشہور ہیں نظموں کا پیرایہ عموماً ترجیع بند کی شکل میں ہوا ہے طرز روشن کی شاعرانہ ذہنیت کا مظہر ہے کیونکہ اُن کے خیالات وحدانیت کے بیچ وخم کو پوری طرح ادا کرنے کے لئے اس سے بہتر کوئی اور شکل نہیں ہو سکتی تھی ایک مصرعہ کو مارنا آئے رہنا مکرر پیدا کرتا ہے اور یہ تکرار ایک خاص حسن پیدا کر دیتی ہے۔

روشن کی شاعری میں بڑی حد تک وحدانیت کا غلبہ ہے حالانکہ ان کی شاعری بنیادی طریقہ دور حد ری کی پیداوار ہے اور طبقہ متوسط کو اپنی رومانی زندگی میں جو مشکلات پڑتی ہیں وہ بڑے عمدہ شاعرانہ انداز سے روشن کے یہاں بیان ہو جاتی ہے ہمارے سماجی حکم کے ٹوٹنے کی آواز اس میں بھی صاف سنائی دیتی ہے

روش کی شاعری میں سیاسی تخیل زیادہ پُر زور نہیں ہے آواز بازگشت کی طرح صدائیں آتی ہیں انقلاب کے نعرے سُنائی دیتے ہیں، فریاد کی آوازیں آتی ہیں مگر ہماری سیاسی شاعری خوش و فخار وغیرہ کے ہاتھوں اتنی آگے بڑھ چکی ہے کہ اب اس قسم کی آوازیں داستانِ پارینہ ہو کر رہ جاتی ہیں، سیاسی و سماجی انقلاب کا تخیل، اتنا زیادہ حقیقت پسند و صاف ہو چکا ہے کہ رومانیت کا نظریہ اس کے سراسر منافی سمجھا جاتا ہے

روش کی شاعری کا امتیازی پہلو نرم و لطیف الفاظ و تشبیہات کی بہار ہے اُن کی نظموں میں تغزل و روانی خاص طور پر قابلِ قدر خصوصیات ہیں محبت کی دنیا میں سرشار ہونے کی کیفیت کو اتنی خوبی سے بیان کرتے ہیں کہ کم لوگ اُن کے مقابلے میں پیش کئے جا سکتے ہیں

# احسان دانش

احسان الحق کا جائے وطن باعث ضلع میرٹھ ہے لیکن آپ کے والد قاضی دانش علی نے کاندھلہ ضلع مظفر نگر میں سکونت اختیار کر لی تھی یہیں ۱۹۱۴ء میں احسان الحق کی پیدائش ہوئی اب عموماً لاہور میں رہتے ہیں آپ نے افلاس کی آغوش میں آنکھ کھولی اور اسی کے زیرِ سایہ کرچوں ہوئے ہمت و استقلال نے رہبری کی اور آپ نے مزدوری، معماری، باغبانی اور پہرہ داری کی سخت منزلوں سے گزر کر بھی دنیائے شاعری میں ایک ممتاز حیثیت حاصل کر لی ہے

ذاتی تجربہ کی وجہ سے احسان مزدوروں اور مفلسوں کی ایسی عبرتناک تصویریں کرتے ہیں کہ بعض اوقات آنکھوں سے آنسو نکل آتے ہیں واقعات و مناظر کو ہو بہو منظم کرنا آپ کا امتیازی پیرایہ بیان ہے یہ تصویر کشی بھی وہ ایک فن کار کی طرح کرتے ہیں اور تصویر کے جذبات اس طرح نمایاں کرتے ہیں کہ ضرورت و خواہش کے مطابق ارکم ماریا ہوتا

رہتا ہے اگر اس اثر کو زیادہ تیز کرنے کے لئے احسان ایک بہت دلکش تمہید مایوس مسطر دے کر معاشی کی کوئی دلسوز تصویر پیش کرتے ہیں یا امیروں کی عیش و شادمانی کے مقابلہ میں غریبوں کی بے کسی اور حرماں نصیبی دکھلاتے ہیں یا کبھی فطرت کی مسرت بخش آغوش میں کسی مصیبت زدہ کو اس طرح دکھلاتے ہیں کہ تمام کائنات روئے زمین درد ہو جاتے

احسان نے جو کچھ محسوس کیا اسی سے آپ تک پہنچانے کی کوشش کی اب تکالیف کا کیا علاج ہو یہ آپ خود سوچئے اس علاج کے لئے وہ چاروں طرف نگاہیں دوڑاتے ہیں کبھی خدا سے دریافت کرتے ہیں کبھی اقبال کی بات مانتے ہیں کبھی خوشی کی طرف جھکتے ہیں کبھی خود ای انفرادی ترقی کو موثر سمجھ کر غریبی کا علاج علم میں تلاش کرتے ہیں کبھی اصلاح پسندوں سے کہتے ہیں کہ بے روزگاری کا علاج کر دو ورنہ سناتے ہوئے لوگ انقلاب کر دیں گے

احسان کی کوئی مالی حالت نہیں ہوئی انھوں نے بڑی عمر ریاضت کے بعد مزدوری سے دست بجا کر حقیقی معنی میں خود علم حاصل کیا اس لئے ان کے سوالات مجملہ نہیں سکے وہ رسمی و مذہبی قیود سے باہر نکل کر حیات و سماج کے مادی مسائل پر علمی و تحقیقی نگاہیں نہیں ڈالتے اسی حالی الجھاؤ کی وجہ سے وہ اپنے طبقاتی تعلق کی اہمیت کو زیادہ نہیں سمجھتے خود کہتے ہیں "میری دہلیز پر آنکھیں کھلی ہیں اور فالیں مردم نکلے گا"

احسان انقلاب تو ضرور چاہتے ہیں لیکن اس کا تصور بالکل حد مانی اور کبھی کبھی بالکل رومانی ہوتا ہے ان کا انقلاب کسی طبقاتی کشمکش کا نتیجہ نہیں ہوتا کبھی مشیت ایزدی پر مبنی تو کبھی کسی ایک مالی کا خواب ہوتا ہے اور اس میں یہ ظالم، سفاک، دھوکہ باز، جاگیردار، سرمایہ دار، ملا، لیڈر، یہاں تک کہ اس مالی کو ہر نقصان پہنچانے والے کا خون بہتا ہوا نظر آتا ہے اور بڑی بھیانک تصویریں خوفناک مسطر لگاتار ان کے سامنے آتے ہیں۔

احسان کی زندگی کے اس تلخ تجربہ کی بنا پر شاید ان کے تخیل کو اتنے خوفناک مناظر پیش کرنے کے قابل بنایا ہے ورنہ "مالی کا خواب" یا "سادھو کی جا" جیسی بھیانک نظمیں

اسی ادبی لطافتوں کے ساتھ شاید ہی کسی دوسرے شاعر کے بس کی ہو سکتی ہیں

پھر بھی اقبال اور جوش کے اثر کی جھلک اتنی الگ اور سر ہیں، کہ احسان کی شاعرانہ انفرادیت دب جائے اُن کا ذاتی مشاہدہ اُنھیں غریبوں کا شاعر بنے پر مجبور کرتا ہے گو عملاً وہ متوسط طبقہ کی طرف ہی کیوں نہ کھنچے چلے جا رہے ہوں

احسان نے دیگر جدید شعراء کی طرح رومانی نظمیں بھی کافی کہی ہیں حسن و عشق کی دنیا میں ان کا انداز عجب والہانہ ہوتا ہے شاعرانہ کیف اور اثر میں ڈوبے ہوئے شعر اُن کی رومانی نظموں میں بہت ملتے ہیں انھوں نے غزلیں بھی کافی کہی ہیں لیکن تغزل کم ہے غزل کی زبان بھی نہیں، ردیف و قافیہ کی قید میں عاشقانہ نظمیں معلوم ہوتی ہیں کچھ گیت بھی لکھے ہیں لیکن وہی پرانی روش ہے امتیازی شان نہیں پائی جاتی

کم احسان کے کلام کی ایک نمایاں خصوصیت ہے اور وہ سوز بھی بڑی دلکش لحن سے پڑھتے ہیں جدید تشبیہات اور لطیف استعارات اکثر ملتے ہیں بعض تشبیہات تو ایسی لے آئے ہیں کہ ابھی تک اُردو والوں کا انتظار کر رہی تھی واقعات و مناظر کے خوبصورت بیان کو آسانی کاری کی طرح قابو ہے، جذبات کے لطیف رموز کو نمایاں کرنے میں ان کو مدطولیٰ حاصل ہے

اُن کے یہاں سہل سے سادہ مگر دلکش اور بہت مانوس الفاظ ملتے ہیں، جوش اور اقبال کی طرح فارسیت کا رنگ غالب ہے احسان میں ابھی بہت کچھ ترقی کی صلاحیت مانی جاتی ہے تھوڑے سے دیہی سلجھاؤ کے بعد وہ اردو کے بہت بڑے شاعر ہو سکتے ہیں

# اختر شیرانی

اختر خاں نام، اختر تخلص حافظ محمود خاں شیرانی کے یہاں ۱۹۰۵ء میں ریاست ٹونک میں پیدا ہوئے مگر ہوش لاہور میں سنبھالا، ابتداء میں اسے اتالیق صابر علی خاں شاکر

سے مسوّدہ کیا بعد ازاں رومانی فطری سے مدد لیے رہے آپ خالصاً رومانی شاعر ہیں والہانہ اندازِ بیاں سے نظموں کو حقیقی معنوں میں غزل سا دیتے ہیں، وہ ایک خوش دل عاشق کی طرح معشوق سے دیوانہ وار گفتگو کرنے میں خاص ملکہ رکھتے ہیں جس سے اُن کے کلام میں ایک لطف و سپردگی پیدا ہو جاتی ہے اُن کی نظمیں زیادہ تر تخلیقانہ انداز کی وجہ سے دلکش ہو جاتی ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی حسین دوشیزہ کا تصور اُن کے دل میں اکثر گدگدیاں پیدا کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ اگر "گجراب" پر بھی نظم کہتے ہیں تو وہاں بھی اُن کے جذبات کی رنگ آمیزی سے سرور میں گجراب ایک دلہن سی جاتی ہے

اختر شیرانی کی ایک ممتاز خصوصیت یہ ہے کہ طرزِ بیاں یا کلام میں اتنا گداز نہیں ہوتا کہ ناقابلِ برداشت ہو جائے۔ اور نہ اتنا کم ہوتا ہے کہ طبیعت بے کیف ہو جائے، ان کی نظمیں عموماً مترنم و دلکش ہوتی ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ اُن میں وہ گہرائی یا درد نہیں جو کسی شاعر کو حیاتِ ابدی عطا کر سکے اکثر کلام کے ناہموار ہونے کی بھی لوگوں کو شکایت ہے لیکن سب سے زیادہ کمی اس کی محسوس ہوتی ہے کہ اُن کے جذبات میں کوئی تلاطم، کوئی شدید طوفان، کوئی بے چین کر دینے والا تموج نہیں ہوتا اُن کی نظمیں اپنی ساخت کے لحاظ سے آورد کا سہ دیتی ہیں لیکن یہی ساخت کی کمزوری اکثر اسی مادر دُر کار ہو جاتی ہے کہ آورد کے احساس کو اُبھرنے بھی نہیں دیتی

اختر کے کلام کے مجموعے شعرِ ساں، صبحِ بہار، نغمۂ حرم، طیورِ آوارہ، اخترستان اور سہارے کے نام سے شائع ہو چکے ہیں

اختر[1] کی رومانی شاعری اُداس اور درد آفریں نہیں پر کیف اور رجائی ہے اس میں ایک رجا دہے لذت ہے حسن پرستی ہی نہیں حسن کاری اور حسن آفرینی کا احساس ہے اور عریانی

---

[1] اُردو ادب میں رومانوی تحریک مصنفہ ڈاکٹر محمد حسن ص ۵۸ ۵۹

ادراک میں اس پر مستولی نہیں وہ ایک ماورائی سرمستی اور تصور پرست کیف کا پرستار ہے

# فیض

یہاں کہا پوری اردو شاعری میں کلام کی اسی قلیل مقدار پر کسی نے اتنا نام نہیں پیدا کیا جتنا فیض احمد فیض نے ان کا مجموعۂ کلام مختصر ہے مگر اپنی گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے جو کچھ ہے انتخاب معلوم ہوتا ہے فن کاری اور ندرت تخیل کا اتنا حسن امتزاج دورِ جدید میں کسی شاعر کے یہاں نہیں دکھائی دیتا سیدھے سادے الفاظ کو بغیر زیادہ تشبیہہ و استعارے کے سحر کی صورت میں مسخر کرنا اور تاثیر و مقصدیت پیدا کر دینا فیض کا خاص کارنامہ ہے اور یہی فیض کی شاعری کا امتیازی پہلو ہے جو ان کی نظموں میں قریب قریب ہر جگہ نظر آتا ہے

فیض نے اپنی شاعری کی ابتدا غزلوں سے کی مگر کوئی خاص شہرت حاصل نہ کر سکے وجہ یہ تھی کہ وہاں خیال میں ندرت نہ تھی فرسودہ نظریۂ عشق کو غزلوں میں جگہ دے رہے تھے احساس کی کمی نے تاثیر کو ابھرنے نہ دیا روداد محبت کے نازک پہلو بھی بیان نہ ہو سکے ہر دور ان کی غزل کہاں تک ساتھ دیتی جب رومانی شاعری سے الگ ہو کر نظموں میں کہنے کی کوشش کی تو حالات کا اثر ان پر ہوا ان کی اس دور کی شاعری میں احساس کی شدت بھی [illegible] نظمیں بھی غزلوں کی وہ صرف اسے حد بات کی ترجمانی کرنے سے جو عموماً [illegible] ہوتی تھی اور نظموں میں غم جاناں کے بجائے غم دوراں کو زیادہ جگہ ملی ہے مگر مصائب دوراں کی شاعری نے گہرائی و توانائی عطا کر دی ایسا معلوم ہوا کہ پہلے وہ آپ بیتی بیان کرتے تھے اب نظموں میں جگ بیتی بیان کرنے لگے [illegible] اس دور میں فیض نے عالمگیر شاعروں کا مطالعہ کیا اور یہ محسوس کرا [illegible] غم ہی رہا [illegible]

یہ محسوس کرتے ہی فیض نے ایسے تخیل و بیان کو پوری طرح شاعری کے لئے صرف کر دیا نتیجہ یہ ہوا کہ احساس میں شدت بھی پیدا ہو گئی اور بیان میں بسریت بھی آ گئی فیض کے اندازِ بیان میں ایک ایسا سیکھا پن ہے جو اس دور میں کم ہی نظر آتا ہے اُن کے کلام میں جو چیز سب سے زیادہ دل و دماغ کو متاثر کرتی ہے وہ اختصار و جامعیت ہے نظم میں اختصار اور بیان میں جامعیت وہ محسوسات کو چھو کر نہیں نکل جاتے بلکہ وہیں کو اس طرح سے چھیڑتے ہوئے جاتے ہیں کہ جیسے تیر کش کسی دل کو جس کا اثر دیر تک باقی رہتا ہے اور وہیں بار بار اس سے لطف اندوز ہوتا ہے فیض کے کم کہنے کا بھی راز یہی معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ شدت سے کسی بات کو محسوس کرتے ہیں تب ہی جذبات کو قلم بند کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ شعر کو حسن بنانے اور مفہوم کو وضاحت کے ساتھ پیش کرنے کے لئے فن کاری بھرپور توجہ اور محنت سے کام کرتے ہیں کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مفہوم پیدا کرنے کی فکر ہی ہے اسکے لئے مختلف صلاحیتوں کو یکجا کر دیا ہے جس کے لئے وقت کا سوال ہے، نتیجہ یہ ہے کہ اشعار جس خواہش زیادہ تعداد میں نہیں ہو سکتے لیکن اشعار کی یہ قلت سیکڑوں کے سطحی اشعار و پُر گوئی سے کہیں زیادہ وقیع ہے

فیض کے یہاں جذبات ایسی بھی ہیں جو اُردو ادب میں اضافہ معلوم ہوتی ہیں اور اُن کے طرزِ تخیل کا بہترین نمونہ مثلاً تنہائی، رقیب، یہ اُردو ادب میں روزِ اول سے چلے آتے تھے۔ ہر ادیب نے ایک ہی طرح سے ان موضوعات پر طبع آزمائی کی تھی فیض نے تنہائی میں نفسیاتی مطالعہ اور احساسِ حقیقت کا جیسا اچھا نمونہ پیش کیا ہے وہ آپ اپنی مثال ہے یہی حال ان کی اس نظم کا ہے جس کا عنوان رقیب ہے رقیب کی بُرائی اور رقابت اردو شعراء کا عام مسلک تھا لیکن فیض نے جس محبت و احترام سے اس کو یاد کیا ہے اور جس خوبی سے اس نظم کو سایا ہے اس کی مثال اب تک اُردو شاعری میں نہیں ملتی

۱۹۵۳ء میں فیض کا دوسرا مجموعہ "دستِ صبا" شائع ہوا اُسے دیکھ کر اُن کی فن کاری کا اور زیادہ اندازہ ہوا اختصار اور جامعیت کے ساتھ جیسے الفاظ جیسے احساسات

میں اس طرح ظاہر ہوئے کہ دونوں میں فرق کرنا مشکل ہو گیا تشبیہات و استعارات کا فیض نے سہارا نہیں لیا بلکہ دلکش انداز میں الفاظ کے خوبصورت دام میں خیالات کو پیش کیا ہے باریک شعور اور بصیر آنکھوں کو شاعرانہ انداز میں سمو کر شعر سنایا ہے اسلوب اتنے صاف اور مفہوم اتنا واضح ہے کہ دل و دماغ یکساں متاثر ہوتے ہیں اس دور میں اتنی تیزی سے کسی اور شاعر کے کلام کو مقبولیت حاصل نہیں ہوئی شروع میں ایک سال کے اندر دستِ صبا کے کئی ایڈیشن چھپ گئے

# علی سردار جعفری

سردار جعفری مرام پور ضلع گونڈہ (اودھ) کے رہنے والے ہیں ۱۹۱۳ء میں پیدا ہوئے تعلیم و تربیت زیادہ تر لکھنؤ میں ہوئی یہیں کے ماحول میں پرورش پائی اور اسی یونیورسٹی سے ایم اے کیا سردار جعفری اپنی طالب علمی کے زمانے میں بڑے ہونہار طالب علم تھے تقریر کرنے اور مضامین لکھنے میں اکثر انعامات حاصل کر چکے تھے یونیورسٹی میں جب پڑھتے تھے تب ہی سے اُردو ادب سے خاص لگاؤ تھا نظم و نثر دونوں میں یکساں کچھ نہ کچھ لکھتے رہے ابتدائے شعور سے ترقی پسند ادب سے وابستہ تھے ایک زمانے میں صوبائی ترقی پسند انجمن کے سیکریٹری بھی تھے

سردار جعفری کا سیاسی شعور، ادبی مذاق کے ساتھ برابر بڑھتا رہا اُردو ادب کے علاوہ انگریزی ادب کے وسیع مطالعہ نے اُن کی ذہنی بستو و ہا کو بڑی بلندی عطا کر دی اُنھوں نے اپنے مطالعہ کو اُردو ادب میں مضامین افسانے اور نظموں کی صورت میں پیش کیا دوسرے ادب کی ترقی یافتہ اور قابلِ قدر نئی خوبیوں سے فائدہ اُٹھا کر

اُردو ادب کو آگے بڑھانے کی کوشش کرتے رہے جعفری کے کلام کا ایک مجموعہ 'مردار' کے نام سے پہلے ہی نکل چکا ہے اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ خیال و بیان کی ندرت اُن کو اُردو شاعری میں ایک دل ممتاز جگہ دے گی ادھر اُن کی جو مطبوعہ سائع ہوئی ہیں اُن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ خیال صحیح تھا بارکسی نظر نہ جانے کو جس خوبی سے جعفری نے اپنے کلام میں پیش کیا ہے اس طرح ہمارے نزدیک ابھی تک اُردو کے کسی اور شاعر نے نہیں کیا وجہ یہ ہے کہ اُن کا سیاسی شعور اور ان کی زندگی ہم آہنگ ہو گئے ہیں جس طرح وہ سوچتے ہیں اسی طرح زندگی بسر کرنے کی بھی کوشش کرتے ہیں اس رویہ نے احساس اور صداقت دونوں کو اُبھار دیا ہے نتیجہ یہ ہے کہ خلوص و متانت اُن کی شاعری کے دو خاص جوہر بن گئے ہیں اور شعر میں مزاح میں پہلے ہی سے موجود تھی اس لئے کلام میں تاثیر کی بھی کمی نہ رہ گئی

جعفری کی شاعری میں حالات کی وہ تلخی ابھی نہیں آئی جو اُن کو وہ تلخی عطا کر دے کہ وہ اقبال کے قریب پہنچ سکیں لیکن جس بے باکی اور جوش کے ساتھ وہ نظر حیات پیش کرتے ہیں اس میں ایک خاص گہرائی و دلکشی ہے اُن کی نظموں میں للکار اور ہمدردی دونوں عناصر ہیں جو اقبال کے دور کے ماحول کی ترجمانی کے لئے بے حد ضروری تھے صاف صاف بے باکانہ ہر ایک بات کو بغیر تشبیہ استعارے کے پیرایہ کا ، ادا کرنے ہوئے یہاں کر دینا جعفری کا خاص حصہ ہے

جنگ کے جہاد ایسی سیاسی شاعری کو ختم کیا تھا وہ ایسا موڑ تھا کہ آگے راستہ نہیں سجھائی دیتا تھا اب معلوم ہوتا تھا کہ اُردو شاعری میں ایک خلا آ گیا ہے اس خلا کو جعفری نے ختم کیا اور ایک نئے باب کا اس طرح اضافہ کیا کہ مسیحوں اور گولی بارود ، ٹینک وغیرہ کی حرکات و سکنات کو شعر کے سانچے میں ڈھال کر ادب کو ایک بار پھر آگے چلنے کا نیا راستہ اس معرکہ میں انھوں

نے وہ شعریت پیدا کر دی ہے کہ ہر شے اور اس کے متعلقات جنہیں سے جنہیں تراد مکروہ سے مکروہ تر نظر آنے لگتے ہیں پورا مسطر فن کاری کا نمونہ بن جاتا ہے

معاصری کے اس وقت تک کئی مجموعے 'یرد دار' کے علاوہ شائع ہو چکے ہیں مثلاً 'جوں کی لکیر' 'نئی دنیا کو سلام' 'ایتیا جاگ اٹھا' 'اس کا سارہ' 'پتھر کی دیوار'

# احمد ندیم قاسمی

۲ نومبر ۱۹۱۶ء کو ضلع شاہ پور (پنجاب) کے ایک گاؤں انگہ میں پیدا ہوئے اس گھر میں احمد ندیم پیدا ہوئے یہ کبھی دنیوی تمت کی وجہ سے بہت ممتاز رہا۔ مگر اس کی اولاد کے زمانے میں وہ حشمت ختم ہو چکی تھی اور بقول خود "جب میں نے آنکھ کھولی تو میرا گھر افلاس و بدحالی کا عجب مرقع تھا" ابتدائی تعلیم گاؤں ہی میں ہوئی ۱۹۲۳ء میں باپ کے مرجانے کے بعد تعلیم درست اُن کے چچا نے دی' چچا ماد خود سرکاری ملازمت کے علم و ادب کے دلدادہ تھے عربی فارسی سے زیادہ شغف تھا' اردو سے کافی دلچسپی تھی اقبال کے ہم سبق رہ چکے تھے اس لئے اقبال کی شاعری کا ارتداد کرہ کیا کرتے اُن کے کلام سے بڑا انس تھا اور یہی انس احمد ندیم قاسمی کو منتقل ہو گیا

احمد ندیم نے بارہ سال کی عمر ہی میں علمی دنیا کا عملی ثبوت دیا۔ ایک چھوٹا سا ناول ۸ صفحے کا لکھ ڈالا اور کچھ اشعار بھی کہہ ڈالے۔ یہ ذوق رفتہ رفتہ بڑھتا رہا ۱۹۳۵ء میں بی اے پاس کر کے بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی نوکری کی تلاش میں سرگرداں رہے کبھی میں روپے کی ملازمت ملی کبھی چالیس کی عرض کہ بدحالی میں گزری پنجاب کے مختلف اضلاع میں کسب معاش کے لئے دوڑتے رہے ۱۹۳۹ء میں ملتان کے محکمۂ آبکاری میں کام کرنا شروع کیا لیکن تین سال بعد اس ملازمت سے دست بردار

ہو گئے ۱۹۴۲ء میں پہلے یہ نسواں، اور پھول کے ایڈیٹر ہو گئے یہ احمد ندیم کی ادبی زندگی کا بیادور تھا ایک سال بعد ادبِ لطیف کے مدیر ہو گئے ۱۹۴۶ء میں اس سے بھی دستبردار ہو جانا پڑا۔ اس وقت احمد ندیم قاسمی لاہور میں ادبی و علمی مشاغل کی زندگی بسر کر رہے ہیں علاوہ ادبی کاموں کے آپ کل پاکستان ترقی پسند انجمنِ مصنفین کے سیکریٹری بھی ہیں

احمد ندیم قاسمی اپنے کلام کی بدولت اُردو ادب میں نمایاں حیثیت حاصل کر چکے ہیں اُن کا مجموعۂ کلام "جلال و جمال" شائع ہو چکا ہے جس کے دیکھنے سے اُن کی شاعرانہ صلاحیتوں کا قائل ہو جانا پڑتا ہے سب سے پہلی چیز اُن کے اس مجموعۂ کلام میں جو دہن کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ "تنوع" ہے مضامین میں بھی تنوع ہے اور اصناف و بحور کے انتخاب میں بھی یہ خوبی صرف ایک دن اور زمانہ شناس فن کار ہی کے یہاں پیدا ہو سکتی ہے ورنہ تقلید سے شاعر کو بچنا مشکل ہو جاتا ہے ندیم کے طرزِ بیان میں بھی ایک خاص ندرت ہے لب و لہجہ کے انداز میں ایک ایسا تیکھا پن ہے جو سارے کلام میں تازگی پیدا کر دیتا ہے زبان ٹکسالی و بامحاورہ کم ہے فارسی و عربی کی تراکیب سے عموماً کام لیتے ہیں لیکن روانی میں فرق نہیں آتا اُن کا انداز مخاطب بہت دلکش اور پُر تاثیر ہے وجہ غالباً یہ ہے کہ جب کسی بات کو محسوس کرتے ہیں تو شدت کے ساتھ اس کا اثر لیتے ہیں اور یہ احساس صداقت، بے باکی اور برجستگی کے علاوہ کلام میں خلوص اور خوش اُبھار دیتا ہے

چونکہ ندیم کا مطالعہ بھی وسیع ہے اور زندگی اب تک دکھ اور درد کا شکار ہوتی آئی ہے اس لئے موضوع یا خیال میں نہ تو تکرار ہے اور نہ تازگی کی کمی محسوس ہوتی ہے وہ شاعری کو ہمیشہ لے اثری اور دلاعطاء انداز سے نوازتے ہیں کلام میں درد، کسک پیدا کرنے کی کوشش ہر جگہ نمایاں ہے، اسی سے اُن کے کلام میں للکار اور خطیبانہ خروش بہت کم ہے عموماً وہ رقیق النظری سے کام لے کر اپنی شاعری میں عظمت و معنویت پیدا کرنے کی فکر کرتے ہیں تشبیہہ و استعارے بڑے حسن نظم کرتے ہیں۔ مگر

سطر نگاری میں بھی اُن کا قلم وہ پُرکاری نہیں پیدا کر سکا جو خوش نما علی سردار جعفری کو حاصل ہے البتہ مناسب و سنجیدگی سے کلام مالا مال نظر آتا ہے

مدیم کی غزلوں میں فطری عنصر زیادہ ہے عشقیہ مضامین یا رازِ محبت زیادہ نہیں اس صنفِ شاعری میں مدیم کے یہاں سپردگی و فرسودگی کی بھی کمی محسوس ہوتی ہے عالباً غمِ دوراں سے غمِ جاناں کو زیادہ مچلنے کا موقع نہیں دیا لیکن دھیرا اُس کے بھی مدیم کی غزلوں میں تغزل بھی ہے اور برجستگی بھی

# واثق

احمد مجتبیٰ واثق جون پور کے ایک موضع کچ گاؤں میں ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے اُن کے والد مسٹر احسن صاحب کلکٹر تھے گھر پہلے سے بھی خوش حال تھا دولت سے زیادہ ادبی سرمایہ خاندان میں تھا واثق کے دادا مجتبیٰ حسن نہ صرف عربی و فارسی کے عالم تھے بلکہ سنسکرت و جوتش کے بھی زبردست ماہر سمجھے تھے باپ کی ملازمت کی وجہ سے واثق کی تعلیم ایک جگہ نہ ہو سکی کبھی قصبہ آباد میں پڑھا کبھی بارہ بنکی اور کبھی لکھنؤ میں بی اے کے بعد ایل ایل بی کر کے وکالت شروع کی اور اسی کے ساتھ ساتھ شاعری بھی وکالت چھوڑ کر نوکری کر لی مگر شاعری نہ چھوڑ سکے یہاں تک کہ سرکاری ملازمت سے مستعفی ہونے کی ایک خاص وجہ شاعری تھی کیونکہ جس قسم کی باتیں وہ کہنا چاہتے تھے وہ سرکاری ملازمت میں ممکن نہ تھیں

یوں تو واثق کو بچپن ہی سے شعر و شاعری سے دلچسپی تھی کچھ قطعات، رومانی نظمیں اور غزلیں وہ بیشتر بھی کہہ چکے تھے مگر اُن کے جوہر اس وقت تک نہ کھلے تھے دوسری جنگ عظیم کے بعد سے اُن کی شاعری دستہرت میں ترقی ہوئی وجہ نہ ہوئی

کہ واثق نے اپنی وہاں اور فطری دردِ دل سے متاثر ہو کر ہندوستان کے اس کرب کو محسوس کر لیا جس میں وہ اس وقت مبتلا تھا لوٹ، قحط، استحصال کی گرم بازاری، رجعت پسند طاقتوں کا ابھار، تعمیر کے بجائے تخریب کی پس پردہ کوششیں ایسی مصیبتیں تھیں جنھوں نے اکبر بزرگی سدوں کے حساس دلوں کو چوٹ پہنچائی چنانچہ واثق کو بھی ہندوستان کی بدقسمتی پر افسوس اور فاشسٹی قوتوں پر غصہ آگیا انھوں نے اپنی شاعری کو وقت کی پکار بنا کر دنیا کے سامنے پیش کیا اور چونکہ محسوسات و فن کا ایک خوبصورت امتزاج کلام میں نظر آتا لہٰذا واثق کی شہرت بہت جلد دنیائے ادب میں ہو گئی

اب تک واثق کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں ایک کا نام "عنصر" اور دوسرے کا "حرص" ہے ان مجموعوں کے شائع ہونے سے پہلے ہی واثق نے اپنی بعض نظموں کی ساعت اردو شعراء میں ممتاز جگہ پائی تھی بھوکا مگال بیناہار ارتقیم بیجاب سہ نظمیں اتنی مقبول ہوئیں کہ واثق نئے شاعروں کی صفِ اول میں شمار ہونے لگے

واثق کے کلام میں دلکشی بھی ہے اور فن کاری بھی وہ جو بات کہتے ہیں محسوس کر کے کہتے ہیں اور چونکہ شاعرانہ صلاحیتیں اچھی طرح موجود ہیں اس لئے کلام پُر تاثیر ہو جاتا ہے وہ اپنے مقصد یا نقطۂ نگاہ کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ قلم بند کرتے ہیں عموماً جامعیت اور صاف گوئی اُن کی شاعری میں ہر جگہ جاری و ساری نظر آتی ہے الفاظ اور تحریر کا انتخاب واثق بڑے سلیقہ سے کرتے ہیں موضوع اور تحریر سے ہم آہنگ ہو کر معنویت کو زیادہ سے زیادہ اُبھار دیتا ہے

واثق کے مجموعے میں آزاد و پابند نظمیں دونوں ہیں ہر جگہ عبارت اور قدم قدم پر مقصد نمایاں ہے غزل بھی واثق نے طبع آزمائی کی ہے مگر حسن و عشق سے زیادہ سیاسی نظریے اور عوامی تحریک و جذبات ان میں ملتے ہیں عشقیہ عناصر کی کمی ضرور محسوس ہوتی ہے لیکن صحت مند جذبات اور لب و لہجہ کی تازگی اُن کا بدل

پیش کر دیتی ہے عرض کہ بقول احتشام حسین ۔

"دانش کی شاعری برابر ترقی کرتی، زندگی کے مسائل کو سمجھتی سمجھاتی، وسعت اور گہرائی پیدا کرتی بڑھ رہی ہے۔ اگر انھوں نے اسی سوجھ بوجھ اور فن کاری سے کام لیا تو یقین ہے کہ وہ اردو کی صفِ اوّل کے شعرا میں جگہ پانے کے مستحق ہو جائیں گے

# موجودہ دور کی خصوصیات

۱ موجودہ دور میں مغربی اثر اور سائنس اور فلسفے کے مطالعے سے اردو شاعری زیادہ متاثر ہوئی اس لئے اصلیت اور واقعہ نگاری شعرا کے کلام میں روز بروز زیادہ ہوتی گئی ہے۔ کیف مبالغہ اور تصنع شاعری سے کم ہوتا جا رہا ہے صداقت اور اصلیت مطمحِ نظر رہی ہے اور واقعہ نگاری کے علاوہ جذبات و واردات کے اظہار میں بھی مدنظر رہی ہے اس معرکہ میں جہاں کہیں شعرا ناکام رہے ہیں وہاں کلام خشک اور بے رنگ ہو گیا ہے لیکن جہاں کامیاب ہوئے ہیں وہاں روز تاثیر اور شاعری کے محاسن کافی پیدا ہو گئے ہیں

۲ موضوعاتِ شاعری کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا ہے مسلسل اور مستقل نظموں کا ایک قابل قدر ذخیرہ ہمارے ادب میں نظر آنے لگا اس دور کے قبل مسلسل نظمیں، مثنویاں، ہجویات، واسوخت، صادق و تہور آشوب، سکار نامہ ماحد اسے ہی اور موضوعات تک محدود ہیں فن اور محاسن شاعری کے رجحان اس اور تیسرے مستقل نظموں کی عظمت اور اہمیت و ہر دلعزیزی جس حد تک بڑھا دی ہے وہ محتاجِ بیان نہیں لیکن موضوعات کو الگ الگ قائم نہیں کیا آزاد

حالی، اسمٰعیل کے ہاتھوں مستقل نظموں کی تعداد اور اقسام اور عنوانات کی تحدید حیات ہوئی اور صادق حیرہ مسلسل نظموں کا گزشتہ پچاس برس میں ہوا ہے اتنا اردو شاعری کی عمر بھر میں نہیں ہو سکا ملک کے مختلف حصوں سے اردو رسائل کا نکلنا انگریزی نظموں کی مثال اور سیاسی و تمدنی بیداری نے شاعری کو وسعت نگاہ عطا کر دی اسی وجہ سے اردو شاعری کو گوناگوں وسائل اور عنوانات ہاتھ آئے

۳۔ نظموں کے سلسلہ میں ان مستقل رجحانوں کا ذکر کرنا ضروری ہے جو اس دور کے شاعرانہ کارناموں میں خاص چیزیں ہیں سب سے چمکتی ہوئی مثال طباطبائی کی نظم "گورغریباں" ہے جو انگریزی شاعر ٹامس گرے کی انگریزی نظم کا ترجمہ ہے سلیم پانی پتی نے چترسین داس کے "ساگر سنگیت" کا ترجمہ محرر نم کے نام سے اس خوبی سے کیا کہ اہل مذاق نے بہایت قدر کی نگاہوں سے دیکھا ان کے علاوہ متعدد انگریزی اور سنسکرت کی نظموں کا منظوم ترجمہ ہوا۔ مثلاً "گیتا" کا ترجمہ اور کالیداس کا "رت سنگار" کا ترجمہ "عروس سخن" کے نام سے اور اسی مصنف کے "میگھ دوت" کا ترجمہ "پیک ابر" کے نام سے ان کے علاوہ انگریزی اور دیگر زبانوں کے ڈراموں کے کئی ترجمے ہوئے جن میں بعض منظوم ہیں اور اچھے ہیں کبھی کبھی نظمیں تصویروں کو دیکھ کر بھی لکھی گئی ہیں جن میں سے کئی ایک اچھی ہیں

۴۔ دور جدید میں غزل نے بھی نئے انداز سے نغمہ سرائی کی ناسر ترنم، داخلی پہلو، ہمواری، یک رنگی، حد بانی اور دبی کیفیات کے اظہار پر خاص توجہ کی گئی ہے۔ تصنع اور بعض بھونڈے اور بیکار بانوں کے بجائے شعرا نے روانی، بندش کی چستی اور موسیقیت کو جگہ دی ہے لطف پر معنی کیفیات موجودہ اردو غزل کی امتیازی خصوصیتوں میں سے ہیں عام طور پر غزلوں میں فلسفۂ حیات اور حقیقت ہستی کا بیان زیادہ ہو چلا ہے جو واقعات و امور مادی الفاظ میں مخصوص محدود نظر آتے تھے اُن کو دور میں لگا ہوں نے عمر تنہائی دے یا یاں دیکھ کر شعراء کے کلام میں حسرت کے عنصر کو بہت بڑھا دیا ہے

۵ تصوف سے اصولی اور رسمی سرمایۂ بیان سے قدم بڑھا کر زیادہ رنگین اور شاعرانہ شکل اختیار کر لی مسائلِ تصوف کا اطلاق سیکڑوں نئے عنوانوں سے شعراء کرنے لگے ہیں ایسی شخصیت اور انفرادی سے دلچسپی کو قائم رکھنے کی کوشش بھی دورِ حاضر کی ایک مخصوص چیز ہے متعدد غزلیں عشقِ حقیقی اور مجازی دونوں عنوانوں سے الگ ہو کر محض مسئلۂ حیات کے موضوع پر ملیں گی

۶۔ موجودہ دور کی غزلوں کی ایک امتیازی شان نفسیات کا گہرا مطالعہ اور انسان دوستی کے متعلق پُر لطف اظہارِ خیال ہے مگر اسے موقع پر کبھی کبھی شعراء کا قدم مہملیت کی طرف بھی جا پڑتا ہے

۷۔ فرسودہ اور مبتذل مضامین، فصیح اور محض رسمی باتیں مفقود ہو چلی ہیں جو الفاظ و ترکیبیں کثرتِ استعمال سے پامال ہو چکی تھیں اُن سے گریز اور نئی ترکیبوں اور نئے اندازِ بیان سے کلام کو سنوارنے کی جدوجہد جاری ہے

۸ یہ تو سب کچھ ہوا مگر مدعا کے کلام کی سادگی، بھولا پن، معصومیت اور خالص تغزل کے تیر اثر کو لگا ہیں موجودہ غزلوں میں ڈھونڈتی ہیں لیکن مایوس ہو کر واپس آتی ہیں لطافت و رنگینی تو ملتی ہے، تاثر و صداقت اور دردِ لطری بھی موجود ہے کیف و لذت کی بھی کمی نہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ کچھ تکلف اور خوشگوار آورد کی جھلک بھی بڑھتی جا رہی ہے سہلِ ممتنع کی مثالیں بہت کم ہوتی جا رہی ہیں فارسی اور عربی کی نئی ترکیبوں کی تلاش و استعمال میں لوگوں کو کبھی کبھی لغزش ہو جاتی ہے اور قدم ڈگمگا کر راہِ راست سے غلط راستہ پر جا پڑتا ہے

۹ دورِ حاضر کی ایک خصوصیت ترقی پسند تحریک ہے جو ہندوستان میں منظم طریقہ پر ۱۹۳۵ء میں ظہور پذیر ہوئی اس تحریک کا مقصد حیات کو زیادہ سے زیادہ ادب سے قریب کرنا ہے اس تحریک پر کارل مارکس اور اشتراکی افکار پر عامل

ہیں دورِ حاضر میں اس تحریک نے اُردو ادب پر بڑا اثر ڈالا ہے زیادہ تر ادیب اسی نظریے کے تحت میں کام کر رہے ہیں ان ادیبوں کو ترقی پسند مصنفین سے عموماً براہِ راست واسطہ ہے اکثر غلط فہمی ہوتی ہے کہ جو شخص بھی دورِ جدید میں لکھ رہا ہے وہ ترقی پسند ہے یہ خیال غلط ہے بلکہ جیسا ہم نے اوپر لکھا جو شخص مارکسی اور اشتراکی نظریئے سے کام کر رہا ہے صرف وہی ترقی پسند کہلانے کا مستحق ہے باقی لوگ یا تو رجعت پسند ہیں یا کم از کم ترقی پسند نہیں ہیں

۱۰۔ دورِ حاضر کی ایک خصوصیت آزاد نظم کی صورت میں بھی ظاہر ہوئی جس میں قافیہ و ردیف کی خاص قید نہیں ہے بحر کے ٹکڑے کر کے آہنگ کی صورت میں چھوٹے بڑے مصرعے لکھے جاتے ہیں لیکن ایک ہی بحر کا شروع سے آخر تک التزام رہتا ہے وزن البتہ کم زیادہ ہوتے رہتے ہیں اس تھوڑی مدت میں بعض جہت سے یہ وجود میں آئی ہے کئی ایک قابلِ قدر نظمیں آزاد نظم کی صنف میں آچکی ہیں جس کے ذمہ دار علی سردار جعفری، فیض، ن م راشد اور راشد ہیں

# ۱

# نثر

## نثر کی تاریخ

جیسے جیسے تحقیقات کی جاتی ہے اردو نثر کی عمر عام خیال سے زیادہ ہوتی جاتی ہے پہلے لوگوں کو خیال تھا اصلی کی "وہ مجلس یا کرل کہا اردو نثر کی [illegible] سے پہلی کتاب ہے جو ۱۴۲۵ء میں [illegible] لکھی گئی مگر اب تحقیق و جستجو نے بتایا کہ [illegible] سے بہت پہلے دکن میں نثر کا وجود [illegible] رہیں [illegible] تھا۔ [illegible] کہا جاتا ہے کہ اس کی [illegible] آٹھویں صدی ہجری [illegible] اور شیخ بہاء الدین نجم العلم کے رسالے سے [illegible]

[illegible] داستان تاریخ اردو [illegible] [19] [illegible] اشرف [illegible] میں تصنیف کیا اور اس [illegible] یہاں [illegible] یہ سوال عبث ہے کہ دکن میں اردو کی پہلی کتاب کے [illegible] تصنیف کی میاں وجیہ [illegible] [illegible] کے لئے ضروری تھا کہ اس [illegible] [illegible] لحاظ سے [illegible] ہوتی ہے اس کا [illegible] ضروری تھا [illegible] کتاب کیوں [illegible]

قدیم ہیں شیخ موصوف کا انتقال ۷۹۵ھ میں ہوا[1] افسوس ہے کہ ان کے رسالے ہمارے پیش نظر نہیں کہہ زیادہ وثوق کے ساتھ کچھ اور نہیں کہا جا سکتا ہے البتہ خواجہ بندہ نواز حضرت سید محمد گیسو دراز کی ایک تصنیف "معراج العاشقین" شائع ہو گئی ہے خواجہ صاحب کا انتقال ۸۲۵ھ میں ہوا لہذا یہ کتاب یقیناً اس سے پہلے لکھی گئی ہوگی یہ کتاب مذہبی امور پر مبنی ہے عبارت کا نمونہ یہ ہے[2]

"ایک بادشاہ کی تعظیم ایک امیر کوں بڑی کرتا ہے تو اول جا کر
آرائش کرتا ہے، سد محمد کو یا بچہ تن سنوار کر سات ایماں کے
اوپر لائے اگے ہو کے عروج سے لے کر جائے ماسوت کی مرل سوں"

اس کتاب کے دیکھنے سے یہ یقین پختہ ہو جاتا ہے کہ نثر کی ابتدا کم سے کم آٹھویں صدی ہجری سے ہو گئی تھی مگر فی الحال کوں کہہ سکتا ہے کہ یہ قطعی تاریخ ہے بہت ممکن ہے کہ تلاش و فکر سے ابھی کچھ اور آگے کا بھی پتہ چلے لہذا ابھی عرصہ درکار ہے کہ یقین کے ساتھ کوئی فیصلہ کیا جا سکے۔

تصنیف و تالیف کا سلسلہ خواجہ گیسو دراز تک موقوف نہیں رہا بلکہ اس میدان میں کچھ اور بھی اہل قلم نظر آتے ہیں مثلاً خواجہ صاحب کے نواسے سید محمد عبداللہ حسینی جو سلطان احمد شاہ ثانی کے زمانے میں گذرے ہیں آپ نے غوث الاعظم حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رح کے رسالہ "شاہ العشق" کا دکھنی میں ترجمہ کیا تھا اور اس کی شرح بھی لکھی تھی[3]

دکن کے ایک دوسرے بزرگ جن کا کارنامہ ملتا ہے وہ میراں جی شاہ شمس العشاق ہیں انھوں نے ۹۰۲ھ میں انتقال کیا ان کا قلم نظم و نثر دونوں میدانوں میں رواں رہتا چنانچہ کئی رسالے نثر میں بھی ہیں چند کے نام یہ ہیں۔

---

[1] اردوئے قدیم ص ۴۱، ۴۲ [2] معراج العاشقین ص ۱۵ [3] اردوئے قدیم ص ۴۴

۱ حل ترنگ ۲۔ گل باس ۳ شرح مرغوب القلوب ان سب میں شاہ صاحب کے تصوف کے مسائل بیان کئے ہیں۔ اردو مقطعہ نگاہ سے اس دور کی کتابوں میں وجہی کی "سب رس" قابل ذکر ہے اس کتاب کا سنہ تصنیف ۸۴۵ھ ہے مولوی عبدالحق نے اس کو مع ایک مبسوط مقدمہ اور سرنگ کے شائع کیا ہے۔ عبدالحق ایک جگہ صفحہ ۶ و ۷ میں لکھتے ہیں کہ "یہ کتاب اردو نثر سے قدیم اردو میں خاص ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔" قصہ بھی عجیب ہے اور طرز بیان بھی عجیب مصنف نے ایک عام اور عالمگیر حقیقت کو محبت کے پیرائے میں بیان کیا ہے اور حسن عشق کی کش مکش اور "عشق دل" کے معرکے کو قصے کی صورت میں پیش کیا ہے اس کتاب کی عبارت مقفیٰ و مسجع ہے لیکن روانی اور سلاست بہت کافی ہے قصے کے درمیان مصنف جا بجا پند و نصائح سے بھی کام لیتا رہتا ہے یہی نہیں بلکہ جا بجا اس زمانے کی طرز معاشرت کا بھی بیان آجاتا ہے عبارت کا نمونہ یہ ہے

"عقل بغیر دل کو نور نہیں، عقل کو خدا کہنا بھی کچھ دور نہیں ذات
تے صفات ہے ذات تے جو کچھ کلیا سو بے ذات سے جوں رقتا
ہو راس کا نور کیوں ہوئے مشہور"

۱۰۷۸ھ کے قریب ایک بزرگ میراں یعقوب نے مسائل الاتقیا اور دلائل الاتقیا کا ترجمہ دکھنی زبان میں کیا مولف اردوئے قدیم کا بیان ہے کہ یہ ترجمہ نہایت صاف اور سادہ زبان میں ہے مترجم نے کتاب میں کسی قسم کا تصرف نہیں کیا ہے مضامین اور ان کی تقسیم اصل کے بالکل مطابق ہے [۱]

اورنگ زیب کے زمانے میں ایک بزرگ سید شاہ محمد قادری گزرے ہیں۔ جو رائے پور (جس کا نام عالمگیر نے فیروز نگر رکھا) کے ایک خاندان "نور دیا"

---

[۱] اردوئے قدیم صفحہ ۱۱

سے تعلق رکھتے تھے انھوں نے بھی کئی مذہبی رسالے لکھے ہیں اسی زمانے میں ایک اور بزرگ سید شاہ میرے ایک کتاب "اسرار التوحید" کے نام سے لکھی۔ نام سے ظاہر ہے کہ توحید کے متعلق ہے

ان بیانات سے صاف پتہ چلتا ہے کہ نثر کی ابتدائی نشو و نما کا فخر دکن کو ہی حاصل ہے، گو کہ ان میں زیادہ تر کتابیں مذہبی ہیں جو ادبی نقطۂ نگاہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں مگر پھر بھی زبان کی عہد بعہد ترقی کا کافی پتہ چلتا ہے شمال میں نثر کی ابتدا اس لحاظ سے کم و بیش ایک صدی کے بعد ہوئی۔ کیونکہ فضلی کی "مجلس" ۱۱۴۵ھ میں لکھی گئی یہاں فارسی کا علم اس قدر تھا کہ اردو میں لکھنا لوگ ننگ و عار سمجھتے تھے۔ اس کے بعد بھی عرصے تک خطوط وغیرہ فارسی میں لکھے جاتے تھے یہاں تک کہ مرزا غالب نے بھی ریختہ کو اپنے لئے باعث ننگ سمجھا اور پھر دوسری صنف کی ہر دلعزیزی تھی قصے وغیرہ بھی مسجع ہی میں لکھے جاتے تھے۔ اسی شاعری کا یہ کمال اور فارسی کا اثر تھا کہ اردو نثر بھی عرصے تک مقفیٰ و مسجع لکھی جاتی رہی مثلاً "مجلس" کی عبارت اس قسم کی ہے

"تحریر دل میں تھی، کہ ایسے کام کو عقل چاہیے کامل اور مدد کسو طرف کی ہووے سائل کیونکہ بے تائید صمدی اور بے مدد جناب احمدی یہ مشکل صورت مدد نہ ہووے اور گہر مراد رشتۂ امید میں نہ آوے"

سودا کے اسی کلیات کی ابتدا میں جو نثر لکھی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ عبارت عموماً رنگین، مشکل اور مقفیٰ ہوتی تھی اس دیباچہ کی چند سطریں یہ ہیں

"سو تحریر یہ آئینہ ارباب معنی کے مسرت اس ہو کہ جس عباس حق تعالےٰ کی سے خوطہ لگی ناطقہ تیرے سخن ہو لیں یہ چند مصرعے کہ اور بیل ریختہ در ریختہ جامہ دو ماں ایسی سے صفحۂ کاغذ پر تحریر پائے"

ایک اور مشہور کتاب عوامی عہد میں لکھی گئی وہ نوطرز مرصع ہے۔ یہ کتاب قصۂ چہار درویش کا ترجمہ ہے میر محمد عطا حسین خاں تحسین نے ۱۷۹۸ء میں اس مشہور کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اس کتاب کی علمی عبارت رنگین اور مقفیٰ ہے

# فورٹ ولیم کالج

آخر وہ وقت آگیا کہ سلطنت کو اردو کی امداد کی ضرورت پڑی اور یہ ضروری سمجھا گیا کہ اس زبان کی سرپرستی کر کے حکام سرکاری کو اس زبان سے واقف کیا جائے بلکہ اگر ممکن ہو تو کوشش کی جائے کہ ہر شخص اس کو سیکھے اور استعمال کرنے لگے جائز اس خیال کو پورا کرنے کے لئے فورٹ ولیم کالج مناسب سمجھا گیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی سرپرستی میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں اردو ادب کا مرکز قرار دیا گیا اس کالج کے منتظم اعلیٰ ڈاکٹر جان گل کرسٹ تھے انھوں نے اردو کی ترقی کے لئے ان تھک کوشش کی ملک کے بہترین انشا پردازوں کو اکٹھا کر کے ایسی کتابیں لکھوائیں جو عام فہم اور دلچسپ ہوں رنگین عبارت اور مقفیٰ تحریر سے یک قلم تحریر کیا بلکہ سلیس اور رواں عبارت پر زور دیا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو بہت جلد عام فہم اور دلکش نظر آنے لگی۔ تھوڑے ہی دنوں میں یہ صلاحیت پیدا ہو گئی کہ فارسی کی جگہ اردو سرکاری زبان قرار پائی۔ اس زمانے کی چند خاص ہستیاں یہ ہیں۔

میر امن　میر علی افسوس　میر بہادر علی حسینی۔ حیدر بخش حیدری میر کاظم علی جوان　بہال حیدر لاموری۔ مظہر علی خاں ولا۔ حفیظ الدین احمد　للولال جی مینی رائن　مرزا علی لطف۔

# مرزا علی لطف

ان کے والد کاظم بیگ خاں استرآباد کے رہنے والے تھے ۱۷۴۱ء/۱۱۵۴ھ میں نادر شاہ کے ساتھ ہندستان آئے اور یہیں رہ گئے۔ مرزا علی لطف کی تعلیم و تربیت دہلی میں ہوئی۔ ڈاکٹر گل کرائسٹ نے ان کو بھی اپنے یہاں بلا کر جگہ دی اور ان سے وہ کام لیا جو شاید ابھی تک کسی سے نہ لیا تھا اردو شعرا کا تذکرہ لکھوایا جس میں اس وقت کے بہت سے شاعروں کے حالات اور کلام ہیں۔ اس تذکرہ کا نام "گلشن ہند" ہے جو ایک مدت تک دنیائے ادب کی سطروں سے اوجھل رہا بقول مرزا تاقت۔

ہر اندھیرے میں اُجالا ہے اگر دل ہو بصیر

موسیٰ ندی کا وہ طوفان جس نے حیدرآباد کو بے شمار نقصان پہنچایا اسی نے اس تذکرہ کو "گنج آورد" کی طرح دنیا میں پھر ظاہر کیا یعنی گلشن ہند کی ایک جلد سیلاب عظیم میں بہتی چلی جا رہی تھی کہ ایک صاحب کے ہاتھ لگی جس کو مولوی عبدالحق نے نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے

فورٹ ولیم کالج نے اردو زبان کی جو سرپرستی کی ہے اس احسان سے اردو ادب سبکدوش نہیں ہو سکتا متعدد قابل قدر اہل قلم کو بلا کر کوئی ادبی خدمت ان کے سپرد کر دی گئی۔ جس سے ایک نئی نہج دیرہ تیار ہو گیا نہ صرف قصہ کہانی کی کتابیں لکھی گئیں بلکہ اخلاق، مواعظ، تاریخ، سوانح عمری لغت علم اللسان پر بھی توجہ کی گئی اور کچھ نہ کچھ ان کے متعلق بھی سرمایہ اکٹھا کر دیا گیا۔

اس کالج کے اساتذہ اردو کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ مقفیٰ و مسجع عبارت سے گریز کر کے انھوں نے سیدھی سادی عبارت کا رواج دیا۔ (میر امن کے تذکرہ

کے سلسلے میں ہم نے جو تنقیدیتیں کی ہے کم و بیش وہ اس کالج کے جملہ متبیوں پر صادق آتی ہے)

اس کالج کا اثر تمام ملک پر پڑا۔ رفتہ رفتہ سبھوں نے فرسودہ طریقہ یعنی رنگین اور معلق عبارت کو چھوڑ کر سادگی اختیار کی دہلی والوں نے بہت جلد اس روش کو قبول کر لیا البتہ اہلِ لکھنؤ نے اس راستہ کو اختیار کرنے میں کچھ دیر تردد و تکلف سے کام لیا۔

ایک اثر اس کالج کا یہ پڑا کہ فارسی اور عربی کے دقیق الفاظ کی اردو میں کمی ہو گئی ہندی اور اردو کے وہ الفاظ کام میں آنے لگے جو عام طور سے کم لیسد کئے جاتے تھے۔ مگر یہ محض اس لئے تھا کہ زبان عام فہم ہو جائے۔

اب اردو نثر کی طرف تمام ہندوستان کی نظریں پڑنے لگیں اطراف و جوانب سے بھی لوگوں نے قلم اٹھایا سید الستار اللہ خاں نے اردو زبان کی قواعد دریائے لطافت ۱۸۲۰ء میں لکھی ۱۸۲۱ء میں مولوی محمد ابراہیم نے صرف و نحو کی ایک کتاب تحفۂ "العلمٹس" تحریر کی۔ اسی طرح سے مستی کریم الدین کی قواعد المبتدی ۱۸۴۵ء میں لکھی گئی۔ اور اسی سلسلہ میں مولانا محمد حسین آزاد نے جامع القواعد لکھ کر لاہور میں شائع کی۔ علاوہ ان کے جدا در لوگوں نے چھوٹے چھوٹے رسالے مختلف موضوع پر قلم بند کئے۔

# للّو لال جی

یہ گجراتی برہمن تھے اور اس زمانہ میں شمالی ہند آ گئے تھے مگر اردو کے بھی ادیب تھے خوش قسمتی سے یہ بھی اس کالج کے منشی کی حیثیت میں کام کرتے تھے ان کا بڑا کام یہ تھا کہ ہندی کتابوں کے ترجمے کرنے میں اردو والوں کو مدد دیں اور ہندی کی کتابیں بھی لکھیں ان کی ایک مستقل تصنیف سنگھاسن بتیسی اردو میں بھی ہے۔

# میر امّن

اس عہد کے سب سے ممتاز مصنف میر امّن دہلوی ہیں اور ان کا مشہور کارنامہ "باغ و بہار" ہے جس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ میر امّن کا زبان پر پوری قدرت حاصل ہے روانی اور سلاست کے علاوہ محاوروں کا صرف اور زبان کی لوچ نہایت خوبی کے ساتھ ساتھ ہیں میر عطا حسین تحسین نے چہار درویش کا فارسی سے پہلے اردو نثر میں ترجمہ کیا تھا لیکن فارسی و عربی کے غیر مانوس الفاظ نے اردو میں مقبول عام نہ ہونے دیا۔

میر امّن نے شروع سے اس کتاب کو فورٹ ولیم کالج میں لکھنا شروع کیا اور اس خوبی کے ساتھ لکھا کہ عوام اور خواص دونوں سے قبول عام کی سند حاصل کی۔ لوگوں کے جذبات حفظ مراتب کے ساتھ اس طریقہ پر ادا کئے کہ عورت اور مرد، نوکر اور آقا جس کا ذکر آیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے سامنے دو مدعو گفتگو کر رہے ہیں جہاں کہیں فارسی یا سنسکرت کے الفاظ آ گئے ہیں وہ

بجائے ناگوار معلوم ہونے کے دلکش معلوم ہوتے ہیں۔ یہ صرور ہے کہ میر انیس نے کہیں کہیں ایسے الفاظ بھی استعمال کئے ہیں جو لغت کے لحاظ سے نامناسب ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ الفاظ عوام کی زبان پر رائج تھے۔ لہٰذا انھوں نے اردو کو ہر لحاظ سے کے لئے اس بات کو روا رکھا

میر انیس کے آباو اجداد ہمایوں بادشاہ کے وقت سے محلیہ سلطنت سے وابستہ تھے شاہی دربار سے ان کو جاگیر بھی عطا ہوئی۔ احمد شاہ درانی کے حملے کے وقت میر انیس کا گھر بھی لوٹا گیا۔ اور سورج مل جاٹ نے ان کی جاندادی جاگیر بھی ضبط کرلی اس وقت ان کو مجبوراً وطن چھوڑنا پڑا۔ کئی برس عظیم آباد میں قیام کیا۔ پھر وہاں سے کلکتہ پہنچے وہاں دو سال تک نواب دلاور جنگ کے بھائی میر محمد کاظم خاں کے اتالیق رہے اسی زمانے میں میر بہادر علی حسینی نے ان کا تعارف ڈاکٹر گل کرائسٹ سے کرادیا موصوف نے نہایت خوشی سے میر انیس کو فورٹ ولیم کالج میں جگہ دی ۱۸۰۱ء میں قصہ چہار درویش کو سلیس نثر میں لکھنے کے لئے مامور کیا

اس کتاب کی خوبی کے لئے یہی دلیل کیا کم ہے کہ سو برس سے زیادہ ہوگئے مگر اس کی مقبولیت میں کوئی فرق نہیں آیا اگر میر انیس کو اس کارنامہ پر فخر تھا تو بجا تھا ہمارے نزدیک یہ کتاب ان کے لئے حیات جاوید سے کم نہیں میر انیس کی دوسری کتاب گنج خوبی ہے یہ انوار سہیلی کا ترجمہ ہے اس کتاب کو شہرت نہیں نصیب ہوئی

## میر شیر علی افسوس

میر افسوس دہلی میں پیدا ہوئے ان کے والد نواب عمدۃ الملک امیر خاں کی سرکار میں ملازم تھے۔ امیر خاں کے انتقال کے بعد افسوس کے والد یعنی میر علی مظفر خاں

پٹنہ چلے گئے وہاں نواب میر قاسم کے یہاں سلسلۂ ملازمت قائم ہوگیا اور یہ سلسلہ نواب میر جعفر کی حکومت تک باقی رہا۔ میر شیر علی افسوس اپنے والد کے ساتھ پٹنہ سے پھر لکھنؤ واپس آئے لکھنؤ کی فضا میں اس وقت شاعری ہر طرف جلوہ گر تھی افسوس نے بھی اپنے کلام کی داد اہل فن سے لی۔

لکھنؤ کے دوران قیام میں افسوس کو موقع ملا کہ کرنیل اسکاٹ کے دل پر اپنی قابلیت کا سکہ بٹھائیں کرنیل صاحب نے دو سو روپیہ ماہوار پر افسوس کو کلکتہ بھیجا اور پانچسو روپے راہ راہ کے لئے دئے کلکتہ پہنچ کر وہ فورٹ ولیم کالج کے سر برآوردہ لوگوں میں شمار ہونے لگے۔ انھوں نے کئی کتابیں اپنی یادگار چھوڑیں۔ گلستاں کا ترجمہ اردو میں کیا جس کا نام باغ اردو رکھا اور یہی سال اختتام کا مادۂ تاریخ بھی ہے اس ترجمہ میں شیر علی افسوس نے زبان کی سلاست اور ترجمہ کی خوبی کو مدنظر رکھتے ہوئے دلچسپی قائم رکھنے کی کوشش کی ہے

ان کی ایک اور کتاب ہے جو ہندوستان کے جغرافیائی حالات اور کسی قدر تاریخی واقعات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کا نام آرائش محفل ہے اس کو حیدر بخش کی آرائش محفل (قصہ حاتم طائی) سے کوئی تعلق نہیں شیر علی افسوس نے سودا کے کلیات کو صحیح کر کے دوبارہ شائع کیا ان کا خود بھی ایک دیوان ہے جو اچھی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ افسوس کا سال انتقال ۱۸۰۹ء ہے

# سید حیدر بخش حیدری

دلی کے رہنے والے اور سید الوالحسن کے بیٹے تھے۔ بزرگوں کا وطن سحر اشرف تھا سید الوالحسن نے دلی کو خیرباد کہہ کر بنارس میں سکونت اختیار کر لی تھی حیدری

کی ذہنی تشویش سامارس میں ہوئی۔ فورٹ ولیم کالج کی علمی قدر دانی کا حال سن کر حیدری نے ایک کتاب لکھی اور اس کو ڈاکٹر گل کرائسٹ کی خدمت میں پیش کیا ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب کو بہت پسند کیا اور حیدری کو فوراً بلا کر منشی کی جگہ دی

حیدری نے اپنے فرائض نہایت خوبی سے انجام دئے اور ایک بڑا کارنامہ اپنی یادگار میں چھوڑا ان کی کتابوں کی فہرست حسب ذیل ہے

۱ قصۂ لیلیٰ مجنوں، امیر خسرو کی مثنوی کا اردو ترجمہ ۲۔ طوطا کہانی یہ قصوں کی کتاب ہے اصل کتاب سنسکرت میں ہے جس کا ترجمہ فارسی میں بھی ہوا تھا اور اسی سے حیدری نے اردو میں لیا ہے ۳ آرائش محفل۔ یہ حاتم طائی کا ترجمہ ہے حیدری نے اس کی زبان نہایت سلیس اور بامحاورہ رکھی ہے جس کی وجہ سے قصوں کے پیچیدہ ہونے کا بڑا اثر کم پڑتا ہے اور دلچسپی قائم رہتی ہے قصہ کی پیچیدگی کا ذمہ دار حیدری کو ٹھہرانا نامناسب ہے۔ اس لئے کہ وہ محض مترجم تھے ۴ تاریخ نادری فارسی تصنیف "جہاں کشائے نادری" کا ترجمہ ہے اصل مصنف مرزا مہدی ہیں ۵۔ گل مغفرت یہ روضۃ الشہدا کا ترجمہ ہے اس کا سن تصنیف ۱۸۱۲ء ہے ۶ گلزار دانش یہ فارسی کی مشہور کتاب بہار دانش مصنفہ شیخ عنایت اللہ کا اردو ترجمہ ہے جس میں عورتوں کی اغوا فریبی اور مکاری کے قصے درج ہیں۔ ۷ ہفت پیکر مطاعی کی مشہور مثنوی ہفت پیکر کا جواب ہے ۸ قصہ مہر و ماہ یہ کتاب نایاب ہے ۹ گلدستۂ حیدری متفرق تالیفات ہیں مراثی حکایات لطائف غزلیات و قصائد وغیرہ شامل ہیں یہ کتاب بھی کم یاب ہے

# نہال چند لاہوری

ان کے متعلق صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ یہ دلی کی تھی لیکن لاہور میں زیادہ رہنے کی وجہ سے لاہوری کہلائے کپتان ولورٹ کی سفارش سے ڈاکٹر گل کرائسٹ نے ۱۸۱۷ء میں کلکتہ لا کر فورٹ ولیم کالج میں جگہ دی۔ نہال چند لاہوری نے کئی ایک کتابیں لکھیں ان میں سے زیادہ مشہور مذہب عشق ہے جس کا دوسرا نام قصہ گل بکاؤلی ہے جو فارسی کے قصے کا ترجمہ ہے۔ اس کا سنہ تصنیف ۱۸۱۳ء ہے

# مرزا کاظم علی جوان

مرزا کا وطن دہلی تھا مگر لکھنؤ کی قدر دانی اور دلکشی نے اپنی طرف رجوع کیا اور یہیں آ کر رہنے لگے۔ جب ان کی قابلیت کے جوہر نمایاں ہوئے تو جیمس اسکاٹ نے ۱۸۱۰ء میں فورٹ ولیم کالج کے لئے ان کو منتخب کیا۔ لکھنؤ کو خیرباد کہہ کر مرزا نے کلکتہ آباد کیا اور وہاں اکثر کتابوں کا ترجمہ کیا فہرست حسب ذیل ہے

۱ شکنتلا یہ کالیداس کا سنسکرت میں لکھا ہوا مشہور ڈرامہ ہے جس کو کہ نواب شاعر نے برج بھاشا میں بیان کیا تھا۔ جواں نے برج بھاشا سے اردو میں منتقل کیا۔ کاظم علی جواں کی یہ شکنتلا اردو کا ڈرامہ ہے ۲ بارہ ماسہ اس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تہواروں کا بیان ہے ۳ تاریخ فرشتہ اس مشہور تاریخ کے ایک حصہ کا کاظم علی جواں نے اردو میں ترجمہ کیا۔

ان کتابوں کے علاوہ جواں نے قرآن مجید کے اردو ترجمے کو بھی درست

کیا مولوی حبیب الدین کی کتاب حدود اسرار پر نظر ثانی کی اور شعرا کے کلیات کے انتخاب میں بھی مدد دی

## مظہر علی خاں ولا

ان کا اصل نام مرزا لطف علی تھا مگر عرف عام میں مظہر علی خاں کہلاتے تھے ان کے والد کا نام سلیمان علی خاں تھا اور وداد تخلص فارسی کے اچھے شاعر تھے وطن دلی تھا مظہر علی خاں ولا فارسی، سنسکرت، ہندی کے عالم تھے مرزا خاں طپش اور مصحفی کے شاگرد تھے خوش قسمتی سے ان کو بھی فورٹ ولیم کالج میں جگہ مل گئی یہاں رہ کر انھوں نے بہت سی کتابوں کا ترجمہ کیا مثلاً ۱ مادھو مل اور کام کندلا موتی رام کوی تیسر کی ہندی کتاب کا ترجمہ جو ۱۸۰۲ء میں ختم ہوا ۲ ہفت گلشن ناصر علی خاں کی فارسی کتاب کا ترجمہ ۱۸۰۲ء میں ختم ہوا ۳ بیتال پچیسی بیتال بھٹ کی ایک شخص کی ۲۵ کہانیاں سنسکرت میں لکھی گئی تھیں پھر کسی نے برج بھاشا میں اس کو منتقل کیا ولا نے برج بھاشا سے اردو میں ترجمہ کیا ۴ تاریخ شیر شاہی فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا ترجمہ ۱۸۰۵ء میں ختم ہوا ۵ جہانگیر نامہ ترک جہانگیری کے ایک حصے کا ترجمہ ہے ولا کا ایک دیوان بھی اردو میں ہے مگر نایاب ہے۔

## بینی نرائن

جہاں تخلص کرتے تھے لاہور کے رہنے والے تھے، انھوں نے ایک فارسی قصہ کا ترجمہ کر کے "بہار گلشن" نام رکھا جس میں بادشاہ کیوان اور فرحندہ کے حالات ہیں ۱۸۲۹ء میں "تسلیۃ العاقلین" کا بھی ترجمہ اردو میں کیا دیوان جہاں کے نام سے ایک تذکرہ بھی ان کی یادگار ہے

# ۲

## فورٹ ولیم کالج سے باہر

فورٹ ولیم کالج کا اثر تمام ہندوستان پر پڑا مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دہلی اور لکھنؤ بھی اردو ادب کے لئے آفتاب اور ماہتاب کا کام کر رہے تھے۔ یہاں کے رہنے والوں نے بھی کچھ کم کام نہیں کیا۔ چند ممتاز مستند کا حال اور کارنامہ قابل ذکر ہے

## فقیر محمد خاں گویا

ان کا نام فقیر محمد خاں تھا اور گویا تخلص۔ فن شعر میں ناسخ کے شاگرد تھے شاہی زمانے میں رسالدار تھے اور حسام الدولہ خطاب عطا ہوا تھا۔ زمانے کا انقلاب کہیئے یا اردو کی خوش قسمتی سمجھئے کہ اس بہادر سپاہی نے تیغ قلم سے بھی وہ کام لیا کہ میدان ادب میں آج تک ان کا نام نمایاں ہے فارسی کی الواہ سہیلی ایک زمانے میں مقبول عام تھی چنانچہ ایک روز شیخ ناسخ اور میاں فرح وغیرہ ایک صحبت میں بیٹھے الواہ سہیلی کی تعریف کر رہے تھے تعریف میں کچھ ایسا مزا ملا کہ چند لوگوں نے کہا کہ یہ کتاب اگر اردو میں بھی آجائے تو کیا عجب کہ زبان کے لئے مفید

اور دلچسپ ساماں ہو جائے سب کی نظر انتخاب فقیر محمد خاں گویا پر پڑی جنھوں نے اس کا ترجمہ کرنا شروع کیا لیکن حقیقت میں گویا نے ترجمہ ہی تک اپنے دہن رسا کو محدود نہیں رکھا بلکہ غور کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ رائے نام ترجمہ ہے ورنہ گویا نے عبارت کے لحاظ سے تصرف سے کام لیا ہے جہاں یہ دیکھا کہ اصل کتاب میں قصہ کسی موقع پر طولانی سے طبیعت میں اُلجھن پیدا ہوتی ہے تو وہاں اختصار سے کام لیا ہے جہاں اصل کتاب میں کوئی مزیدار بات مختصر لکھ دی گئی ہے وہاں دلچسپی کو مدنظر رکھتے ہوئے بیان کو کسی قدر طول دیا ہے

اس کتاب میں گویا نے عربی اور فارسی الفاظ ضرورت سے زیادہ استعمال کئے ہیں جس کی وجہ سے روانی اور شگفتگی کم ہو گئی ہے مگر یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ گویا کا زمانہ آج کا زمانہ نہ تھا کہ جس میں لوگ فارسی اور عربی سے بیگانہ ہو گئے ہیں بلکہ اس وقت فارسی اور عربی کا عام چرچا تھا۔ اسی وجہ سے گویا کی یہ کتاب بہت مقبول ہوئی ایسی اس کتاب کے متعلق گویا نے جو خود رائے ظاہر کی ہے وہ بھی دیکھنے کے قابل ہے۔ لکھتے ہیں: "جس نے انوار سہیلی کو دیکھا ہوگا آپ نظر تامل سے مطالعہ کرے گا اس پر خود منکشف ہو جائے گا کہ گویا صورت کتاب کی اور ہی ہو جائے گی رائے نام ترجمہ کیا جاتا ہے ورنہ یہ کتاب حقیقت میں جدا جدا ہے لیکن حق یوں ہے کہ یہ احساں نقاش اول کا ہے۔ ورنہ مجھ سے بے مایہ کو کہاں طاقت اس کے بیان کی تھی۔"

اس لحاظ سے گویا کے اس ترجمہ کو جس کا نام انھوں نے بستان حکمت رکھا ہے تصنیف کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا بستان حکمت سنہ ۱۲۵۱ھ بوقت صبح صادق ختم ہوئی گویا کا انتقال سنہ ۱۲۶۶ھ مطابق سنہ ۱۸۵۰ء میں ہوا ان کا دیوان اُن کے مرنے کے بعد شائع ہوا

# مرزا رجب علی بیگ سرور

ان کے والد کا نام مرزا اصغر علی تھا۔ سرور لکھنؤ ہی میں پیدا ہوئے اور یہیں تعلیم و تربیت پائی۔ سال پیدائش ۱۲۱۲ھ ہے۔ سرور نے محض عربی اور فارسی کی تعلیم یہیں حاصل کی۔ مختلف فنون مثلاً خطاطی، موسیقی میں بھی وہ دستگاہ رکھتے تھے۔ مزاح میں شگفتگی، ظرافت کی حد تک تھی۔ نہایت یار باش آدمی تھے۔ مرزا غالب ان کے دوستوں میں تھے۔ چنانچہ ان کی دو کتابوں پر مرزا نے تقریظیں بھی لکھی ہیں۔

۱۲۴۰ھ میں حاری الدین حیدر نے کسی بات پر ناراض ہو کر سرور کو جلاوطن کر دیا لیکن نصیر الدین حیدر نے پھر سرور کو لکھنؤ بلا لیا اور ۱۸۴۶ء میں واجد علی شاہ نے اپنے درباری شعراء میں پچاس روپے ماہوار کی جگہ دی لیکن جب سلطنت کو زوال ہوا تو سرور کا بھی کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ کچھ دنوں تک ادھر ادھر سے اعانت ہوتی رہی۔ بالآخر ۱۸۵۷ء میں کوئی بھی سہارا نہ رہ گیا۔ ۱۸۵۹ء میں مہاراجہ ایشری پرشاد رائس سنگھ والی سارن نے اپنے یہاں بلا لیا۔

سرور کو اکثر دہلی، لکھنؤ، میرٹھ اور راجپوتانہ بھی جانا پڑا جیسا کہ ان کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے۔ آنکھ کے علاج کے لئے کلکتہ بھی دیکھ آئے تھے۔ ۱۸۶۷ء میں سارن میں انتقال ہوا۔

سرور کا سب سے بڑا کارنامہ فسانۂ عجائب ہے۔ یہ ایک حسن و عشق کا افسانہ ہے جس کی عبارت نہایت پرتکلف مقفیٰ اور مسجع ہے۔ ہر جگہ رنگینی اور دلکشی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کسی زمانے میں یہ رنگ پسند عام تھا۔ یہ کتاب نہایت پسندیدہ نظروں سے دیکھی جاتی تھی۔ اب زمانہ کا رنگ بدل گیا جس طرح سرور وغیرہ سیدھی سادی عبارت کو ہیچ سمجھتے تھے اسی طرح اب ان کی تصنیفات بھی عبارت

کی وجہ سے مایوسیدگی کی شکار ہیں اس میں شک نہیں کہ یہ طرز تحریر تکلیف دہ اور غیر وسیع ہے لیکن حالات کو آسانی اور آزادی کے ساتھ نہیں لکھ سکتے کیونکہ ہر قدم پر قافیہ، تشبیہ، استعارے کے علاوہ وزن کی تلاش رہتی ہے اس میں قابلیت اور زبان پر پوری دست رس کی سخت ضرورت پڑتی ہے فسانۂ عجائب کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک معمولی قصے کو بھی ایک اچھا انشا پرداز کیونکر دلکش اور رنگین بنا سکتا ہے

سرور کی تصانیف کئی ایک ہیں تسخیر حالی کا ترجمہ واحد علی شاہ کے حکم سے ۱۸۴۷ء میں کیا اور اس کا نام سرور سلطانی رکھا یہ فردوسی کے شاہ نامہ سے ماخوذ ہے 'حدائق العشاق' کا ترجمہ مہاراجہ ایشری پرشاد رائے سنگھ کی فرمائش سے کر کے "گلزار سرور" نام رکھا ان کے علاوہ چند کتابیں اور بھی ہیں جن میں کچھ چھوٹے چھوٹے قصے ہیں انشائے سرور" اور "گفتگو محبت" بھی ان کی یادگار ہیں

سرور کی تحریر کا ہر جگہ وہی عالم ہے جو فسانۂ عجائب کے متعلق لکھا گیا ہے اس میں شک نہیں کہ اس رنگ کے لکھنے والوں میں سرور کا پایہ سب سے بلند ہے۔

## غالب

خدا کی دین کہ جس طرح ان کا مرتبہ نظم میں عدیم المثال ہے ویسا ہی نثر کے میدان میں بھی اپنی سادگی البتہ لہجہ اور یکسانیت کی وجہ سے بے نظیر ہے تعجب تو یہ ہے کہ نظم میں جو شخص دقیق الفاظ کا گرویدہ ہو وہ نثر کے میدان میں آ کر اس قدر سہل سلیس شیریں اور دلچسپ طرز کا دلدادہ کیونکر ہوا۔

سب سے قابل قدر اور اہم بات جس کا اثر اردو پر پڑا وہ غالب کے خطوط

اور رقعات ہیں جن میں انھوں نے ایک نرالا ڈھنگ اختیار کیا ہے یعنی القاب و آداب کا فرسودہ طریقہ چھوڑ کر وہ روش اختیار کی کہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی سامنے بیٹھا ہے جس سے مخاطب ہوتے ہیں کبھی میاں کبھی مہاراج اور کبھی مکتوب الیہ کا نام لے کر حال لکھنا شروع کر دیتے ہیں حالات بھی اس قدر دلچسپ پیرائے میں لکھتے ہیں کہ دل پر فوراً اثر ہو۔ موقع اور محل کا ہر جگہ لحاظ رہتا ہے جہاں کسی مسطر کا لقتہ کھینچتے ہیں وہاں معلوم ہوتا ہے کہ وہ چیز پوری طرح مسطروں کے سامنے آگئی۔

ان کے خطوط سے ان کے مزاج کی شوخی اور مزاج جا بجا مترشح ہیں جس سے سنگینی دوبالا ہو جاتی ہے۔ ان ہی خطوط میں ایسے خطوط کی بھی کافی تعداد ہے جن میں ادبی اور علمی بحث ہے۔

خطوط کے علاوہ بھی مرزا عالت کا نثر میں کارنامہ ہے جس میں چند تقریظیں دیباچے اور رسالے ہیں جو رہاں قاطع کی موافقت میں لکھے گئے ہیں لیکن تقریظوں اور دیباچوں میں مسجع اور مقفیٰ عبارتیں ہیں جو کم و بیش رجب علی سرور کے رنگ میں ہیں۔ عالتاً اس زمانے کے لوگوں کا مذاق دیکھ کر مرزا عالت نے اس تحریر کو بھی روا رکھا سب سے بڑی چیز ان کے خطوط اور رقعات ہیں جن کی وجہ سے اردو نثر میں سادگی صفائی اور روانی پیدا ہو گئی اور اس کی دلکشی اتنی عام ہوئی کہ اردو ادب کو ایک میدان مل گیا جس پر آج تک لوگ گامزن ہیں۔

## ماسٹر رام چند

ان کا ذکر "سیر المصنفین" جلد اول میں یوں لکھا ہے کہ پہلے آپ سرکار انگلشیہ کی

ملازمت میں رہ عہدۂ مدرسی علوم انگریزی کی تعلیم دہلی کالج میں دیتے تھے۔ مولوی محمد حسین آزاد، مولوی نذیر احمد اور مولوی ذکاء اللہ وغیرہ آپ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے انھوں نے سخت مباحثے کے بعد عیسائی مذہب اختیار کر لیا تھا آپ ریاست پٹیالہ میں ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم بھی مقرر ہو گئے تھے

ماسٹر رام چندر کی علمی قابلیت انگریزی تک محدود نہ تھی بلکہ عربی، فارسی، اردو میں بھی اچھی دستگاہ رکھتے تھے اور انھیں زبانوں کے فیض سے آپ نے ایک کتاب ایسی تصنیف کی جس نے ان کا نام اب تک زندہ رکھا ہے اس کتاب کا نام تذکرۃ الکاملین ہے۔ اس میں دنیا کے بہت سے نامور اہل فن کا تذکرہ ہے

آپ نے اردو کی صرف یہی خدمت نہیں کی بلکہ اصول علم ہیئت اور حساب وغیرہ دو اور کتابیں لکھ کر اردو کے خزانے میں اضافہ کیا۔ یہ کتابیں اپنی نوعیت کے لحاظ سے نہ صرف اس وقت قابل قدر تھیں بلکہ آج بھی کارآمد اور ضروری سمجھی جاتی ہیں۔ ان تصانیف کے علاوہ کئی ایک کتابوں کے ترجمے بھی ماسٹر رام چندر کی یادگار ہیں۔ ان ترجموں کا موضوع زیادہ تر ریاضی ہے

ماسٹر رام چندر کا طرز تحریر نہایت سلیس اور رواں ہے۔ نہ مقفیٰ و مسجع عبارت ہے اور نہ تشبیہہ و استعارات کی بھرمار۔ عربی کے الفاظ جا بجا ضرور ہیں لیکن نہایت سلیقے کے ساتھ صرف کئے گئے ہیں۔ زیادہ تر عام فہم اور روزمرہ کے الفاظ استعمال کئے ہیں ماسٹر رام چندر کی ولادت غالباً ۱۸۱۷ء میں ہوئی تھی وفات کا سال معلوم نہیں۔

# غلام امام شہید

ان کے والد کا نام شاہ غلام محمد تھا۔ قصبہ امیٹھی ضلع لکھنؤ کے رہنے والے تھے

لکھنؤ کے سربرآوردہ شعرا میں شمار کئے جاتے تھے مسلم میں قتیل اور مصحفی کے شاگرد تھے فارسی نثر و نظم میں آغا سید اسمٰعیل مازندرانی سے اصلاح لی تھی

الہ آباد میں متیکار رہتے تھے لیکن آپ کی قدر و منزلت ہر جا بطرف ہوتی تھی، چنانچہ حیدرآباد سے چار سو تیس روپے سالانہ بطور وظیفہ کے مقرر تھے جو آخیر وقت تک ملتے رہے

نواب کلب علی خاں بھی آپ کی بڑی عزت کرتے تھے۔ شہید اپنا کلام جمع نہیں کرتے تھے لیکن زمانہ کے دست و برد سے جو کچھ بچ رہا ہے وہ مجموعہ میلاد شریف، التشائے بہار، حرماں اور چند قصائد و غزلیات ہیں۔

آپ کی تحریر پرانے زمانے کے رنگ کی تھی یعنی قافیہ پیمائی اور رنگینی سے عبارت خالی نہیں لیکن پھر بھی سلاست اور دلچسپی ہاتھ سے نہیں جانے پائی۔ یہاں میں شاعرانہ تصرف ضرور ہے لیکن زور بھی کافی ہے۔ تاج گنج کے روضہ کی جو تعریف لکھی ہے وہ اس رنگ کے لحاظ سے بہتر ہے مگر بطرز عصر تصنع اور مبالغہ کے پردے میں رہ جاتا ہے

## غلام غوث بیخبر

ان کے والد کا نام خواجہ حضور اللہ تھا بزرگوں کا اصلی وطن کشمیر تھا لیکن خواجہ حضور اللہ کشمیر سے تبت چلے گئے تھے اور وہاں سے ریاست بیجاپور میں آکر بود و باش اختیار کر لی تھی۔ بیخبر غلام غوث ۱۲۴۴ھ میں پیدا ہوئے ابھی ان کی عمر صرف چار سال کی تھی کہ ان کے والد کو بیجاپور چھوڑ کر سارس آنا پڑا چنانچہ ان کی نشو و نما اور تعلیم و تربیت یہیں ہوئی اور ۱۸۴۴ء

میں اپنے خالو خاں بہادر مولوی سید محمد خاں کی ماتحتی میں خویش لفٹنٹ گورنر ایک معزلی و شمالی کے میر منشی تھے ملازم ہو گئے اور نہایت خوبی کے ساتھ فرائض سپرد انجام دیتے رہے ۱۸۸۵ء میں پنشن لی اور خاں بہادر و ذوالقدر کا خطاب عطا ہوا۔ اور ۱۹۰۵ء میں انتقال ہوا

بیخبر کی دو تصنیفیں یادگار ہیں ایک کا نام "خوشبائے جگر" اور دوسری کا "مقالات بے خبر" ہے۔ اس وقت کے اشتہار داروں میں بے خبر بہت مشہور تھے۔ ان کی عبارت میں رنگینی اور تصنع صرف رہے لیکن مقفیٰ و مسجع نہیں نہ فارسی اور عربی کی بھرمار ہے تشبیہ اور استعارے سے بیخبر کو کافی دلچسپی ہے رعایت لفظی اور مبالغہ سے بھی روا رکھتے ہیں چنانچہ ایک جگہ غلام امام شہید کی تعریف میں کہتے ہیں "اب ان کی اردو سے سودا کی روح کو سودا ہوگا تیرا یا مرا غنیمت جانے گا ہوس کو پہلے ہی جوش سودا تھی جو یہ تخلص اختیار کیا یعنی درپردہ محبت چاہی کہ میں تو ہوس کرتا ہوں کمال حق ادا کسی کا ہے۔ سودا کو بھی ان کی خبر پہنچ گئی تھی کہ آتش رشک سے جل کر یہ تخلص اپنے حسب حال رکھا۔ ناسخ اب ہوتا تو تصحیح سے تخلص اپنا صحیح متہور کرتا۔ آتش نہ مرتا تو کیسا جلتا۔

یہ مختصر سی فہرست اور کارنامہ ان لوگوں کا ہے جنہوں نے صورت قدیم کے ماہر رہ کر اردو کی خدمت کی تھی۔ ان کے علاوہ اور بھی بے شمار ادیب ہیں جن کو طول کلام کی وجہ سے سطر انداز کرنا پڑا یہاں تک صرف یہ لکھنا مقصود تھا کہ عدر یا عدر کے قریب تک اردو زبان کس حد تک ترقی کر چکی تھی لیکن یہ تاریخ نامکمل رہ جائے گی اگر ہم دہلی کالج سوسائٹی کا تذکرہ نہ کریں۔ یہ سوسائٹی ۱۸۴۲ء میں قائم ہوئی تھی اور انگریزی سے اردو میں بہت سی کتابیں اس کے زیر اہتمام شائع ہوئیں۔

جون ۱۹۲۰ء کے معارف میں سید سلیمان ندوی کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں موصوف نے اردو کی ان کتابوں کی فہرست دی ہے جو انڈیا آفس لندن میں انھوں نے دیکھی تھیں اسی فہرست کے متعلق لائق مضمون نگار نے لکھا ہے کہ "مطبوعہ اردو کتابوں کی اہمیت بھی یہاں میری نگاہ میں کچھ کم نظر نہ آئی اور تھوڑی دیر کے لئے مجھے مسرور ہونا پڑا کہ اللہ اللہ ہماری زبان بھی اس قدر ترقی یافتہ ہے کہ تین سو صفحے میں اس کی فہرست تیار ہوئی ہے یہ فہرست ۱۹۱۰ء میں چھپی ہے اس لئے موجودہ بیسویں صدی کی کتابیں اس فہرست میں شامل نہیں ہیں اس فہرست کو دیکھ کر تعجب ہوا کہ اردو زبان عہد کے پہلے ہی سے ایک علمی زبان بن رہی تھی دوسری بات یہ نظر آئی کہ اس زبان کو علمی زبان بنانے میں مسلمان اور ہندو دونوں اہل قلم کا برابر کا ساتھ ہے"

فہرست مذکورہ بالا میں چھ موضوعات پر کتابیں نظر آتی ہیں اور ہر ایک کا آمد اور قابل قدر ہر ایک عنوان ملاحظہ ہو۔

۱۔ علوم و فنون جس میں زراعت، صنعت و حرفت، ہیئت و نجوم، اخلاق، علم الحساب، موسیقی، طبیعیات وغیرہ شامل ہیں ۲ تاریخ و جغرافیہ اس میں عام تاریخ اور سوانح عمری بھی ہے۔ ۳ ادبیات اس میں ڈراما تنقید، دواوین، قصص وغیرہ ہیں ۴۔ کتب تعلیمی اس تحت میں قواعد مختلف زبانوں کی ریاضیات، علم المساحت، علم وزن و پیمائش سب ہی کچھ ہیں ۵ الٰہیات مختلف مذاہب کے عقائد و مسائل کے علاوہ مناظرہ و مباحثہ کی کتابیں بھی ہیں ۶ متفرقات اس میں تقریروں اور مضمونوں کا مجموعہ ہے بچوں اور عورتوں کی تعلیم کے متعلق رائے زنی کی گئی ہے

اس فہرست میں کتابوں اور مصنفوں کے نام بھی دئے ہیں اور جملہ کتابیں چھپی ہوئی "انڈیا آفس لندن" میں موجود ہیں مگر بدقسمتی سے عالباً ہندوستان میں نہیں

ہیں کہ کوئی تقید کی جائے۔ بہرحال یہ زور یہ روش کی طرح ظاہر ہے کہ اردو زبان غدر سے پہلے ہی علمی زبان بن گئی تھی اس فہرست کو چھوڑ کر جن کتابوں اور مصنفوں کا ذکر ہم نے اس دور میں کیا ہے ان کو دیکھتے ہوئے اگر فورٹ ولیم کالج سے باہر نکلئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان کی عبارت عام طور پر رنگین اور کبھی کبھی مقفیٰ اور مسجع بھی ہے۔ زور کلام بیشک پہلے سے زیادہ ہے

معلمہ اور ماتوں کے جنھوں نے اردو کی ترقی میں مدد دی ایک چھاپہ کی ایجاد بھی تھی ڈاکٹر جان گل کرائسٹ کے وقت میں لوہے کے حروف کا رواج ہوا جس میں فورٹ ولیم کالج سے اکثر کتابیں شائع ہوئیں مگر اول تو خرچ زیادہ پڑتا اور دوسرے حروف زیادہ خوبصورت نہ تھے جس سے مقبول عام نہ ہو سکے۔

۱۸۳۰ء میں لیتھو کا کارخانہ کان پور میں کھولا گیا۔ جو لوہے کے حروف سے بہتر ثابت ہوا۔ دلی میں بھی ایک ایسا ہی چھاپہ خانہ ۱۸۳۷ء میں کھولا گیا نصیر الدین حیدر نے کان پور سے مسٹر ارچر (جنھوں نے کان پور میں لیتھو کی ابتدا کی تھی) کو لکھنؤ بلایا اور یہاں بھی ایک عمدہ چھاپہ خانہ قائم کر دیا جس کی وجہ سے کتابوں کی اشاعت میں بہت بڑی سہولت ہو گئی۔ چھاپہ کی بدولت اردو میں اخبارات بھی نکلنے لگے جس سے لوگوں کو نہ صرف حالات ہی معلوم ہونے لگے بلکہ مغربی خیالات کا بھی اندازہ ہوا۔ جس سے متاثر ہو کر اردو کا انداز بیان بھی بدلا جانا ضروری سمجھا گیا اب اردو کی یہ قدر و منزلت ہوئی کہ ۱۸۳۲ء میں بجائے فارسی کے سرکاری زبان قرار دی گئی کیونکہ فارسی سے بے زار ہو کر اس وقت تک اردو اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو گئی تھی

# ۳

# نثر کی ترقی

## سرسیّد

آپ کی ولادت دہلی میں ۱۸۱۷ء میں ہوئی۔ ان کے آباؤ اجداد شاہجہاں کے وقت میں داماں ہمہ داں اور ہرات میں کام کرتے ہوئے ہندوستان آئے اور اسی وقت سے شاہی دربار میں رسائی ہوئی جس کا سلسلہ عالمگیر ثانی کے وقت تک قائم رہا۔ جنھوں نے سرسید کے دادا کو خواجہ والد دولہ کا خطاب بھی دیا۔ اکبر شاہ ثانی نے سرسید کے والد میر متقی کو عہدۂ وزارت کے لئے نامزد کیا مگر انھوں نے اپنی قناعت پسندی کی وجہ سے انکار کر دیا۔

سرسید کی تعلیم و تربیت ان کی والدہ کے زیر سرپرستی ہوئی۔ ۱۸۳۷ء میں سرسید نے ملازمت کر لی اور رفتہ رفتہ ترقی کر کے صدر امین کے درجہ تک پہنچ گئے۔ علم کا ذوق ایسا نہ تھا جس کو کبھی وہ بھول سکتے۔ کتابوں کا مطالعہ ہمیشہ کرتے رہے چنانچہ ملازمت ہی کی حالت میں اپنی مشہور کتاب "آثار الصنادید" تصنیف کی اور بھی کئی کتابیں نوکری کے زمانے میں لکھیں۔ ۱۸۶۲ء میں جب غازی پور

بدل کر آئے تو یہاں ایک سائنٹیفک سوسائٹی قائم کی جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان مغرب کی ترقی اور حالات سے آگاہ ہوتے رہیں۔ اس سوسائٹی میں اکثر رسالے مختلف موضوعات پر نکالے گئے جن میں زراعت اور اقتصادیات بھی شامل ہیں

۱۸۶۱ء میں انگریزی اسکول مراد آباد میں اور ۱۸۶۴ء میں دوسرا اسکول غازی پور میں کھولا اور ایک انجمن قائم کی جس کا نام برٹش انڈیا ایسوسی ایشن تھا ان کو مسلمانوں کی اصلاح کا خیال شروع سے تھا چنانچہ ۱۸۶۹ء میں ولایت جا کر وہاں کے لوگوں کے اخلاق اور طرزِ معاشرت کا معائنہ اس لئے کیا کہ ہندوستان چل کر یہاں کی عمدہ باتوں کو مسلمانوں میں رائج کیا جائے سال بھر کے بعد ہندوستان واپس آئے اور یہاں آکر منصوبے کی تکمیل کے لئے رسالہ "تہذیب الاخلاق" جاری کیا جس میں مذہبی اور اخلاقی مضامین ہوتے تھے۔ منشا یہ تھا کہ مسلمانوں کے خیالات میں وسعت اور ترقی پیدا ہو جائے۔

سرسید کا سب سے بڑا کارنامہ علی گڑھ کالج ہے بیس برس کے بعد انھوں نے اس کالج کی ترقی کے لئے ہمہ تن کوشش ہو کر کام کیا ۱۸۷۷ء کے شروع میں کالج کا بنیادی پتھر لارڈ لیٹن کے ہاتھوں سے رکھا گیا۔ اس وقت سے سرسید نے مرتے دم تک جس جانکاہی اور دور اندیشی سے اس کالج کی ترقیوں کی فکر کی ہے وہ ایسی مثال آپ ہے ۱۸۹۸ء میں سرسید نے طویل عمر پا کر انتقال کیا اور اپنے محبوب کالج کی مسجد میں دفن کئے گئے۔

قوم اور ملک کے ساتھ جو کچھ سرسید نے احسان کیا وہ ہمارے موجودہ موضوع بحث سے دور ہے فی الحال ہم کو اردو ادب سے سروکار ہے اور صرف یہ لکھنا ہے کہ سرسید نے اردو کی کیا خدمت کی۔ مسلمانوں کی ترقی کے لئے ان کو یہ خیال ہوا کہ جب تک ان کی مادری زبان کی ترقی نہ ہوگی، قومی ترقی بھی مشکل

سے ہوگی۔ لہٰذا انھوں نے اس کی بھی اصلاح کی فکر کی۔ سرسید سے پہلے جیسا آپ نے دیکھا ہوگا رنگین مقفیٰ اور مسجع عبارت پسند عام تھی۔ جس میں خیالات کا اظہار آسانی سے نہیں ہو سکتا تھا۔ بیشک مرزا غالب نے خطوط میں سلاست اور سادگی اختیار کی لیکن کوئی علمی کارنامہ مشکل سے اس انداز بیاں کے ساتھ لکھا گیا ہوگا۔ ہمارے نزدیک غالباً سرسید پہلے شخص ہیں جنھوں نے اردو نثر میں بھی مضامین کو سادگی، متانت کے ساتھ لکھنا شروع کیا

سرسید کی عبارت عام طور سے تشبیہات و استعارات و صنائع و بدائع سے پاک ہے جس بات کو لکھتے ہیں اس کو دلیل سے مضبوط کرنے کی پوری کوشش کرتے ہیں انتہائی مشکل مضمون کو نہایت آسانی کے ساتھ ادا کر جاتے ہیں ان کی تحریر میں سچائی اور بے باکی خاص جوہر ہیں الفاظ نہایت سیدھے سادے اور روزمرہ کے استعمال کرتے ہیں کہیں کہیں مدلل سنجیدگی اور شگفتگی بھی پائی جاتی ہے منظر اور موقع کی تصویر الفاظ سے نہایت خوبی کے ساتھ کھینچتے ہیں اتنا ضرور ہے کہ عبارت کبھی کبھی بے لطف و ناہموار ہو جاتی ہے وہ اپنے جوش اصلاح اور اظہار خیال میں اتنے آزاد تھے کہ قواعد کی پابندی اپنے لئے زیادہ ضروری نہیں سمجھتے تھے جو لفظ ان کا مفہوم پورا کرتا ہوا دکھائی دیتا تھا اس کو فوراً استعمال کر جاتے تھے عبارت کبھی کبھی گالی اردو کا مزہ دے جاتی تھی محاورے بھی کبھی کبھی ثقیل آجاتے ہیں لیکن جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ پہلا قدم اصلاح کے لئے اٹھتا ہے تو کتنی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تب معمولی خامیاں بھی بے وقعت نظر آتی ہیں۔

یوں تو سرسید کی تصانیف کئی ایک ہیں مثلاً "خطبات احمدیہ" "آثار الصنادید" "تاریخ سرکشی بجنور" وغیرہ لیکن سب سے زیادہ اثر اردو پر تہذیب الاخلاق کا پڑا

جب مذہبی چھیڑ چھاڑ اس رسالہ میں شروع ہوئی تو جواب دینے والوں نے بھی خوش قسمتی سے وہی طرز بیان اختیار کرنے کی کوشش کی جو خود سرسید کا تھا اور چونکہ یہ سلسلہ عرصہ تک قائم رہا لہذا ایک اچھا ذخیرہ سلیس اور عام فہم اردو زبان کا تیار ہو گیا۔ رفتہ رفتہ لوگ اسی رنگ میں لکھنے کے عادی ہو گئے چنانچہ اس وقت سے ہر اخبار نویس نے یہی روش اختیار کر لی

# محسن الملک

ان کا نام سید مہدی علی تھا۔ اٹاوہ کے رہنے والے تھے ۱۸۳۷ء میں وہیں پیدا ہوئے عربی فارسی کی معمولی تعلیم حاصل کر کے ۳۰ روپیہ ماہوار پر کلکٹری میں ملازم ہو گئے رفتہ رفتہ ترقی کر کے اہلمد اور سررشتہ داری کے مدارج کو طے کرتے ہوئے ۱۸۶۱ء میں تحصیلدار ہو گئے۔

لکھنے پڑھنے کا شوق شروع ہی سے تھا چنانچہ ملازمت کی حالت میں قانون کی دو کتابیں لکھیں جو عام طور پر پسند کی گئیں۔ ۱۸۶۳ء میں مہدی علی ڈپٹی کلکٹری کے درجے تک پہنچ گئے

۱۸۷۴ء میں ریاست حیدرآباد نے ان کو اپنے یہاں کا اسسٹنٹ جنرل مالیات بارہ سو روپیہ ماہوار پر مقرر کر دیا۔ اپنی کارگزاری کی بدولت ریاست میں بھی انھوں نے بڑی ترقی کی رفتہ رفتہ اعلیٰ معتمد مال تین ہزار روپیہ ماہوار پر ہو گئے جس خدمات پر ریاست کی طرف سے محسن الدولہ محسن الملک میر یار جنگ کا خطاب عطا ہوا۔ ۱۸۹۳ء میں پنشن لے کر علی گڑھ چلے آئے اور بقیہ عمر قومی خدمت اور کالج کے انتظام میں صرف کی چنانچہ سرسید کے بعد علی گڑھ کالج کے سیکرٹری بھی ہو گئے۔

۱۹۰۸ء میں علیگڑھ میں انتقال ہوا مگر علی گڑھ میں سرسید کے برابر دفن کیے گئے۔

سرسید کی خصوصیات محسن الملک میں بھی نظر آتی ہیں خواہ اس کو آپ سرسید کی ذہانت کہیے یا ان کے ذاتی جوہر یہی کیجیے۔ بہرحال انھوں نے سرسید کی طرح ہر مسئلہ پر آزادانہ گفتگو کی ہے اور بہت سے مضامین اس سلسلے میں لکھے ہیں۔ معمولی خواہ اخلاقی یہ دینی مذہبی یہ مباحث (لیل اور ملاس) کے ساتھ لکھے ہیں عبارت عام طور سے سلیس اور صاف ہوتی ہے کہیں کہیں پر ایسے طرز کی تنقید یا رنگینی بھی پیدا ہو جاتی ہے کبھی کبھی صنائع بدائع سے بھی کام لے لیتے ہیں مثلاً کی اور تاثیر محسن الملک کی خصوصیات ہیں جو اُن کی تحریر میں تمام نمایاں ہیں

محسن الملک اپنی خوش گویائی کی وجہ سے اپنے ہمعصروں میں سب سے زیادہ ممتاز تھے ان کی تقریر میں کہیں کہیں طرنہ ٹکڑے نہایت پُرلطف اور کارآمد نظر آتے ہیں جوش بیان، زور تحریر، توازن عبارت و خیال جتنا محسن الملک کے یہاں ہے اس کے کسی ہمعصر کے یہاں نہیں۔ ڈاکٹر عابد حسین مگر امی اپنی تصنیف "چند تنقیدی مضامین" میں رقمطراز ہیں کہ ان کا اسلوب بیان اس صداقت کا اظہار ہے جو کہ خود اُن کا ایمان تھا۔

# چراغ علی

چراغ علی کے بزرگوار کشمیر کے رہنے والے تھے لیکن ان کے دادا اپنا سلسلۂ ملازمت بجا لاتے چلے آئے بعد میں میرٹھ میں سکونت اختیار کر لی۔ چراغ علی کے والد کا نام مولوی محمد اسحٰق تھا چراغ علی ۱۸۲۶ء میں پیدا ہوئے تھے ان کے والد کا انتقال ۱۸۵۶ء میں ہوا گویا دس سال کے سن میں سایہ پدری سے محروم ہو گئے۔

چراغ علی نے اپنی دادی اور والدہ کے زیر سایہ ابتدائی تعلیم حاصل کی لیکن

بہت معمولی طور سے گو انگریزی فارسی اردو سب کچھ پڑھا لیکن ایک محدود درجے تک گھر کی ذمہ داریوں نے فرصت نہ دی کہ یکسو ہو کر تحصیلِ علم کرتے فکرِ معاش نے مجبور کر دیا چنانچہ گھر چھوڑ کر ضلع بستی کے محکمۂ جرائم میں تیس روپیہ ماہوار پر نوکری کر لی مگر علمی ذوق جو اُن کی فطرت میں تھا وہ چین نہ لینے دیتا تھا مطالعۂ کتب فرصت کے وقت جاری رہتا اور علمی قابلیت یہاں تک بڑھائی کہ کئی زبانوں کے ماہر ہو گئے نہ صرف عربی اور فارسی کے عالم تھے بلکہ انگریزی لاطینی اور یونانی سے بھی واقف تھے انگریزی زبان میں کتابیں بھی لکھیں جن کی تعریف انگلستان کے اخبارات میں بھی کی گئی۔

چراغ علی نے نہ صرف علمی ترقی کی بلکہ ملازمت میں بھی ممتاز عہدہ پر پہنچ گئے رفتہ رفتہ ترقی کر کے ڈپٹی مصرفی اور تحصیلداری تک پہنچے۔ ان کو مذہبی مباحث میں بھی کافی دلچسپی تھی تقریر بھی کرتے تھے اور مضامین بھی لکھتے تھے جس کی وجہ سے سرسید سے تعارف حاصل ہو گیا جس کی کوششوں سے چراغ علی کو حیدرآباد میں جگہ مل گئی۔ اور وہاں نہ عہدۂ مددگار معتمد مال گذاری چار سو روپیہ ماہوار پر مقرر ہو گئے اپنے فرائض کو اس قابلیت اور جوش اصلاحی سے انجام دیا کہ رفتہ رفتہ ترقی کر کے معتمد مال کے جلیل القدر مرتبہ پر فائز ہوئے۔ ان کا انتقال ۱۸۹۵ء میں ہوا۔

چراغ علی کی ترقی کا راز ان کی قابلیت، صداقت اور دیانتداری میں مضمر ہے سرکاری کام کو وقت پر انجام دیتے اس کے بعد جو وقت بچتا تھا اس میں پڑھنے لکھنے کا شغل برابر جاری رہتا مشکل سے کوئی لمحہ بیکار جانے دیتے تھے۔ بہت سی کتابیں سرکاری امور پر مثلاً سحٹ، جاگیرات وغیرہ پر لکھیں جو نہایت قدر کی نگاہوں سے دیکھی گئیں علاوہ ان کے مذہبی کتابیں بھی کئی ایک ہیں۔

تہذیب الاخلاق میں بھی آپ کے مضامین برابر نکلتے رہے

چراغ علی کی تصانیف دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مضامین کو دلائل سے مضبوط کرنے کے عادی ہیں اچھے بُرے دونوں پہلوؤں پر نظر رکھتے ہیں ان کی نظر زیادہ تر نفس مضمون پر رہتی ہے ادھر ادھر کی باتوں میں نہیں الجھتے۔ واقعات کی چھان بین میں انتہائی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن ان کی تصانیف میں ادبی شان بہت کم ہوتی ہے۔ عبارت عام طور سے روکھی پھیکی ہے عبارت آرائی و رنگینی مفقود ہے

چراغ علی کا انتقال ۱۵ جون ۱۸۹۵ء کو بمبئی میں ہوا۔ ان کو تمام باتوں سے زیادہ مذہب سے دلچسپی تھی اس لئے ان کی تصانیف کا موضوع زیادہ تر مذہب ہی ہے

# آزاد

آزاد کے حالات نظم کے حصے میں لکھے جا چکے ہیں۔ یہاں ہم کو صرف ان کی نثری خدمات کا تذکرہ کرنا ہے حقیقت یہ ہے کہ آزاد کا مرتبہ خدمات اور احسانات کی وجہ سے قریب قریب اردو کے تمام اساتذہ اردو سے بلند نظر آتا ہے۔

آزاد کی ہمہ گیری اور تبحر علمی اور اردو کی محبت نے اردو ادب کو نئے نئے خیال اور مضامین سے نکال کر کئی ایک نئے میدان دکھائے نظم کے سلسلے میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ نظم جدید کی ایجاد کا سہرا آزاد ہی کے سر ہے نثر میں آب حیات لکھ کر انھوں نے نہ صرف اردو ادب کی تاریخ کو صحیح راستہ پر لگا دیا بلکہ فن تنقید کا بھی معیار اردو میں قائم کر دیا آب حیات سے پہلے شعرائے اردو کے حو

تذکرے لکھے گئے تھے وہ اس قدر نامکمل تھے کہ صحیح حالات اور کمالات کا پتہ چلنا دشوار تھا آزاد نے اس کی درستی کے لئے ایک عمر تک جانفشانی اور کاوش سے کام لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آبِ حیات ایک ایسی جامع اور مانع تاریخ ادب اردو دنیا کے سامنے پیش کر دی کہ آج تک جو شخص تاریخ ادب اردو کے میدان میں قدم رکھتا ہے وہ بغیر آبِ حیات کی مدد کے قلم نہیں اُٹھا سکتا۔ مصنف گلِ رعنا عالباً آب سے زیادہ آزاد کے نکتہ چیں ہیں لیکن آبِ حیات اور گلِ رعنا کے مضامین کو ساتھ رکھ کر پڑھئے تو بعض مقامات ایسے ملیں گے کہ جس میں مصنف نے نہ صرف واقعات آبِ حیات سے لئے ہیں بلکہ پارہ کا پارہ آبِ حیات ہی کی عبارت سے بغیر کسی اعتراف کے آزادی کے ساتھ لیا ہے۔ عجب کیا ہے کہ آزاد آبِ حیات لکھتے وقت میر انیس کا شعر پڑھتے جاتے ہوں ؎

لگا رہا ہوں مضامیں نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

اس کتاب سے اکثر لوگوں کو یہ شکایت ہے کہ آزاد نے تحقیق سے کام کم لیا ہے اس کا جواب مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا نے اپنی کتاب "سیر المصنفین" جلد دوم کے صفحات ۱۷۴ الغایت ۱۷۷ پر جس عنوان سے دیا ہے وہ قابل غور ہے آزاد نے ایک دوسرا میدان بھی اردو ادب کو دکھایا ہے انگریزی اور یونانی ادب سے متاثر ہو کر ایسے اخلاقی اور نتیجہ خیز خیالی فسانوں کی بنیاد ڈالی جو عالباً اردو کے لئے قریب قریب بالکل نئی چیز تھی کیونکہ آزاد کی سیر کہ خیال سے پہلے کوئی مستقل تصنیف اس موضوع پر نہیں ملتی انگریزی میں اس قسم کے افسانوں کا نام ایلی گیری (ALLE GORY) ہے جس کو اردو والے رمزیہ کہتے ہیں اس عنوان پر مولانا کی سیر کہ خیال ایک مستقل کتاب ہے جو مضمون اور طرز تحریر دونوں لحاظ

سے بہت دلچسپ ہے، یہ امر اور بھی قابل داد ہے کہ آزاد انگریزی علم سے بہت کم واقف تھے مگر اس کتاب کے لکھنے میں انگریزی ادب کی پوری پیروی کی ہے۔

تیسرا میدان جو آزاد نے اردو والوں کو دکھایا وہ علم السنہ یا فیلالوجی کا تھا جس میں علاوہ اور باتوں کے الفاظ کی پیداوار، ترقی، تغیر کا ڈھنگ بتایا ہے اس کتاب کا نام سحر سامری فارسی ہے۔

دربار اکبری بھی آزاد کا مقبول کارنامہ ہے یہ شہنشاہ اکبر کے عہد کی تاریخ ہے۔ جس میں تفصیلی حالات کے علاوہ آزاد نے اس بات کے دکھانے کی کوشش کی ہے کہ کس تاریخ میں بھی ادبیت اور دلچسپی کیونکر قائم رکھی جا سکتی ہے۔ غالباً یہ کتاب لارڈ میکالے کی صحیم کتاب تاریخ انگلستان کے تتبع میں ہے

ان کتابوں کے علاوہ آزاد کی اور بھی تصانیف ہیں مثلاً فارسی پڑھنے اردو کے قاعدے اور قواعد اردو قصص ہند قند پارسی نگارستان فارس سیاک اور سیاک، جانورستان وغیرہ۔

آزاد کی خصوصیات میں سب سے نمایاں اور دلکش جوہر ان کی طرز تحریر ہے۔ الفاظ کا انتخاب اور زبان کی شیرینی، محاوروں کی صحت اور صاحب تشبیہ اور استعاروں کی گلکاری سے وہ حسن پیدا ہو جاتا ہے کہ پڑھتے چلے جائیے اور سیری نہیں ہوتی رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں کہ اس (آزاد) کی عبارت کی یہ شان ہے کہ بھاشا کی سادگی اور بے تکلفی، انگریزی کی صاف گوئی اور فارسی کی خوبصورتی اس میں ملی جلی ہوتی ہے وہ تصنعات اور تکلفات سے گو کہ عاری ہے مگر لطیف استعارے اور خوبصورت تشبیہیں اس کے حسن کو دوبالا کرتی ہیں، وہ ایک موسیقیت رکھتی ہے ان کے معاصرین (سلیم مدیر احمد، ذکاء اللہ، حالی وغیرہ)

---

[1] مصنف تاریخ اردو (زبان انگریزی)

ان کو نہایت قدر و عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے ستلی نے تو ان کی موت پر ان کو حدائے اردو کہہ کر یاد کیا تھا۔

آزاد کے قلم کا یہ ادبی کرشمہ ہے کہ مواد خواہ کتنا ہی کم ہو صفحے کے صفحے لکھے چلے جاتے ہیں اور تاثیر و لطف میں کمی نہیں آتی، ان کی عبارت کی ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ تحریر میں لوچ اور موقع پر درد بھی خاص طور پر پیدا ہو جاتا ہے گویا ایک کمان میں دو تیر ہر وقت رہتے ہیں اور جس تیر سے دل پر چوٹ کی جا سکتی ہے اسی کو کام میں لاتے ہیں، آزاد کا قلم سوز و گداز کی تصویر اس خوبی سے اتارتا ہے کہ نثر میں شعر کا درد و اثر پیدا ہو جاتا ہے۔

# ذکاء اللہ

ذکاء اللہ ۱۸۳۲ء میں دہلی میں پیدا ہوئے ان کے والد کا نام ثناء اللہ ہے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۲ برس کی سن میں ذکاء اللہ دہلی کالج میں داخل ہوئے جہاں نذیر احمد اور محمد حسین آزاد بھی پڑھتے تھے۔ چنانچہ ان تینوں آدمیوں میں انتہا درجے کی محبت تھی ذکاء اللہ کو بچپن سے علم ریاضی میں خاص شغف تھا۔ جب پڑھ کر فارغ ہوئے تو اسی کالج میں ریاضی کے پروفیسر ہو گئے جلد ہی وہاں سے نکل کر آگرہ کالج میں فارسی اور اردو پڑھانے لگے ۱۸۵۵ء میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو گئے ۱۸۶۶ء میں ماڈل اسکول دہلی کے مدرس اعلیٰ ہوئے تعداد اہل قابلیت کی سائنٹیفک سنٹرل کالج الہ آباد کے پروفیسر منتخب ہو گئے جہاں یہ دس سال تک عربی اور فارسی کا درس دیتے رہے اور یہیں سے پنشن لے کر حالت لیتی اختیار کر لی تصنیف اور تالیف کا شوق شروع ہی سے تھا۔ ملازمت کی حالت میں بھی

متعدد کتابیں لکھیں اور مرتے دم تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ دکاء اللہ نے جتنے مختلف موضوع پر کتابیں لکھیں اتنی اردو کے کسی ایک انشا پرداز نے ان سے پہلے نہیں لکھیں ان کی طبیعت کی جولانی اور ہمہ گیری کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ ان کا شہسوار قلم ہر میدان میں یکساں رواں ہے ریاضیات طبیعیات حساب علم الاخلاق ہیئت سیاست مدن وغیرہ سب پر انھوں نے طبع آزمائی کی ہے۔

ان کی تصنیف اور تالیف کی فہرست سیر المصنفین جلد دوم میں ۱۴۳ کتابوں کی دی ہوئی ہے جس میں ترجمہ زیادہ ہے لیکن ان کی بعض تصنیفیں نہایت قابل قدر ہیں مثلاً تاریخ ہندوستان جو دس جلدوں میں ہے

دکاء اللہ کی عبارت سلیس اور رواں ہے مگر کسی قدر پھیکا پن بھی ہے تاریخ نویسی میں پیوست کردہ حالات بیان کرنے میں تکلف سے کام لیتے ہیں اسی وجہ سے مناسبت کم ہے تسلی کا ایسا طرز استدلال ہے اور نہ آزاد کی طرح ادبی شان اور شگفتگی۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ بڑے بڑے حالات کو مختصر عبارت میں سلیقہ کے ساتھ لکھ دیتے ہیں ان کی کتابیں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بڑی حد تک مقبول عام ہوئیں۔ برٹش گورنمنٹ کی طرف سے کمال کی داد دی گئی علاوہ خان بہادر اور شمس العلماء کے خطاب کے آپ کو پندرہ سو روپے کا انعام بھی عطا ہوا۔ دکاء اللہ کے کلام پر حالی نے ایک بھبتی میں نہایت جامع اور مانع تنقید کر دی ہے کہ "دکاء اللہ کا دماغ ایک بنیے کی دوکان ہے جس میں ہر قسم کی جنس موجود رہتی ہے" ممکن ہے کہ اس میں یہ بھی لطیف اشارہ ہو کہ بنیے کی دوکان میں عمدہ اور سلیقہ چیزیں کم ملتی ہیں

# حالی

غالباً حالی پہلے شخص ہیں جنھوں نے اردو میں سوانح عمری لکھنا رائج کیا۔ چنانچہ

حیات سعدی اور حیات جاوید سوانح نگاری کی عمدہ مثالیں ہیں اگر یادگار غالب بھی اسی سلسلے میں لے لی جائے تو یہ کہنے میں ذرا بھی تکلف نہیں ہو سکتا کہ تفصیلی حالات کے ساتھ مرنے والوں کے کلام پر بھی ایک بڑی حد تک حالی نے ناقدانہ انداز میں رائے زنی کی ہے اسلوب بیان اور واقعات کی چھان بین کی حد سے ان کتابوں کی بدولت حالی کو اردو کے بہترین انشا پردازوں کے برابر جگہ مل جاتی ہے غالب اور حیات جاوید جس میں غالب اور سرسید کے حالات لکھے ہیں ان کو پڑھ کر کبھی کبھی لوگوں کا خیال ہوتا ہے کہ حالی نے غالب اور سرسید کی تعریف میں مبالغہ سے کام لیا ہے چنانچہ شبلی کا ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ تصویر کا صرف ایک رخ دکھایا گیا ہے معائب سے یا تو چشم پوشی کی گئی ہے یا توجیہہ کر دی گئی ہے یہ خیال ایک حد تک صحیح ہے لیکن اس کا بھی لحاظ رکھنا چاہیئے کہ حالی کو سرسید اور غالب سے جو عقیدت تھی وہ محبت کے انتہائی درجے تک پہنچ چکی تھی جس کی وجہ سے اپنے ہیرو کی وہ خامیاں جو ہم کو سخت معلوم ہوتی ہیں وہ عظمت کی عینک سے اتنی صاف اور ناگوار نہیں دکھائی دیتیں، دوسرے یہ کہ اس سے پہلے سوانح عمری کا کوئی نمونہ بھی نہ تھا جو کچھ حالی نے لکھا وہ بہت غنیمت اور قابل قدر ہے۔ مقدمہ شعر و شاعری میں حالی نے اردو شاعری پر جو تنقید کی ہے وہ کئی لحاظ سے قابل قدر ہے۔ اسی کتاب میں انھوں نے مختلف زبانوں کے خیالات سے جو شعر پر بحث کی ہے اور جا بجا اردو کے لئے اچھی تجویزیں پیش کی ہیں یہ ضرور ہے کہ اس کتاب میں حالی نے اردو شاعری کے معائب بیان کئے ہیں محاسن نظر انداز کر دئے ہیں جس سے تصویر کا صرف ایک رخ دکھائی دیتا ہے

عام طور سے حالی کی عبارت سادگی اور صفائی کی سرمایہ دار ہے عبارت آرائی و رنگینی سے ایک قلم گریز ہے روانی ضرور ہے مگر آب آبشار کی طرح شگفتگی نہیں ہے

ان کی زبان نہایت پاکیزہ اور ٹکسالی ہے۔ محاورات کا خاص طور سے خیال رکھتے ہیں مضمون کے اعتبار سے بعض مطلب کا زیادہ خیال رکھتے ہیں عبارت مسلسل اور مربوط ہوتی ہے جو کچھ دل و دماغ میں آتا ہے اس کو بے تکلف کاغذ پر رقم کر دیتے ہیں لیکن[1] ایک بے اعتدالی سے حالی بھی نہ بچ سکے یعنی انگریزی الفاظ کا غیر ضروری استعمال حالی بھی نذیر احمد سے کم نہیں کرتے۔

# سید علی بلگرامی

سید علی بلگرامی قصبہ بلگرام میں ۱۷۵۱ء میں پیدا ہوئے ان کا خاندان عرصہ سے علم و فضل، جاہ و مرتبہ کے لحاظ سے نہایت ممتاز تھا سید علی کے والد رئیس الدین خاں ڈپٹی کلکٹری سے پنشن لے کر حیدر آباد میں ایک معزز جگہ پر ہو گئے تھے یہ بھی اپنے وقت کے بہت بڑے عالم و فاضل تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے اپنے بیٹے سید علی بلگرامی کی تعلیم کا خاص خیال رکھا۔ پندرہ سال تک محض عربی اور فارسی کی تعلیم دلاتے رہے۔ اس کے بعد سپوت بیٹے نے انگریزی کی طرف توجہ کی ذہن اور حافظہ کی یہ حالت تھی کہ جو دن کے استادوں کو مشکل سے مشکل بات جلد سے جلد سمجھ لیتے اور ہمیشہ کے لئے دماغ میں محفوظ رکھتے اس ذاتی جوہر کا ایک نتیجہ یہ بھی تھا کہ صرف آٹھ سال انگریزی پڑھ کر بی اے کی ڈگری حاصل کر لی اور لطف یہ کہ امتحان میں ان کا ایک مضمون سنسکرت تھا

سید علی کی روز افزوں ترقی دیکھ کر حیدر آباد کے مشہور وزیر مختار الملک سر سالار جنگ بہادر اول نے بلا کر اپنے خاص عملہ میں داخل کر لیا وہاں پہنچنے کے

[1] داستان تاریخ اردو ص ۵۹۲

لہذا انھوں نے سائنس کے علوم کا گہری نظر سے مطالعہ کیا اور تکمیل تعلیم کے لئے یورپ کا سفر اختیار کیا وہاں بھی اپنی قابلیت کا مارہا تھوت دیا علمی تحقیق کا یہ حال تھا کہ حتی زبانوں سے واقفیت انھوں نے حاصل کی تھی۔ اتنی شاید ہی ہندستان میں کوئی ایک آدمی جانتا ہو

عربی فارسی اردو انگریزی جرمنی فرانسیسی اطالیسی سنسکرت۔ بنگالی مرہٹی تلنگی گجراتی ہندی ستے ہی بولی واقف تھے لیکن باوجود اس ہمہ گیر علمی قابلیت کے افسوس ہے کہ انھوں نے تصنیف کی طرف توجہ بہت کم کی ہے آپ کی جو کچھ یادگاریں ہیں وہ ترجمے ہیں مگر اس میں شک نہیں کہ وہ ترجمے بھی کسی تصنیف سے کم نہیں یوں تو کئی ایک کتابوں کے آپ نے قابلِ قدر ترجمے کئے لیکن تمدن ہند اور تمدن عرب نے آپ کی شہرت میں چار چاند لگا دئے۔ یہ دونوں ہی کتابیں اصل میں فرانسیسی زبان میں تھیں ان کا مصنف موسیو لیبان ہے۔ ان ترجموں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سید علی کو اردو زبان پر پوری طرح عبور حاصل تھا۔ سلاست اور روانی ان کے یہاں کے خاص جوہر ہیں محاورات بھی باموقع صرف ہوتے ہیں۔ اصطلاحات کے ترجمے کرنے میں کمال ہے آپ کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ترجمہ میں انگریزی الفاظ نہ آنے پائیں

سید علی بلگرامی کا ارادہ بہت سی نایاب کتابوں کے لکھنے کا تھا لیکن موت نے فرصت نہ دی۔ ۳ مئی ۱۹۱۱ء کو انتقال کر گئے

## شبلی

شبلی ۱۸۵۷ء میں بمقام سدول ضلع اعظم گڑھ پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم

مولوی شکر اللہ نامی ایک شخص سے حاصل کی۔ بعد میں اپنے وقت کے مشہور مولوی محمد فاروق صاحب چریاکوٹی سے عربی کی منتہی کتابیں پڑھیں۔ تلاش علم کے لئے رامپور، لاہور، سہارنپور اور لکھنؤ کا سفر کرتے رہے۔ بہترین استادوں سے معقول۔ حدیث، و فقہ کی تعلیم حاصل کی

جب فراغت حاصل ہوئی تو گھر والوں کو فکر ہوئی کہ کوئی دنیاوی کام بھی کریں چنانچہ انھیں لوگوں کے اصرار سے وکالت کا امتحان پاس کر لیا اور کچھ دن وکالت بھی کی لیکن یہ پیشہ پسند نہ آیا اس کو چھوڑ کر سرکاری ملازمت کر لی اور امین دیوانی ہو گئے لیکن حوصلہ مندیوں نے یہاں بھی چین نہ لینے دیا استعفیٰ دیکر گھر بیٹھ رہے اور علمی مشاغل میں دل گذارنے لگے شبلی کے ایک چھوٹے بھائی علی گڑھ کالج میں پڑھتے تھے ان سے ملنے کے لئے ۱۸۸۲ء میں علی گڑھ گئے وہاں سرسید سے ملنے کا اتفاق ہوا انھوں نے شبلی کو فارسی کا پروفیسر مقرر کر دیا۔ شبلی کو بھی علمی دوستی کی وجہ سے یہ جگہ پسند آئی علی گڑھ کی فضا شبلی کی علمی تشویش کے لئے بہت مفید ثابت ہوئی۔ نہ صرف سرسید کا کتب خانہ دیکھنے کو ملا بلکہ اہل علم کی صحبت بھی حسب دلخواہ نصیب ہوئی یوں تو ان کے دل میں قومی جوش فطرتاً موجود تھا لیکن آدمیوں میں سرسید اور کتابوں میں "سیف الاسلام" مصنفہ "محمد حسین آزاد" نے اس جوش کو اور تیز کر دیا مولوی محمد یحییٰ تنہا لکھتے ہیں[1] "یہ وقت تھا کہ سرسید کے شور و ہنگامہ سے تمام ہندوستان گونج رہا تھا محمد حسین آزاد کی کتاب "سیف الاسلام" نئی نئی شائع ہوئی تھی، وہ اکثر زیر مطالعہ رہتی تھی معاً خالاسلام و عرب پڑھ پڑھ کر وجد کرتے تھے اور اب پہلی مرتبہ ان کے دل نے علماء کی عظمت، تصنیف، تالیفات، مادانی اور کجرہی کا درد محسوس کیا۔"

---

[1] سیر الصنفین

شبلی نے اسلام کی گذشتہ شان و شوکت کو دنیا کے سامنے پیش کر کے مسلمانوں میں جوش پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مسلمانوں کی نامور ہستیوں کو پیش کر کے اپنی بے حس قوم کو بیدار کرنا چاہا اور اس سلسلے میں المامون، الفاروق، سیرۃ النعمان، العزالی وغیرہ مختلف اوقات میں لکھیں ان میں سے بعض کتابوں کے مواد اکٹھا کرنے کے لئے ان کو شام، مصر اور قسطنطنیہ وغیرہ کا سفر کرنا پڑا۔ سرسید کے انتقال کے بعد ۱۸۹۸ء میں علی گڑھ سے قطع تعلق کر کے گھر چلے آئے۔ اور اب اعظم گڑھ میں مستقل قیام کا ارادہ کر لیا مگر سید علی بلگرامی کی کوششوں نے انکو حیدرآباد جانے پر مجبور کیا۔ شبلی یہاں چار برس تک بحیثیت ناظم محکمۂ تعلیم کام کرتے رہے انھوں نے سلسلۂ آصفیہ میں کئی کتابیں لکھیں چنانچہ علم الکلام، الکلام، العراق، موازنہ انیس و دبیر، سوانح مولانا روم یہ سب قیام حیدرآباد کی تصانیف ہیں

**ندوۃ العلماء** یہ مدرسہ ۱۸۹۴ء میں اس غرض سے قائم کیا گیا تھا کہ نصاب تعلیم کی اصلاح، علوم دین کی ترقی، علماء کے باہمی نزاع کا انسداد، عام مسلمانوں کی بہبود اور فلاح کی تدبیریں سوچی جائیں شبلی نے اس ادارہ میں ابتدا ہی سے دلچسپی لینی شروع کی اور جب ندوہ کی حالت ابتر نظر آئی تو حیدرآباد سے استعفیٰ دیکر لکھنؤ چلے آئے اور ندوہ کی ڈوبتی ہوئی کشتی نہایت خوبی کے ساتھ سنبھالتے رہے لیکن ۱۹۱۳ء میں لوگوں کی تنگ خیالی سے مجبور ہو کر ندوہ کو بھی خیرباد کہا اور اعظم گڑھ میں آکر دارالمصنفین کی بنیاد ڈالی جس سے مقصد یہ تھا کہ عمدہ مصنفوں کی ایک جماعت تیار ہو جائے اس غرض کی تکمیل میں انھوں نے اپنی جائداد غیرہ بھی وقف کر دی

شبلی کی شہرت اب نہ صرف ہندوستان میں چاروں طرف ہو رہی تھی بلکہ ہندوستان کے باہر بھی ان کی خدمات کا اعتراف کیا جا رہا تھا ۱۸۸۴ء میں

گورنمنٹ کی طرف سے شمس العلماء کا خطاب ملا اس سے پہلے ۱۸۹۲ء میں سلطان ٹرکی نے تمغۂ مجیدی عنایت فرمایا تھا۔

سیرۃ النبی شبلی کی آخری تصنیف تھی اور چاہتے تھے کہ اس اہم کام کو بھی اپنے ہاتھوں سے انجام دیں لیکن افسوس کہ یہ حسرت نہ پوری ہو سکی، ابھی پہلی جلد بھی تمام نہ ہوئی تھی کہ ۱۹۱۴ء میں انتقال ہو گیا۔

شبلی نے متعدد کتابیں لکھی ہیں جن کے موضوع مختلف ہیں ان کی ہمہ گیر طبیعت نے علم کلام تاریخ تنقید سیرۃ۔ ہر میدان میں اپنی تیزی دکھائی ہے لیکن سب سے زیادہ نام تاریخ اور تنقید کے میدان میں ہوا

تاریخ نویسی میں آپ کا اسلوب بیان نہایت دلچسپ اور دلکش ہے اور تاریخ ایسے خشک موضوع کو ادب کی چاشنی دے کر ہر شخص کے لئے پرلطف بنا دیتے ہیں طرز استدلال یہ اتنا عمدہ ہے کہ واقعات کی ایک کڑی سے دوسری کڑی اس طرح ملاتے ہیں کہ منطقی اصول ہر جگہ قائم ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

فن تنقید کو آپ نے اردو میں بہت کچھ فروغ دیا۔ اس کے اصول قائم کئے، متعدد اور موازنہ انیس و دبیر لکھ کر لوگوں کو عمل کا بھی راستہ بتا دیا فضول اور لغو باتوں کو ترک کر کے کارآمد چیزوں کو جگہ دینے کا بھی طریقہ سمجھایا

آپ کی طرز تحریر میں عموماً صفائی اور سادگی ہے مضمون کی خشکی رفع کرنے کے لئے دلچسپ تشبیہہ اور استعاروں سے بھی جا بجا کام لے لیتے ہیں الفاظ زیادہ تر روزمرہ اور عام پسند ہوتے ہیں لیکن زور کے موقع پر عربی اور فارسی کے بھی الفاظ استعمال کر کے اپنے مفہوم کو واضح کرتے ہیں۔ آپ کا

اسلوب بیاں ایسا ہے کہ بلند سے بلند مضامین اس میں سلیس اردو کے ساتھ لکھے جا سکتے ہیں عبارت میں ایک خاص وصف یہ ہے کہ جو مزہ تقریر سے حاصل ہو سکتا ہے وہ آپ کی تحریر میں بھی قائم رہتا ہے ایک بڑی حد تک تسلی کی طرح تحریر میں ہموار کلام ہے حالانکہ موقع و محل کے لحاظ سے زبان بدل جاتی ہے لیکن موضوع سے ہم آہنگ رہنے کے علاوہ تاثر و اثر کم نہیں ہونے پاتے

غالباً یہ بتانا نامناسب نہ ہوگا کہ تسلی پہلے شخص ہیں جو لکھنؤ یا دہلی کے رہنے والے نہ تھے مگر پھر بھی زمانے نے آپ کی تحریر کو مستند سمجھا۔

# ۴
# مقالات و صحافت

## عبدالماجد دریاآبادی

عبدالماجد صاحب اردو کی دنیا میں اپنی فلسفہ دانی کی وجہ سے نہایت ممتاز حیثیت رکھتے ہیں اور اس میں شک بھی نہیں کہ انھوں نے اس معرکہ میں کارہائے نمایاں کئے ہیں اردو میں فلسفہ بہت کم تھا جو ذخیرہ تھا بھی اس میں بیشتر حصہ ترجمہ کا تھا مگر عبدالماجد نے نہایت حالتانی و قابلیت کے ساتھ اس کمی کو پورا کرنے میں کوشش کی اس موضوع پر مستقل کتابیں بھی لکھیں اور کارآمد کتابوں کا غیر زبان سے اردو میں ترجمہ بھی کیا

آپ کی تصانیف میں 'فلسفۂ جذبات" اور "فلسفۂ اجتماع" اور ترجمہ میں "مکالمات برکلے" نہایت قابلِ قدر کتابیں ہیں ترجمہ میں سب سے پہلی چیز جہاں لوگوں کو لغزش ہو جاتی ہے وہ زبان کا میدان ہے انگریزی سا اردو لکھ کر لوگ سمجھتے ہیں کہ مترجم کا اہم فرض ادا ہو گیا لیکن یہ وہ ٹھوکر ہوتی ہے کہ جس

کی مذلت قبول عام کا شرف ہمیشہ دور باش کی صدا دیتا ہے عبدالماجد نے اس ترجمہ میں علاوہ اور باتوں کے زبان و طرز بیان کا خاص طور سے خیال رکھا ہے محاورہ اور روزمرہ کی چاشنی مناسب مقامات پر دیتے ہوئے مصائب کی دشوار گزار راہوں سے بھی نہایت خوبی و کامیابی کے ساتھ گزر گئے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ پڑھنے والے کی دلچسپی ہر وقت باقی رہتی ہے تصانیف میں زبان عالمانہ ہے غالباً فلسفہ اہمیت اور دقت پسندی کا خیال رکھ کر وہ عربی و فارسی کے ادق الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ لیکن زبان پر عبور ہونے کی وجہ سے عبارت میں تسلسل اور شگفتگی قائم رہتی ہے ان کے اسلوب بیان کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ جیسا ماحول ہوتا ہے ویسی ہی زبان اور لفظیں استعمال کرتے ہیں مثلاً فلسفہ کا مضمون لکھا ہے تو سرایۂ بیان عالمانہ ہوگا الفاظ بھی عربی و فارسی کے دور مشکل قسم کے صرف ہوں گے مرزا رسوا کی سوانح عمری یا تاریخی پر تقید ہوگی تو بیان کرنے کا ڈھنگ بھی الگ ہوگا اور الفاظ بھی کچھ کم مشکل رہیں گے لیکن مرزا شوق کی مثنویوں (زہر عشق وغیرہ) کے متعلق اظہار خیال فرمائیں گے تو زبان اور الفاظ بھی اسی قبیل کے ہوں گے جو مرزا شوق کے کلام کو اور زبان کو پوری طرح ذہن نشین کرا دیں یعنی اس وقت ان کے لغت میں نہایت عام فہم اور سلیس لفظ نظر آتے ہیں اسلوب بیان بھی اس قسم کا ہوتا ہے کہ عامیانہ مضامین کی فضا کو رنگین ہوتے دے کہ متبدل نظر آئے اور رسالہ ہی کر دے کہ فلسفہ کی طرح، مانع کو رسائی کے لئے تحصیل کے پر پیدا کی ضرورت پڑے۔ مختصر یہ کہ ہر ماحول کو اس کی اصلی حالت قائم رکھتے ہوئے مفہوم و نکات کو نہایت آسانی سے ذہن نشین کرا دیتے ہیں ماخوذ

ان باتوں کے بھی طرز بیان کی انفرادیت اتنے سے نہیں جانے دیتے

ان کے اسلوب بیان کا ایک خاص انداز ہے کہ مضمون کے درمیان میں کبھی کبھی سوالات خود ہی کرتے جاتے ہیں۔ اس طرح یہ بحث طلب نکتہ کے متعلق

جتنے موافق مخالف سوال ہو سکتے ہیں سب کا احاطہ کر لیتے ہیں۔ گویا ہر جلسہ کو جو ایک سمجھدار آدمی کے دل میں پیدا ہوتی ہے، نہایت خوبصورتی سے دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس کی سر میں پڑھنے والے کو علاوہ ندرت بیان کے تاثیر اور رکا بھی اندازہ ہو جائے گا بہت زیادہ لطف اس جگہ آتا ہے جہاں آپ بول چال کے وہ الفاظ بھی کبھی کبھی لے آتے ہیں جو عالباً بولنے ہی کے لئے مخصوص ہیں مثلاً "ہا" جو اظہار غم کے وقت زبان سے بیساختہ نکل جاتا ہے مرزا رسوا کے قصے میں ایک جگہ رقمطراز ہیں کہ "کیسے کیسے افسانہ گو اٹھ گئے اور کیسی کیسی مرزا رکھا بیاں سارے بیٹھے مگر "ہا" دیکھتے ہی دیکھتے خود ان ہی کی زندگی افسانہ بن گئی۔"

اس کو قدامت پسندی سمجھئے یا وضعداری کہیئے کہ عبدالماجد کی عبارت میں کبھی کبھی ایسے الفاظ بھی آجاتے ہیں جو اب زیادہ پسند نہیں کئے جاتے مثلاً تئیں، اور یں وغیرہ اور کبھی کبھی عبارت کا مقفیٰ ہونا بھی آپ کی نثر میں نظر آجاتا ہے لیکن اوجو متروک ہونے کے بھی یہ چیزیں اس خوبصورتی سے عبارت میں جگہ پاتی ہیں کہ بدمزگی نہیں پیدا ہونے پاتی۔

# سلیمان ندوی

ان کی ولادت ۲۲ جولائی ۱۸۸۴ء کو پٹنہ کے ایک گاؤں دسنہ میں ہوئی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی ۱۹۰۱ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے عنفوان شباب میں استاد بھی مقرر ہو گئے ۱۹۱۵ء میں دارالمصنفین کی بنیاد ڈالی اس کے بعد ادارے کی بڑی خوبی سے چلاتے رہے۔ ۱۹۵۰ء میں پاکستان

چلے گئے جہاں ۱۹۵۳ء میں انتقال ہوا۔ عجیب اتفاق ہے کہ جو ان کے پیدا ہونے کی تاریخ ہے وہی مرنے کی بھی۔

شبلی کے بعد جس جوئی سے دارالمصنفین کی ترقی اور دنیائے ادب میں نمایاں حیثیت سلیمان ندوی نے قائم کر رکھی ہے وہ ہر طرح ان کو شبلی کا صحیح جانشین ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔ شبلی کی طرح ان کو بھی تاریخ سے خاص شغف تھا جس کی مدد سے وہ اسلام کے سیاسی اور ادبی کارناموں پر اس خوبی کے ساتھ روشنی ڈالتے ہیں کہ گمنامی اور غلط فہمی کی تاریک گھاٹیوں سے واقعات نکل کر حقیقت کی سطح پر نمایاں ہو جاتے ہیں۔

سلیمان نثر لکھنے میں ایک طرز خاص کے مالک تھے۔ ان کی عبارت میں ادبیت و دلچسپی کے علاوہ علمیت کا بھی ڈھیر رہتا ہے لیکن علمیت ایسی نہیں جو کانوں کو گراں معلوم ہو۔ اس میں نے موقع عربی کے بڑے بڑے لفظوں کا استعمال نہیں بلکہ عربی اور فارسی کے ایسے الفاظ ہوتے ہیں جن کا استعمال کر کے ان ہمارے لئے ناگزیر ہو گیا ہے جن کے بغیر ہم اپنے خیالات کا اظہار آسانی سے نہیں کر سکتے۔

سلیمان ندوی لفظوں کی رنگینی سے لوگوں کو اسا گرویدہ نہیں بناتے ان کے ہر ایک رنگینی کا نام ادبیت نہیں بلکہ وہ خیالات کو اور الفاظ کو اس طرح ترتیب دیتے ہیں کہ پڑھنے والا ان عالمانہ حقیقتوں میں ادبیت کے مزے لیتا ہے۔ وہ فارسی و عربی کے عالم ہیں مگر اردو کی سرشت میں مولویانہ رنگ کبھی نہیں پیدا ہوتا۔ یعنی یہ تو معلوم ہی ہوتی ہے اور ہے عین ادق الفاظ سے زبان کی روانی گھائل ہوتی ہے نہ روانی میں فرق آتا ہے بلکہ ستک مضمون کو بھی وہ ایسی طرز تحریر سے دلچسپ بنا لیتے ہیں اور الفاظ کے برمحل استعمال سے سلاست ہر جگہ قلم کے ساتھ ساتھ رہتی ہے اور کبھی کبھی شگفتگی ترجمہ

طرافت کی حد تک پہنچ کر مضمون کو بیحد مزیدار بنا دیتی ہے۔

سلیمان ندوی اردو کے ایک اچھے مقرر بھی ہیں لہذا عبارت میں کبھی کبھی خطیبانہ انداز پیدا ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے انداز بیان میں برجستگی اور مضمون میں ایک خاص لطف آجاتا ہے۔ اپنی تحریروں سے قوم و ملک کو کورانہ و سائنسی تقلید سے بچانے کے لئے اکثر نہایت پر اثر الفاظ میں لوگوں کو نصیحت کرتے ہیں لیکن جو بات کہتے ہیں وہ ناصح مشفق کی طرح نہیں بلکہ نہایت خلوص اور لطیف اشاروں سے راہ راست پر لانے کی کوشش کرتے ہیں ان کا رسالہ معارف ایک عرصہ سے ادبی قوم کی قابل قدر خدمت کر رہا ہے اور ایسے علمی مضامین کے اعتبار سے ملک میں ایک بلند پایہ جریدہ سمجھا جاتا ہے مجملہ اور کتابوں کے سلیمان ندوی کی تصنیف حیام نہایت ہی اعزاز کی نظروں سے دیکھی جاتی ہے آپ کی اردو زبان کی خدمت کا اعتراف کرتے ہوئے مسلم یونیورسٹی علیگڈھ نے ڈاکٹر کی اعزازی ڈگری بھی عطا کی جو آپ کے نہایت مناسب ہے

# حسن نظامی

خواجہ حسن نظامی غالباً اردو کی دنیا میں پہلے شخص ہیں جنھوں نے اپنی سوانح عمری خود لکھ کر اردو ادب میں ایک قسم کا اضافہ کیا۔ اس کتاب کا نام "آپ بیتی" ہے ہم اسی کتاب سے خواجہ صاحب کے مختصر حالات ان ہی کے الفاظ میں لکھنا بیاد مناسب سمجھتے ہیں ایک جگہ رقمطراز ہیں "میرا نام علی حسن عرف حسن نظامی ہے والد کا نام حافظ سید عاشق علی میری قومیت سید ہے پیدائش کا مقام بستی درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء بیرانی دہلی ہے اور وہیں آجکل اقامت ہے

معاش کتابوں اور دواؤں کی تجارت پر ہے۔"

اس کے بعد صفحہ ۲۳ پر ولادت اور زندگی کا حال اس طرح لکھتے ہیں۔

"تیرھویں صدی کے خاتمہ کے قریب ۱۲۹۶ھ ۲ محرم کو جمعرات کی صبح صادق کے وقت حسن سطامی پیدا ہوا۔ فارسی کی چند معمولی کتابیں پڑھیں اس کے بعد عربی صرف نحو شروع کی (انگریزی مائل نہیں آتی۔ بڑی عمر میں کوشش بہت کی مگر حاصل کچھ نہ ہوا) بارہ سال کی عمر تھی کہ ایک ہی سال کے اندر اس کے والدین کا انتقال ہو گیا اور اس کی پرورش اس کے بڑے بھائی مرحوم سید حسن علی شاہ نے کی۔"

اپنی شادی اور ابتدائی عہد کی پریشانیوں اور بعض سفر کے حالات بیان کر کے صفحہ ۳۴ پر فرماتے ہیں "قصہ مختصر ۱۹۱۹ء سے لے کر ۱۹۱۹ء تک حسن سطامی کی زندگی مصائب میں بسر ہوئی تصنیف و تالیف کتب و خدمت مریدین میں صرف ہوئی اور ہر سال خدائے تعالیٰ کی عنایت سے اس کے کاموں کو ترقی ہوتی گئی۔ مریدوں کی تعداد ساٹھ ہزار تک پہنچ گئی تالیفات و تصنیفات چالیس سے زیادہ ہو گئیں[1]"

تعداد کے اعتبار سے جتنی کتابیں خواجہ صاحب نے لکھی ہیں اتنی اردو کے موجودہ دور میں شاید کسی ایک ممتاز مصنف نے نہیں لکھیں اور لکھ بھی کیسے سکتا ہے۔ خواجہ صاحب کتاب لکھنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ ایک جگہ خود فرماتے ہیں "حالانکہ پہلے ہر مہینے ایک کتاب تیار ہو جاتی تھی"۔ خیال فرمائیے کہ جو شخص ہر مہینے ایک کتاب لکھ ڈالتا ہو اس کا مقابلہ کون کرے۔ کثرت تصنیف کے علاوہ ایک اور قابل قدر خوبی یہ ہے کہ آپ نے زیادہ تر ایسے مضامین پر قلم اٹھایا ہے کہ جن پر ابھی تک شاید کسی نے کچھ نہ لکھا تھا

---

[1] یہ بیان "آپ بیتی" کے تاریخ تصنیف کے وقت کا ہے جو غالباً ۱۹۱۹ء میں لکھی گئی ہے اب خدا معلوم کتنی تعداد کتابوں اور مریدوں کی اس وقت تک بڑھ گئی ہو گی

خواجہ صاحب کی تصانیف پڑھنے والے پر ابتدا ہی سے طرزِ تحریر کی دلکشی کا اثر ہونے لگتا ہے شروع سے آخر تک عبارت میں اتنا ہی سے کامیاب تحریر میں اور بے تکلفی ادا ہے جو آمد کا پہلو لئے ہوئے ان کے اسلوب بیان میں ایک خاص مدرب اور تاثیر پیدا کر دیتا ہے دوسری ممتاز خوبی ان کے بیان میں سوز و گداز کا پہلو ہے وہ جب چاہتے ہیں موقع کو دردناک بنا دیتے ہیں اور اس قدر دردناک کہ دل سنبھالنا دشوار ہو جاتا ہے لیکن بعض وقت یہ خوبی تکلیف دہ بھی ہو جاتی ہے۔ ایک فقرہ سے دل کو چوٹ کھانے سے فرصت نہیں ملتی کہ دوسرا فقرہ نشتر کی طرح رگ جاں کو چھیڑ دیتا ہے اس طرح پیہم نشتر زنی ناقابل برداشت ہو جاتی ہے اور یہی چاہتا ہے کہ سانس لینے کی ذرا فرصت مل جائے خواجہ صاحب کا دل خدا جانے کتنے سلاطین کی اندوہناک حالت سے متاثر ہوا ہے کہ جہاں کہیں ان کی اشک بار نظر آئی ان کے آنسو جاری ہو گئے یہی وجہ ہے کہ ان کا قلم عبرتناک مناظر بیان کرتے ہیں کبھی نہیں تھکتا اور اتنا اثر لے کر صفحہ کاغذ پر رواں ہوتا ہے کہ دیکھنے والے بھی روتے ہیں اور جب روتے ہیں۔ اس سطر کو دیکھیے ہوتہ "عدم کے افسانوں" کو دیکھئے جو ایسے رنگ میں عدیم المثال ہیں

خواجہ صاحب کی زبان دہلی کی ٹکسالی زبان ہے جو سادہ و شیریں ہونے کی وجہ سے قبول عام کا شرف حاصل کر چکی ہے محمد حسین آزاد کی طرح اتنی عام فہم زبان ہے کہ اس سے زیادہ سہل اور کامیاب لب لہجہ اختیار کرنا بہت مشکل ہے موصوف ٹھیٹ ہندی کے فقرے بھی استعمال کرتے ہیں اور عربی و فارسی کے ادق الفاظ بھی لیکن دونوں ایسے موقعہ سے کہ بار خاطر ہوتا تو کیا معنی روانی میں کہیں سے فرق نہیں آنے پاتا چھوٹے چھوٹے جملے نشتر کا کام دیتے ہیں۔ تو تشبیہ کی بھرمار ہے یہ استعاروں کی بوچھاڑ۔ عبارت میں صفائی اور چستی کی وجہ سے تاثیر تخلیقی

ہر جگہ نمایاں ہے۔

خواجہ صاحب کی نثر میں رعایت لفظی کا نہایت لطیف پہلو کہیں کہیں نظر آتا ہے جس سے عبارت میں شگفتگی اور جان آجاتی ہے اسلوب بیان میں متانت و سنجیدگی خاص طور سے نمایاں ہے اور ہر رگا نہ انداز تو ایسا ہے کہ تبسم و مزاح کا کوئی پہلو نہیں پیدا ہوتا لیکن خشکی و پھیکے پن کی ہوا بھی دامن مضمون تک نہیں آنے پاتی

مضامین کی نوعیت پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوتا ہے کہ موضوع نہ تو فلسفیانہ ہے نہ عالمانہ بلکہ روزمرہ اور کام کی باتوں پر اخلاق کو مدنظر رکھتے ہوئے خامہ فرسائی کی گئی ہے خواجہ صاحب کا فطری مذاق صوفیانہ ہے چنانچہ اہل معرفت کے دائرے میں آپ کا نہایت بلند مرتبہ ہے اور حقیقت یہ ہے کہ آپ معرفت میں اس قدر ڈوبے ہوئے ہیں کہ کائنات کے ہر ذرے میں آپ کو ایک خاص روحانیت نظر آتی ہے اول خیروں سے بھی وہ غافل انسانوں کو درس معرفت دینے کی کوشش کرتے ہیں اگر آپ ان کی کتاب "سی پارۂ دل" کا مطالعہ کریں تو اندازہ ہوگا کہ کس خوبی سے ایک مختصر مضمون اور بے جان چیز مثلاً لالٹین یا برف وغیرہ سے وہ سوتے ہوئے دلوں کو بیدار کر دیتے ہیں اس کتاب کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے کہ اردو میں اس صنف تصنیف کی یہ پہلی نمایاں مثال ہے انگریزی میں (ESSAY) کہتے ہیں (یعنی تخیلی مضمون نگاری) جس میں موضوع کی محض منطقی تحلیل نہیں ہوتی بلکہ ان دلفریبیوں کی طرف اشارہ ہوتا ہے جو کہ ایک کیفیت اور حیرت پیدا کر دیتی ہے اس طرز تحریر کا نقش اول آزاد کے نیرنگ خیال کے بعض حصے کہے جا سکتے ہیں حسن مطلبی کا انتقال ۳۱ر جولائی ۱۹۵۵ء میں ہوا۔

# ابوالکلام آزاد

ابوالکلام آزاد کی کوئی مستقل ادبی تصنیف تو معلوم نہیں ہوتی مگر الہلال کی اور مخصوص اداریہ تحریریں ان کو اردو کے بہترین انشا پردازوں کی صف میں جگہ دلا دی ہے۔ الہلال نے اپنی خوبیوں کی وجہ سے اتنی مقبولیت حاصل کر لی تھی کہ جب تک یہ اخبار ہاتھ میں نہ آتا تھا لوگ بے چینی سے انتظار کیا کرتے تھے۔ آزاد کی تقریر کی طرح تحریر میں بھی ایک سحر ہوتا ہے کہ جس کو اول سے آخر تک بغیر پڑھے ہوئے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا

آپ کی طرز تحریر میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ خواہ جملے طولانی ہوں مگر تواتر اور تسلسل میں فرق نہیں آنے پاتا ایک جملے کے بعد دوسرا بھی اسی انداز سے آتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ عبارت میں اتنا ربط ہوتا ہے کہ ذرا بھی آپ ترتیب میں فرق نہیں ڈال سکتے۔ ایک لفظ کو اگر جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ رکھنا چاہیں تو تمام عبارت کے بے لطف ہو جانے کا اندیشہ ہے

الفاظ کا انتخاب زیادہ تر عربی و فارسی کے ذخیرے سے ہوتا ہے علمی اور فلسفیانہ اصطلاحات کی آمیزش سے آپ خود ادبیت پیدا کرتے ہیں وہ خاص طور پر عبارت کو دلکش اور موضوع کو بلند کر دیتی ہے ان کے تشبیہ و استعارے عربی و علمی انداز کے ہوتے ہیں مگر اردو کی فضا میں اس طرح رچتے آتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے اسی سرزمین کے لئے پیدا ہوئے تھے جس کی وجہ سے ایک طرف تو ان کے ذخیرے میں اضافہ ہوتا ہے اور دوسری طرف مضمون میں شگفتگی بڑھ جاتی ہے

ابوالکلام آزاد اپنے انداز بیان کی بلندی کی وجہ سے بڑے سے بڑے مبہم کو نہایت آسانی سے ذہن نشین کرا دیتے ہیں اور صف الفرادی اور دوره

کے امور کو عالمگیر اصول سے منسلک کرنے کی کامیاب کوشش کرتے ہیں تو صرف یہی نہیں کہ مضمون کی سطح اونچی ہو جاتی ہے بلکہ دماغی قوتوں کو بیداری کا موقع بھی نصیب ہوتا ہے۔ اس طرح سے نثر میں اعلیٰ ذہنیت و معنویت کا عنصر پیدا ہو جاتا ہے

جوش و اقبال کی طرح ابوالکلام آزاد کی تحریر میں عام طور سے جوش اور پیام عمل ہوتا ہے ان کے مضامین پڑھ کر آدمی مایوسی کی دنیا میں گم نہیں ہو سکتا پہاڑ ایسی مصیبتوں کے بعد بھی اس کو کام اور کامیابی کی طرف قدم بڑھانے کی دعوت دی جاتی ہے جوش کے موقع پر ان کے ہر فقرے میں سرگرمی کی آگ بھری نظر آتی ہے وہ ایسے ہنگامہ خیز مضامین سے ہر تغافل آمیز سکون کو سراپا حرکت بنا سکتے ہیں آزاد کی نثر میں جوش اور ایثار کا عنصر اس کثرت و تناسب کے ساتھ آتا ہے کہ ان کے اسلوب بیان میں ایک خاص دلکشی اور امتیازی خصوصیت پیدا کر دیتا ہے جو ان کی انفرادیت کا امین ہوتی ہے

ابوالکلام آزاد کی ایک اور ممتاز خوبی قوتِ گویائی ہے اس وقت فصیح و بلیغ اردو میں گفتگو کرنے والا شاید ان سے بہتر اور کوئی نہیں زبان پر عبور ہونے کی وجہ سے تقریر میں بھی ایسے ہی الفاظ زبان سے ادا ہوتے ہیں جیسے تحریر میں برستے اور شستہ الفاظ آتے ہیں کبھی کبھی تحریر میں تقریر کی جھلک آجاتی ہے خطیبانہ انداز سے وہ اپنی عبارت کو پُر لطف اور پُر تاثیر بنا لیتے ہیں ابوالکلام نے قرآن کا مطالعہ اتنی گہری دلچسپی سے کیا ہے کہ ان کی کوئی تحریر یا تقریر قرآنی تعلیمات کے حوالے سے خالی نہ ملے گی۔ اس سلسلے میں بھی دو باتیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں ایک تو آیاتِ قرآنی کو عبارت میں برمحل جگہ دینا اور دوسرے ان کا ترجمہ اس خوبی سے اردو زبان میں بیان کر دینا کہ پورا مفہوم آسانی و خوبی سے ہمیں نشین ہو جائے

ابوالکلام کی تحریروں کا موضوع زیادہ تر سیاست ہے اور گو اردو ادب کو خاص طور پر فائدہ پہنچانے کے لئے انھوں نے شاید کبھی فرصت نہیں پائی لیکن براہ راست نہ سہی اردو کو جو فائدہ آپ کی تحریر و تقریر سے برابر پہنچتا رہا ہے وہ خود اپنی جگہ پر اتنی اہمیت رکھتا ہے کہ آسانی یا مشکل سے کبھی نہیں بھلایا جا سکتا۔ اردو نثر کو جس لطیف اور دلچسپ سانچے والوں میں آپ کا ہمیشہ ایک خاص مرتبہ سمجھا جائیگا آپ نے الہلال میں جو مضامین لکھے تھے وہ اب "مقالات آزاد" کے نام دو جلدوں میں شائع ہوئے ہیں اس کارنامہ کے علاوہ ان کے خطوط کا مجموعہ "غبار خاطر" بھی اردو کی انشا پردازی میں ایک اضافہ ہے غبار خاطر میں وہ خطوط ہیں جو آزاد نے قید فرنگ کے زمانے میں یعنی ۱۹۴۲ء میں علاقہ احمد نگر سے حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے نام لکھے

آزاد کی ولادت ۱۸۸۸ء میں ہوئی۔ اس وقت وہ حکومت ہند میں محکمہ تعلیم کے وزیر ہیں

# نصیر حسین خیال

نصیر حسین پٹنہ میں ۲۱ مارچ ۱۸۸۲ء میں پیدا ہوئے، ابھی یہ تین سال کے تھے ان کے والد سید نور حسین خاں کا انتقال ہو گیا۔ نصیر حسین کی دادی نے ان کی پرورش کی نصیر حسین کا خاندان فرخ سیر اور محمد شاہ کے زمانے میں عظیم آباد (پٹنہ) آیا اور بس گیا نصیر حسین کے آبا و اجداد کو شاہان مغلیہ کی طرف سے بہار میں جاگیریں عطا کی گئی تھیں۔

نصیر حسین سات سال کے تھے کہ ان کی دادی کا بھی انتقال ہو گیا اب

ان کے چچا سید جعفر حسین حیاں اور ماموں شاد عظیم آبادی نے ان کی ذمہ داری لیے سرلے لی۔ اس وقت کے دستور کے مطابق نصیر حسین کو اردو فارسی اور عربی کی تعلیم دی گئی۔ اس کے بعد انگریزی حاصل کرنے کا موقعہ ملا۔ نصیر حسین کو علم و ادب سے فطری شغف تھا چنانچہ جب ۱۷ سال کے تھے تو ادیب نام کا ایک ماہوار علمی و ادبی رسالہ نکالا تھا۔ ان کو سیر و سیاحت کا بھی کافی شوق تھا ۱۹۲۰ء میں یورپ گئے اور اسی سلسلے میں ایشیا کے بھی بعض ممالک کے دورے کئے ۱۹۳۴ء میں علی گڑھ میں دفعتاً قلب کی حرکت بند ہو گئی اور وہیں انتقال ہوا

نصیر حسین حیاں جس پایہ کے نثر نویس تھے اس کا خیال کر کے اگر ان کو آرا تالی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ یہی دہلی کی ٹکسالی رم و تیزی رواں ہے، وہی روانی اور فصاحت ان کی عبارت کی بھی جان ہے جس طرح آزاد اور رتنہ اور عام فہم الفاظ سے تاثیر کا طلسم باندھتے تھے ایسا ہی ان کو بھی زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے۔ ورنہ کے موقع پر رزم اور عساکر مطر کے لئے نہایت چبھتے ہوئے دل ہلا دینے والے الفاظ ہر جگہ آپ کو ان کے یہاں نظر آئیں گے ہر موقع کی تصویر نہایت دلچسپ پیرایہ میں پیش کرنا ان کا خاص رنگ ہے۔

عبارت میں تروع سے آخر تک کہیں بھی ناہمواری نہ ملے گی۔ فارسی عربی کے ادق الفاظ اور ہندی کے ٹھیٹ الفاظ بھی کبھی کبھی استعمال کرتے ہیں مگر اس حسن سے کہ یکسانیت مجروح نہ ہونے پائے اور بجائے ثقل کے ایک خاص قسم کا لطف و اثر پیدا ہو جائے الفاظ کو کام میں لانے کے پہلے وہ محل استعمال کو اچھی طرح دیکھ لیتے ہیں کہ ایسا نہ ہو کہ سلاست و روانی میں فرق آجائے گویا ان کا دریائے طبع سیدھی دھار تمام سے گزر کرتا ہے مگر دو ق جگہ کو کہیں کہیں سے لطف نہیں ہونے دیتا۔

خیال کے لیے مطلب کو ادا کرنے کے لئے صرف اتنے ہی الفاظ لاتے ہیں جتنے کہ ان کے مفہوم کو اچھی طرح واضح کر سکیں زائد الفاظ بیکار جملوں کو وہ بحت اولی گناہ سمجھتے ہیں ہاں یہ ضرور ہے کہ اردو سے ان کو اس قدر فطری ذوق و غیر معمولی محبت تھی کہ اس کی فصیلت اور اپنی سمجھ میں اس کی بہبود کے لئے کبھی کبھی تحقیق و دلیل کی زحمت نہیں فرماتے مگر عبارت کی دلکشی و طرز بیان کی خوبی اس کو بھی مشکل سے سطر میں کھینچ دیتی ہے۔

خیال کے اسلوب بیان کی یہ خوبی بھی لطف اندوز ہیں کی حالکتی کہ جس مضمون کو وہ بیان کرنا چاہتے ہیں اس کے متعلق اسی قبیل کے الفاظ رکھنے بھی لاتے ہیں تاکہ سطر میں دلکشی اور بیان میں شگفتگی زیادہ ہو جائے لیکن متانت و سنجیدگی کا دامن کہیں بھی ہاتھ سے جانے نہیں پاتا سادگی سے رنگینی پیدا کرنا یہ آپ کی نثر کا امتیازی پہلو ہے جہاں ضرورت ہوتی ہے سیدھے سادے الفاظ کو اس طرح ترتیب دیتے ہیں کہ ایک خاص قسم کی متانت آمیز رنگینی آجاتی ہے اور بڑے سے بڑے مفہوم کو اس پردے میں اتنا رول کے ساتھ نہایت خوبی سے اہل سطر کے سامنے پیش کر کے قدرت بیان و عبور زبان کی داد لیتے ہیں

# ظفر علی خاں

ظفر علی خاں کا نام جہاں آیا اور زمیندار بھی یاد آگیا گویا ان کے نام کا ایک جزو ہو گیا ہے حقیقت یہ ہے کہ آپ نے اس اخبار کو اتنا مرتبہ دیا کہ ایک زمانے میں ہر طرف سے قبول عام کی سند ملی لوگوں نے آپ کے مقالات کو صحافت کا بہترین نمونہ سمجھا جو کچھ کہا ہوتا ہے وہ نہایت دلفریب اور دلنشین

طریقہ سے کہا جاتا ہے مطالب کو دلنشیں کرنے میں ایسا پیرایہ بیان عمدہ
اختیار کیا جاتا ہے کہ خیال راہ راست سے منزل مقصود تک پہنچ سکے تمدنی و سیاسی
اور آئینی امور کے ہر پہلو پر نہایت صاف روشنی ڈالنا ظفر علی خاں صاحب کا
خاص حصہ ہے

خیال ہوتا ہوگا کہ اڈیٹر ہونے کی حیثیت سے ظفر علی خاں صرف سیاسی
و آئینی معاملات کے میدان ہی میں تک و دو کر سکتے ہیں مگر یہ نامکمل سطحی خیال
کا نتیجہ ہوگا۔ اس لئے کہ موصوف کی فکر رسائی محدود دائرے میں قید رہ کر کبھی
گوارا نہ کیا بلکہ مختلف شعبوں کی سیر کرنا ایسا فرض سمجھا شعر و شاعری سائنس و
مدنیت ہر ایک کی فضا میں گذر ہوا عزت و وقار کا دامن ہاتھ سے نہ جانے
پایا قوم و ملک کو فائدہ پہنچانے کی حرص سے آپ نے معاشرتی اصلاح کو مدنظر
رکھتے ہوئے خود بھی مضامین لکھے اور کارآمد سمجھ کر معزز مصنفین کے خیالات کو بھی
اردو کا جامہ پہنایا اس سلسلے میں آپ کی تصنیف معاشرت قابل دید ہے۔

ظفر علی خاں کی ناولوں میں گھریلو زندگی کا نہایت صاف اور اصلی نقشہ
نظر آتا ہے جس کے پیچھے سے موصوف کی دقت نظری اور مشاہدہ کا اندازہ
ہوتا ہے کہ آپ نے کس طرح سے روزمرہ کی زندگی اور تہذیب گھرانوں کے
مطالعہ پر نظر ڈالی ہے اس کے ساتھ یہ بھی بیان کرنا ہے کہ وحی جیسا ہے کہ
انسانی جذبات کی کیفیتیں جو نظر سے معلوم کی جا سکتی ہیں ان کو اندر روح
آسانی کے ساتھ آپ کر لیتے ہیں اسی طرح کے ساتھ صفحہ تحریر پر لانے پر قادر
ہیں مختلف اوقات میں مختلف حرکات و سکنات جو لوگوں سے صادر ہوتے ہیں
ان کے ان پہلوؤں پر بھی آپ غور کر لیتے ہیں جو اس کی حد سے ہر
شخص کی نگاہوں میں نہیں آتے اور جس کے نہ معلوم ہونے سے کہانی اور کا

پورا ادا وہم کو نہیں ہوتا۔

ظفر علی خاں کی نثر خشو در ر اُدسے پاک ہوتی ہے عموماً اتنے ہی الفاظ کام میں لاتے ہیں جتنے سے ان کا مطلب اصح ہو جائے

روزمرہ اور محاورات زبان کو بہت بڑی قدرت ہے فارسی ترکیبیں زیادہ مرغوب ہیں۔ عربی و فارسی الفاظ بھی کافی صرف کرتے ہیں کبھی کبھی خوش بیانی میں ایسے الفاظ و فقرے بھی ان کے قلم سے نکل جاتے ہیں جو نہ صرف نامانوس ہوتے ہیں بلکہ زبان کی لوچ پر بھی نامعلوم ہوتے ہیں۔ ظفر علی خاں کی طرز تحریر ہر کی خوبیوں کے مقابلے میں یہ نقص بہت اہم سہی مگر جی یہی چاہتا ہے کہ یہ خرابی بھی نہ ہوتی۔

موصوف کا قلم شعر و شاعری کی دنیا میں بھی رواں رہتا ہے بطور کل ایک مجموعہ بہارستان شائع بھی ہو چکا ہے جس میں زیادہ تر سیاسی و مذہبی نظمیں ہیں لیکن آپ کی پر گوئی کو دیکھتے ہوئے یہ مجموعہ صحامت کے اعتبار سے بہت کم ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہوگی کہ آپ نے نظم سے زیادہ نثر کی طرف توجہ کی ہے۔

تشبیہ و استعارے کی جدت، بیان کی برجستگی، خیال کا واضح طور پر چند الفاظ میں ادا کرنا ایسی خوبیاں ہیں جو ظفر علی خاں کو ایک خاص طرز تحریر کا مالک بنا دیتی ہیں زبان میں عموماً روانی ہوتی ہے روزمرہ اور تاثیر کی بھی کمی نہیں بلکہ جس بات کی اردو ناولوں میں کمی تھی اس کی تلافی کی بھی کوشش آپ نے کی ہے یعنی مزاح کا عنصر موقع سے داخل کر کے عبارت کو بہت دلچسپ بنا دیا ہے زبان کسی قدر عالمانہ ہے اور یہ رنگ ہر جگہ نمایاں ہے خواہ ناول کا میدان ہو یا معرکۂ مذہب و سائنس کا سامنا ہو۔

ظفر علی خاں کا انتقال ۱۹۵۶ء میں ہوا

# ۵

# تنقید

عہد کے پہلے جس طرح اردو شاعری ایک سے سائے راستہ چلتی رہی اور معاشی و معاشرتی حالات نے زندگی میں کوئی طوفان نہیں اٹھایا اسی طرح طرز تنقید پر بھی ایک جمود سا طاری رہا۔ قوت نقد کا اظہار انہیں مقررہ اصولوں کے ماتحت ہوتا تھا جو صدیوں سے چلے آتے تھے اور جو اردو شاعری یا ادب کی پیدائش سے پہلے بن چکے تھے شعر و ادب نے رہنمائی کے بجائے تفریح کی صورت اختیار کر رکھی تھی۔ معنی اور مواد نے اسلوب بیان اور جدت ادا کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تھے جس کے اثر سے نقاد کو بھی صرف اسلوب بیان اور طرز ادا سے دلچسپی رہ گئی تھی اور شاعر کے لئے "جوش گو" "نامزہ" "جوش فکر" کے سے لفظوں کے استعمال میں "تلاش مضامین تازہ" سے زیادہ "جدت ادا" پر قدرت رکھنے کی حاجت ہوتی تھی۔

اردو شاعری کی طرح اردو تنقید میں بھی انیسویں صدی میں ایک اہم تبدیلی ہوا معاشرتی اور معاشی نظام کی تبدیلی سے اصلاح پسندی کے ساتھ ساتھ عقل پرستی کا رواج ہوا اور مذہب، سیاست، تعلیم، تصور ادب ہر ایک میں عقل سے کام

لیکن اصلاح کی کوشش کی گئی۔ نئے نقادوں نے اسی ادبی اور معاشرتی تغیر کی روشنی میں ایسا راستہ بنایا جو مغربی اثرات کے پھیلنے، ہندوستان کے ہم صنعتی نیم جاگیردارانہ ہونے کی وجہ سے عمل میں آیا۔ قدیم و جدید کی جنگ روایات۔ اصلاح کی جنگ ہر جگہ جاری تھی۔ اور میدان آہستہ آہستہ تاریخ کی ان طاقتوں کے ہاتھ میں آرہا تھا۔ مشرق و مغرب کے اس تصادم میں دونوں اصول نقد کا جائزہ لیا گیا اور جس طرح تقریباً ہر شعبہ میں مغرب کو زیادہ اہمیت حاصل ہو گئی تھی اسی صورت سے مغربی اصول نقد بھی اردو پر حاوی ہو گئے۔

سب سے پہلے محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں نئے انداز سے اردو ادب پر تنقید کی پھر اس کے بعد حالی نے مقدمہ شعر و شاعری لکھ کر فن تنقید کو اجاگر کرنے کی کوشش کی شبلی نے شعر العجم کے چوتھے حصے میں اصول تنقید پر روشنی ڈالی۔ موازنہ انیس و دبیر لکھ کر راستہ بتایا کہ کسی شاعر کے کلام میں خوبیاں خرابیاں کیسے دیکھی جائیں

مغربی تعلیم کی روشنی میں تنقید روز افزوں ترقی کرتی رہی انگریزی کے اصول سے فائدہ اٹھا کر لوگوں نے ہمیشہ سے زیادہ اس طرف توجہ کی رفتہ رفتہ یہ بے اسی بڑھی کہ اب اردو کا جائزہ کسی لحاظ سے حقیر نہیں کہا جا سکتا

## چکبست

سب سے پہلی چیز جو ہمیں چکبست کے مضامین میں متاثر کرتی ہے وہ ان کی تنقید کا صحیح معیار ہے۔ ان کو زبان پر بہت بڑی حد تک قدرت حاصل تھی اور اس لئے خیالات کے اظہار میں انہیں کوئی تکلف نہ ہوتا تھا جو کچھ کہنا چاہتے تھے وہ نہایت صاف الفاظ میں کہتے تھے اور جو کچھ کہتے تھے تنقید کے اصول کا صحیح صرف پیش نظر

رکھ کر کہتے تھے انھوں نے اکثر و بیشتر مضامین ان لوگوں پر لکھے ہیں جن سے انھیں عقیدت تھی یا جن سے محبت رکھتے تھے لیکن عصبیت عام کے لئے بھی ہمیں وہ کمزوریوں کا اظہار بے باکی سے کرتے ہیں جس طرح محاسن بیان کرتے ہیں متانت و منصف مزاجی ہر جگہ نمایاں ہے سب کو اپنے اسلوب کی اشاعت کر کے ان کو ایک ہنگامہ سے دوچار ہونا پڑا اس وقت بھی انھوں نے نہایت متانت و سنجیدگی سے اس ادبی معرکہ میں قدم رکھا ان کا ساحتہ دلائل و براہین پر مبنی ہوتا ہے وہ ہر اعتراض کی تہہ تک پہنچ کر اس کی جڑ کی کی کوشش کرتے تھے اور ان کی نظری وسعت اور حدت ان کی دستگیر ہوتی تھی اس لئے ان کا تیر ہمیشہ نشانے پر ٹھیک بیٹھتا تھا کس سے یہ مناظرہ کا انداز ان کے بیسیے سے سیکھا یا ہو۔

چکبست کی نثر ایسی سادگی اور روانی کے اعتبار سے ایک منفرد درجہ رکھتی ہے تنقید کا سا مشکل مبحث بھی ان کے قلم سے چھو جانے کے بعد رنگین اور دلچسپ نظر آنے لگتا ہے اثر ان کے کلام کا ساتھ کہیں نہیں چھوڑتا اور اثر پیدا کرنا ان کی نظم نثر دونوں کی امتیازی خصوصیت ہے۔ ان کی عبارتوں میں مسجع و مقفیٰ کی مضمون آرائی نہیں لیکن موثر بنانے کے لئے الفاظ کا انتخاب ایسے سلیقے سے کیا ہے کہ دلچسپی پیدا کر دیتا ہے کبھی کبھی مقفیٰ عبارت کا استعمال بھی ایسی لیے کا متحد ہے عبارت کو دلکش بنانے کے لئے کبھی کبھی حلیمانہ انداز بھی کام میں لاتے ہیں اور پڑھنے والوں کو یوں مخاطب کرتے ہیں گویا وہ ان سے ہم کلام ہیں طرافت کی ہلکی سی لہر ہر جملے میں نظر آتی ہے لیکن نہ تو وہ طنز میں شمار کی جا سکتی ہے اور نہ عام لوگوں کے مذاق کی ہوتی ہے بلکہ اس کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ پڑھنے والا اکتا نہ جائے اس سے نہ صرف ان کا رنگ تنقید شوخ ہو جاتا ہے بلکہ سارے مضمون میں ایک شگفتگی اور تازگی کی روح دوڑ جاتی ہے

مضمون نگار کا ایک اہم فرض یہ بھی ہونا چاہیئے کہ وہ مضمون کے صحت اور موضوع سے اچھی طرح ہمدردی رکھے ورنہ اس کے قلم میں وہ زور اور صداقت میں وہ جیتی آہی نہیں سکتی جس سے مضمون عام سطح سے بلند ہو جائے چکبست جو کچھ لکھتے ہیں اس میں خلوص اور اثر کا عنصر بہت کافی ہوتا ہے عموماً ہم کو بھی ان کے احساسات میں شریک ہونا پڑتا ہے منشی سجاد حسین مرحوم، تربھون لال بیخبر اور رتن ناتھ سرشار کا مرثیہ صاحب ان کے قلم سے بیان ہوتا ہے تو ہمیں اس میں قومی نقصان اور ادب کی بربادی کا نقشہ نظر آنے لگتا ہے یہ اثر انگیزی ان کی عبارت کی جان ہے

# عبدالحق

ڈاکٹر عبدالحق ایک عرصہ سے اردو زبان و ادب کی خدمت کر رہے ہیں آپ کی سرپرستی میں آئے دن دکن سے خوبصورت دیدہ زیب ادبی دفینے نکلے وہ بجائے خود ایک اعلیٰ قسم کی اردو خدمت ہے گو موصوف کی کوئی ابھی تک بڑی تصنیف ہمارے سامنے نہیں آئی لیکن جو مقدمات مختلف کتابوں کے شروع میں آپ نے لکھے ہیں وہ کتاب کی صورت میں کسی قابل قدر تصنیف سے کم نہیں خوش قسمتی سے یہ مقدمے دو جلدوں میں شائع ہو گئے ہیں ان کے دیکھنے سے سب سے پہلی چیز جس کا اثر دل پر ہوتا ہے وہ عبدالحق کی طبیعت کی ہمہ گیری ہے مختلف مسائل پر آپ نے خامہ فرسائی کی ہے اور قابل قدر رائے دی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو گوناگوں مسائل پر کس قدر عبور ہے

عبدالحق کی نثر میں ایک خاص قسم کی سنجیدگی ہے جس میں دلی کی ٹکسالی زبان کا خاص طور سے رنگ جھلکتا رہتا ہے۔ عبارت میں عموماً سادگی اور روانی رہتی ہے سیدھے سادے الفاظ سے جملوں میں زور پیدا کر دینا آپ کا امتیازی اسلوب بیان ہے طرز بیان

میں شگفتگی اتنی کاٹی ہوتی ہے کہ مشکل باتیں بھی آسانی سے واضح ہو جاتی ہیں جس طرح موقع و محل کے لحاظ سے عربی و فارسی کے بڑے الفاظ مطلب ادا کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں اسی طرح مناسب جگہ پر ہندی کے بھی الفاظ مثلاً کھدبد، دکھیارا وغیرہ بھی کام میں لے آتے ہیں چھوٹے چھوٹے جملے اور ان میں روزمرہ اور محاورہ اردو کی چاشنی، نثر میں ایک خاص قسم کا لطف پیدا کر دیتی ہے جستجو و تحقیق سے اس قدر شغف ہے کہ وہ یہ بھی نہیں پسند کرتے کہ رنگین اور شوخ عبارتیں ان کے مفہوم واضح کرنے کے راستے میں حائل ہوں لہذا آپ کو ہر جگہ سیدھی سادی عبارت ان کی نثر میں ملے گی

ڈاکٹر عبدالحق کا تذکرہ تشنہ رہ جائے گا اگر ان کے رسالہ اردو کا تذکرہ اس کتاب میں نہ آسکے یہ رسالہ مکمل علمی رسالہ ہے اپنی حیات سے لیکر آج تک اس نے اردو داں طبقہ کی معلومات میں جو علمی اور ادبی اضافہ کیا ہے وہ آسانی سے کیا مشکل سے بھی نہیں بھلایا جا سکتا۔

آپ کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے الہ آباد یونیورسٹی نے اپنی گولڈن جوبلی (۱۹۳۷ء) کے موقع پر آپ کو ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری عطا کی جس کے آپ یقیناً مستحق تھے

مقدمات کے علاوہ آپ کے ریویو "چند تنقیداتِ عبدالحق" اور "خطبات عبدالحق" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں

## نیاز

موجودہ دور کی نثر نگاری مختلف راستوں پر گئی اور طرز تحریر کے اختیار کرنے میں جدت پسند طبیعتوں نے نمایاں طریقے پیش کئے سیار نجوری کا شمار بھی ان لوگوں

میں ہوتا ہے جنھوں نے اردو ادب میں اپنے رنگ سے ایک قابلِ قدر اضافہ کیا الفاظ اور ترکیبوں کی جو بھولی ایک خاص خوش سے مل کر ایک ایسا بیان اختیار کرتی ہے جو صرف سیار کی تحریر میں پایا جا سکتا ہے انھوں نے محرب اور مقالہ میں جم لیا اور پھر دو نگار کمال کر ادبی دنیا میں اپنے لئے ایک مخصوص جگہ پیدا کر لی لکھنے کے لئے تو انھوں نے مختلف موضوعات پر مقالے اور مضامین لکھے لیکن ان کا خاص رنگ افسانہ نگاری میں پوری طرح ظاہر ہوتا ہے سیرت انسانی کے باریک اور پوشیدہ رازہائے قلب کے مختلف اثرات اس قدر دلکش انداز میں بیان ہوتے ہیں کہ تھوڑی دیر کے لئے ذہن مسحور ہو کر اسی دنیا میں کھو جاتا ہے ان کا پہلا طویل افسانہ "ایک شاعر کا انجام" ایک لوکھی اور ترکیبوں کے ساتھ ساتھ ایک نئے طرز کی بنیاد ڈالتا ہے جس میں کردار نگاری پر خاص زور دیا گیا ہے، ان کے کردار نفسیاتی نقطۂ نظر سے جیسے ایسی خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں جو ان سے کسی حالت میں علیحدہ نہیں ہوتے ان کی زندگی کے لیے وہ اسی حد تک ان میں تغیر پیدا کرتے ہیں جو فطرت انسانی کے لئے ضروری ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ سیار کے افسانوں کا موضوع صرف محبت ہوتا ہے، جس میں شاعرانہ رنگینیاں تو بہت کچھ پائی جاتی ہیں لیکن کوئی ایسا اخلاقی سبق جو موجودہ دور کی کشمکش کا حل پیش کر سکے نظر نہیں آتا

سیار کے یہاں جو چیز بہت اہمیت رکھتی ہے وہ ان کا مخصوص طرزِ بیان اور رقمِ قلم ہے اور یہی وہ چیز ہے جو اکثر معمولی سی بات کو بھی اتنا رنگین بنا کر سامنے لاتی ہے کہ وہ ضرور دلکش نظر آنے لگتی ہے ان کی "مذہبیات" سے قطع نظر کر کے ہم ان کے ادبی کارناموں کو دیکھتے ہیں تو وہ ادب کے لئے ایک عمدہ ذخیرہ ہیں انھوں نے عربی اور فارسی کے بہت سے خیالات اور الفاظ کو اردو میں اس طرح ملا دیا کہ وہ زبان کا ایک جزو بن گئے ہیں ان کی جدت پسندی انھیں ہمیشہ عام

راستوں سے الگ لے جاتی ہے اس لئے ان کے مضامین عام مذاق کے نہیں ہوتے اور ان میں علمیت کا پہلو بہت نمایاں ہوتا ہے ایک اچھے رسالے کے ایڈیٹر ہونے کے علاوہ وہ کتابیں بھی لکھتے رہتے ہیں۔ اور اس وقت تک کئی کتابوں کے مصنف ہو چکے ہیں افسانوں کے دو مجموعے "فنکارستان" اور "حالستان" "تاریخ الدولتین" "فراست لیدی" "حیات بھاستا" "ترغیبات عیسیٰ" وغیرہ اردو داں حضرات نہایت توجہ سے پڑھتے ہیں کتابوں کی یہ فہرست ہی بتائے گی کہ سیار اکثر مختلف موضوعات پر طبع آزمائی کرتے رہتے ہیں اور ہر جگہ وہ اس ادبی شان کو برقرار رکھتے ہیں جو ان کے لئے مخصوص ہے سیار کی تحریروں میں بے باکی اور آزادی رائے قدم قدم پر موجود ہے۔

# مسعود حسن

آپ لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو و فارسی کے صدر تھے۔ اب ۱۹۵۲ء میں سکدوش ہو گئے ہیں کتب بینی کا دوق آپ کا ایک فطری مشغلہ ہے یہاں تک کہ اس کا اثر آپ کی مثالی پرورش پر پڑا ہے آپ کا ذاتی کتب خانہ نایاب اور کارآمد کتابوں کا بیش بہا مجموعہ ہے حالانکہ مطالعہ سے آپ کو اتنی فرصت نہیں مل سکی کہ شعر گوئی کی طرف بھی توجہ کرتے حالانکہ شاعری سے بھی دلچسپی ہے اور ادیب تخلص ہے لیکن ادبی دنیا انکو صرف سرنگار کی حیثیت سے جانتی ہے آپ کی کتاب "ہماری شاعری" اردو تنقید میں ایک بیش بہا اضافہ ہے، حالی کے مقدمۂ شعر و شاعری میں توازن پیدا کرنے کے لئے ایک ایسی کتاب کی ضرورت بہت زیادہ محسوس ہو رہی تھی "ہماری شاعری" کا وجود بہت بروقت ہوا انجمن ترقی اردو نے اپنی قدردانی کا ثبوت دیا اور اس کتاب کو اپنی طرف سے شائع کیا جس سے یہ کتاب چھپی ہے اسے قبول عام کی سند

ایسی حاصل ہوئی ہے کہ متعدد بار چھپ چکی ہے

آپ کے ادبی کارنامے ہماری شاعری تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ کئی کارآمد کتابیں آپ مرتب بھی کر چکے ہیں جیسے فیض میر، روح انیس، اندر سبھا، دیوان مائز۔ ان کے شروع میں آپ نے مقدمات بھی لکھے ہیں جن کو اپنی جگہ پر خود ایک مستقل مضمون کی اہمیت حاصل ہے ان مقدمات میں بھی آپ کے الفاظ و رباں، نرمی اور روانی کے لحاظ سے دلکشی اور دلچسپی کا سرمایہ ہیں ویسے کئی کتابیں اور بھی آپ لکھ چکے ہیں

صحیح اور سادہ نثر لکھنا مسعود صاحب کی امتیازی خصوصیت ہے خود ان کی سادگی کے سوتے کیف ہوتی ہے اور یہ حتک ملکہ الفاظ کی سجاوٹ اور جملوں کی ساخت سے ایک خاص روانی اور حلاوت پیدا ہو جاتی ہے شروع سے آخر تک آپ کا طرز نگارش سہل اور ہموار ہے باوجود ثقیل اور روزمرہ مسائل پر گفتگو کرنے کے پڑھنے والوں کی دلچسپی برابر قائم رہتی ہے۔ مرکزی اور ٹھوس باتوں پر ایسے لگ اور مطمئن انداز میں گفتگو کرتے ہیں کہ ان کے مقطعہ سطر سے مخالفت کرنا مشکل ہوتا ہے آپ چاہیں تو ان کے خیال میں اضافہ کر سکتے ہیں لیکن ان کے طرز استدلال سے اتر نہ لینا آسان نہیں آپ زبان اور طرز نگارش پر زیادہ زور دیتے ہیں اور اپنی تنقید میں زیادہ تر انہی چیزوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اگر کسی طبقے کو یہ شکایت ہے کہ آپ کے یہاں عمق اور فلسفہ بہت کم ہے تو یہ ایسی کمی ہے جو ابھی تک تمام اردو تنقید میں کم و بیش پائی جاتی ہے

اصول تنقید کے لحاظ سے مسعود صاحب قدامت پسند نظر آتے ہیں حالانکہ موجودہ اردو شاعری کی روش آپ اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے بلکہ اس افادی شاعری کو جہالت سے تعبیر کرتے ہیں آپ قدیم رنگ کی صد باتی شاعری میں ایک سکون اور نجات کا دریا موجزن پاتے ہیں اور موجودہ رجحان اور حقیقت نگاری کو شاعری میں دیکھ کر

پریشان ہو جاتے ہیں اور وہ غالباً اس لئے کہ زندگی کی حقیقتوں اور پریشانیوں سے یہاں بھی دوچار ہونا پڑتا ہے لیکن اس کو کیا کہیئے کہ ہماری زندگی موجودہ حالت میں سراپا پریشانیوں کا مرقع ہے اور ان کا دور کرنا ہمارے لئے اب ناگزیر ہو گیا ہے ترقی پسند مصنفین اور شعرا حیات کو ادب سے ہم آہنگ کر دینا ضروری سمجھتے ہیں، قدامت پسندی کے لحاظ سے زندگی کی کشمکش سے سکون حاصل کر لینا ہی ادب کا مقصد ہے لیکن موجودہ شاعر اس کو فراریت سے تعبیر کرتا ہے اور قدیم رویہ کو اردو ادب کی ترقی میں ایک روڑا سمجھتا ہے بہرحال یہ فرق جدید اور قدیم خیالات اور اصول زندگی کے ہیں۔ یہاں اس بحث کو زیادہ بڑھانا نامناسب اور شاید بیکار بھی ہے۔

مسعود حسن صاحب حسن انہماک کے ساتھ ایسی تحقیق اور تدقیق کی سرگرمی کو قائم کئے ہوئے ہیں اور حسن وسیع النظری کا ثبوت اب تک انھوں نے دیا ہے اس سے یقین ہے کہ وہ موجودہ ادبی رجحانات سے بھی ایسے کو دور رہ پائیں گے

# محی الدین زور

ڈاکٹر زور عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو ادب کے پروفیسر ہیں انگلستان سے ادب کی ڈاکٹر ہونے کی سند بھی لائے ہیں اردو ادب کی خدمت کرنے کا اتنا شوق ہے کہ اب تک ایک درجن سے زیادہ کتابیں لکھ چکے ہیں یہ تعداد خود ایسی جگہ پر ڈاکٹر زور کے علمی مقعد کی شہادت کے لئے بہت کافی ہے لیکن جب ہم تصنیفات کے مختلف موضوعات پر نظر ڈالتے ہیں تو وقعت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے

آپ نے اردو ادب میں تنقید کی کمی محسوس کر کے اس موضوع پر قلم اٹھایا انگریزی کے فن تنقید سے مدد لے کر ایسے ادب کو فائدہ پہنچانے کی کوشش کی نہایت محنت کے

ساتھ اصول تنقید، اقسام تنقید پر مواد فراہم کئے، اردو ادب پر ان کی روشنی میں نظر ڈالی مختلف مصنفین کے کارناموں پر بحث کی شبلی کی طرح اردو کو فائدہ پہنچانے کے لئے اردو کے علاوہ دوسری زبانوں کی سرد نظم پر تنقیدی نظر ڈالی بعض انگریزی شعراء کے کلام پر رائے زنی کر کے ہماری رہنمائی کے لئے عمدہ نمونے پیش کئے ڈاکٹر زور کا یہ تمام کارنامہ ایسی جگہ پر خاص اہمیت رکھتا ہے ان کی تصانیف میں ہم کو کافی ایسا مواد مل جاتا ہے جو ادبی علمی معلومات کے لئے بہت کارآمد و ضروری ہے ایسے مطالعہ سے خود ہی فائدہ نہیں اٹھاتے بلکہ جو کچھ عمدہ چیزیں کہیں منتشر صورت میں بھی نظر آجاتی ہیں ان کو اردو ادب میں لانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں دنیا کے سامنے کتابی صورت میں مع اپنی رائے کے دوبارہ پیش کر دیتے ہیں اس سلسلے میں ایک قابل قدر چیز یہ ہے کہ انگریزی زبان کے وسیع مطالعہ سے آپ بجا طور پر مغرب سے متاثر نہیں ہوئے مشرق و مغرب کے طرز معاشرت کے مقابلہ نظر کے اسلامات کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔ کسی نوجوان اور بہکے ہوئے انگریزی داں یا مغرب زدہ کی طرح اپنی زبان اور اپنے ادب کو حقیر نہیں سمجھا ان کی ضرورت محسوس کی ہے خود اتنا بھی ہے اور بغیر اس احساس کے ادب کی ترقی بھی ناممکن ہے

ڈاکٹر زور کو مالا کثرت مطالعہ نے اتنی فرصت نہیں دی کہ وہ اپنے اسلوب بیان میں کوئی خاص انفرادیت پیدا کر سکیں ان کے طرز بیان میں سادگی اور روانی تو ہے صحت کی و متانت کی بھی کمی نہیں لیکن ملوں میں دھیں، دھیں زور کو ڈھونڈتا ہی رہ جاتا ہے اس قدر ان کی وجہ سے عبارت میں ایک پھیکا پن کبھی کبھی محسوس ہونے لگتا ہے۔ خیال ہوتا ہے کہ ادبیت کی کمی ہے ڈاکٹر زور نے تنقیدی مقالات میں ایک جگہ خاکی کی طرز تحریر پر اور ان کی جس نمایاں خصوصیات کی فہرست دی ہے ان میں سے کافی ایسی ہیں جو کم و بیش ڈاکٹر زور کی خصوصیات میں شامل کی جا سکتی ہیں خود ان ہی کے الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ڈاکٹر زور کی تحریر کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں۔

۱۔ ان کی عبارت میں طرافت، شوخی اور طنز و تشنیع بالکل نہیں برخلاف اس کے وہ ہر بات کو سنجیدگی اور متانت سے ادا کرتے ہیں۔

۲۔ ان کے کلام میں فارسی عربی کے موٹے موٹے الفاظ اور اس قسم کی حد بندیاں بہت کم ہیں جو آجکل کے نوجوان اشتراکی اردو میں بہت پائی جاتی ہیں۔

۳۔ وہ بازاری سوقیانہ اور مبتذل الفاظ استعمال نہیں کرتے

۴۔ نئے نئے استعاروں اور تلمیحوں سے بہت کام لیتے ہیں

"ادارہ ادبیات اردو" قائم کر کے وہ اردو کی اہم خدمات انجام دے رہے ہیں اس ادارہ سے بہت سی کتابوں کے علاوہ "کلیات سرور"، "کلیات قطب شاہ" بہت اچھی طرح شائع ہو چکی ہیں۔

# احتشام حسین

آپ قصبہ ماہل ضلع اعظم گڑھ کے رہنے والے ہیں ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے انٹرنس اعظم گڑھ کے ہیلی ہائی اسکول سے پاس کر کے حصول تعلیم کے لئے الہ آباد آئے اور یہاں سے ایم اے پاس کر کے ۱۹۳۸ء میں لکھنؤ یونیورسٹی میں اردو کے لکچرر مقرر ہو گئے اس تقرر کے پہلے ہی آپ غیر معمولی ذہانت اور ادبی ذوق کی وجہ سے دنیائے ادب کی نگاہوں کا مرکز بن چکے تھے یونیورسٹی کی ملازمت کے بعد جب فکر معاش سے اطمینان ہوا تو آپ نے اپنے فرائض منصبی کے ادا کرنے کے ساتھ ہی ساتھ مضامین اور افسانے لکھنے کی طرف زیادہ توجہ کی اور کچھ ہی دنوں کے بعد ملک کے تمام وقیع رسائل میں آپکے مضامین نظر آنے لگے

احتشام حسین صاحب کے معرکی ادبی کاوشوں دلچسپی اور شغف کے ساتھ مطالعہ کیا

ان غیر ملکی خیالات کو ایسے ادب پر منطبق کرنے میں کورانہ تقلید کے بجائے احتیاط مدنظر رکھی ہے۔ ان کی تنقیدی تحریریں بہت سلجھی ہوئی ہیں۔ وہ معاشی اور مادی توجیہہ کو ہر دوسرے ادبی نقطۂ نظر پر ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک زندگی اور ادب دونوں اساسی قدریں مادی قدریں ہیں ادبی نقطۂ نظر سے ان کی تنقیدوں میں ایک طرح کی انفرادیت ہے خالی یزدانی کا مضمون تنقید میں ایک نئے نقطۂ نظر کا پتہ دیتا ہے۔ آپ کی تصنیف "تنقیدی جائزے" اردو کی فن تنقید نگاری میں ایک اضافہ ہے جو ادبی حلقوں سے خراج تحسین وصول کر چکی ہے اس کے علاوہ احتشام صاحب کی دوسری تصانیف حسب ذیل ہیں۔

روایت و بغاوت، ادب اور سماج اردو لسانیات کا خاکہ (ترجمہ) ویرا (افسانوں کا مجموعہ) تنقید اور عملی تنقید۔

طرز تحریر میں علاوہ شگفتگی کے ایک خاص ندرت و لطافت ہے جس سے دلکشی میں قابل قدر اضافہ ہو جاتا ہے۔

احتشام حسین صاحب کو امریکہ کی ایک انجمن نے وہاں کے ذہنی رجحانات کے مطالعہ کے لئے ایک خاص وظیفہ دے کر مدعو کیا ہے چنانچہ موصوف وہیں ہیں اس کے معنی ہیں کہ غیر ممالک کے لوگ بھی ان کی قابلیت اور طرز تحریر کے قائل ہیں۔ ہمارے نزدیک احتشام حسین اس وقت اردو کے سب سے بڑے نقاد ہیں۔

سال بھر کے بعد احتشام صاحب امریکہ و لندن وغیرہ کے سفر سے کامیاب واپس آئے وہاں کے چشم دید حالات اور ایسے تاثرات کو کتابی صورت میں، ساحل اور سمندر کے نام سے شائع بھی کر دیا ہے۔

# عندلیب شادانی

ان کا نام وجاہت حسین ہے اصل وطن سنبھل ضلع مراد آباد ہے ماہال رامپور میں ہے ابتدائی تعلیم وہیں ہوئی دسویں درجے میں پڑھتے پڑھتے رامپور سے لاہور چلے گئے، وہاں حصول تعلیم میں مصروف رہے ۱۹۲۵ء میں پنجاب یونیورسٹی سے فارسی میں ایم اے کیا۔ اس سے پہلے ہی کچھ دنوں خالصہ کالج لاہور میں ملازم رہے ۱۹۲۶ء میں ہندو کالج دہلی میں فارسی کے لیکچرار ہو گئے ۱۹۲۸ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی میں پروفیسر ہو گئے ۱۹۳۳ء میں لندن یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اب تک آپ ڈھاکہ یونیورسٹی میں شعبۂ فارسی اور اردو کے پروفیسر ہیں

ڈاکٹر عندلیب شادانی عرصہ سے اردو ادب کی خدمت کر رہے ہیں اب تک ان کے کئی مجموعے نثر و نظم میں شائع ہو چکے ہیں ان کا قلم نثر و نظم، دونوں میدانوں میں یکساں رواں ہے اس کا فیصلہ کرنا آسان کام نہیں کہ وہ شاعر زیادہ ہیں یا نثر نگار لیکن اتنا ضرور ہے کہ ان دونوں میں ان کی انفرادیت نمایاں ہے نظم میں زیادہ تر ایسے ہی خیالات بلند کرتے ہیں جو انچھوتے ہوں ان کے تخریبات یا محسوسات یہی ہوں اس لئے ان کے کلام میں شگفتگی اور تازگی بہت کافی ہوتی ہے الفاظ و خیالات ہم آہنگ ہوتے ہیں اسلوب بحروں کا ساتھ یا کریری و صاحت و تناسکی کے ساتھ دل و دماغ پر چھا جاتے ہیں وہ شعر کہنے کے لئے نہیں کہتے بلکہ جب جذبات و خیالات ان کو مجبور کرتے ہیں تب ہی وہ قلم اٹھاتے ہیں

نظم سے زیادہ ان کی نثری خدمات اردو میں تنقید و قابل قدر ہیں جس کی

سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ صاحب علم بھی ہیں اور اپنی رائے پر اتنا غور کرتے ہیں، اس کے موافق و مخالف پہلوؤں پر جذبات سے الگ ہو کر اتنا سوچتے ہیں کہ جس نتیجہ پر پہنچتے ہیں وہ جاندار اور مدلل ہوتا ہے اس کی رائے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن جو منطقی ماحول وہ اپنے دلائل کو عطا کرتے ہیں اس کے دائرہ سے باہر نکلنا آسان نہیں ہوتا جس موضوع یا مصنف پر وہ رائے زنی کرتے ہیں نہایت بیباک ہو کر اظہار خیال کرتے ہیں خوبی یہ ہے کہ لہجہ یا انداز بیان میں ذاتی خصومت نہیں پیدا ہوتی بلکہ ساری فضا ایک مقدمہ و تصرہ کے آغوش میں جھومتی رہتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ تاوالی صاحب گرامر اور ادبی رسمیات پر ضرورت سے زیادہ زور دیتے ہیں سماج کے بدلے ہوئے رنگ سے اپنے کو ہم آہنگ نہیں کر پاتے نئی تعبیرات و ضروریات کو رواداری کے ساتھ دیکھنا نہیں چاہتے۔ عہد ماضی کے پرستار ہیں دور جدید پر رجعت پسندانہ نظر بھی ڈالنا گوارا نہیں کرتے۔ وہ ایسی تنقید زبان لکھتے بولتے دیکھنا چاہتے ہیں نہ اجتہاد کے قائل ہیں اور نہ ادیبوں کی جرات رندانہ کی داد دے سکتے ہیں۔ یہ بعید کرتے ہیں کہ کبھی کوئی شاعر ان حالات کو قلمبند کرے جو ماوجود حقائق پر مبنی ہوں کے عام طور پر ناگفتنی سمجھے جاتے ہیں

تاوالی صاحب کا نثر میں اسلوب بیان نہایت سیدھا سادا ہے وہ تشبیہات و استعارات کے سہارے پر قلم نہیں اٹھاتے بلکہ مواد کی فراوانی اور خیال کی مضبوطی سے سنوار ہو کر دل کی بات کہتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ باتیں کر رہے ہیں ان کی عبارت میں عموماً قول محال کی چاشنی ہوتی ہے محاورات و ضرب الامثال موقع سے پیش کر کے دل کشی میں اضافہ کرتے جاتے ہیں خاص بات یہ ہے کہ وہ ثقیل الفاظ و کیف عبارت سے مضمون کو کبھی مجروح نہیں ہونے دیتے۔

شوکت سبزواری نے ایک جگہ[1] تاوالی صاحب کے بارے میں لکھا ہے کہ

---

[1] نقوش شخصیات نمبر جنوری ۱۹۵۵ء

"انھوں نے اردو کے اساتذہ کے کلام کا مطالعہ انفرادی نگاہ سے کیا اسے ذاتی معیاروں پر رکھ کے دیکھا اور جب انھیں شاعر کی زندگی اور اس کے کلام میں تضاد نظر آیا تو وہ شاعر کو رسم پرست اور اس کے کلام کو رواجی کہنے لگے اگر وہ انفرادیت کے تنگ دائرہ سے باہر نکل کر دیکھتے اور آفاقی یا خارجی نقطۂ نگاہ پیدا کرتے تو وہ ان شعرا کے کلام کو صرف ان کی زندگی پر منطبق کرنے کی کوشش نہ کرتے اس میں انھیں گرد و پیش کی تصویر نظر آتی اور وہ ان کی آواز کو کائنات کے دکھی دلوں کی صدائے بازگشت سمجھ کر اس پر معترض نہ ہوتے" اس رائے سے ہم کو بھی اتفاق ہے۔

# آل احمد سرور

۱۹۱۲ء میں بدایوں میں پیدا ہوئے والد کی ملازمت کی وجہ سے ہائی اسکول تک کی تعلیم مختلف مقامات پر ہوئی۔ مثلاً پیلی بھیت، بدایوں، گونڈہ، ساری یونیورسٹی بی ایس سی ۱۹۳۲ء میں سینٹ جانس کالج آگرہ سے کیا۔ علی گڑھ سے ۱۹۳۴ء میں ایم اے کیا اس کے بعد وہیں مسلم یونیورسٹی میں جگہ مل گئی۔ پانچ سال تک عارضی پڑھاتے رہے۔ پھر بحیثیت استاد کے شعبہ اردو میں منتقل ہو گئے کئی سال کام کرنے کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی میں ریڈر ہو کر چلے آئے ۱۹۵۵ء میں پروفیسر ہو کر پھر مسلم یونیورسٹی چلے گئے۔

سرور صاحب کی چار کتابیں اب تک شائع ہو چکی ہیں تنقیدی اشارے ہے اور رائے چراغ تنقید کیا ہے ادب اور نظریہ ان کے علاوہ مضامین کا ایک مجموعہ بھی ہے

نقاد کی حیثیت سے سرور صاحب نے ست جلد ایک نام شہرت حاصل

کمالی جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ سائنس سے بھی واقف تھے انگریزی ادب کے بھی ماہر تھے اور اردو کے تو پروفیسر ہی ہیں انھوں نے اردو کا مزاج سمجھتے ہوئے سائنس کا طرز تخیل بھی اردو میں لانے کی کوشش کی اور انگریزی ادب سے بنیادی اصولوں کو لے کر کے ایسی زبان کو ہر لحاظ سے وسعت عطا کی مختلف معلومات کے امتزاج کی وجہ سے ان کی تنقید نگاری نے ایک نمایاں حیثیت حاصل کر لی چونکہ تعلیم ہی سے ان کا ماحول علمی و ادبی تھا اس لئے ادبی شعور ان کی طبیعت کا جزو ہو گیا تھا وہ اردو کے مسائل، محاسن پر اپنی ایک رائے رکھتے تھے۔ مشرق و مغرب کے اسالیب بیان و طرز معاشرت کا فرق پوری طرح محسوس کرتے رہے یہ سمجھتے تھے کہ انگریزی ادب پڑھ کر اس سے اتنا متاثر ہو جائیں کہ اردو کو اگر انگریزی کی عینک سے دیکھنے لگیں یا جو اختلاف مزاج کے بھی انھوں نے اردو کی ایسی خصوصیات پر جو بادی النظر میں عیوب سے تعبیر کی جاتی تھیں۔ ٹھنڈے دل سے غور کر کے حقیقت حال بیان کرنے کی کوشش کی اور سمجھایا کہ ان شبہات و استعارات تلمیحات کے پردے ہٹا کر دیکھنا چاہیے کہ ہمارے ادیبوں کے پیش نظر کیا چیزیں تھیں اردو نے بات کرنے کا اور سوچنے کا ڈھنگ و حقیقت انوکھا تھا اس کو سمجھنے کے لئے اردو کے مزاج سے واقفیت ضروری ہے

سرور صاحب کا طرز استدلال بہت دلکش ہے وہ جس بات کو سمجھاتے ہیں اس کی وضاحت پوری طرح کرتے ہیں۔ عبارت میں ابہام یا الجھاؤ نہیں ہوتا کہ وہ اصل مقصد تک پہنچنے میں دقت محسوس کرے ایک اور خاص انداز ان کے یہاں نظر آتا ہے وہ تنقید کو وہی زبان دیتے ہیں جو اس کے لئے مناسب ہوتی ہے نہ ادبیت زیادہ ہوتی ہے اور نہ بوجھل بلکہ عبارت ایک دھارے کی طرح اپنے راستے پر چلی جاتی ہے اس انداز بیان سے بعض لوگوں کو شکایت بھی ہے کہ سرور صاحب کے طرز بیان

میں جوش و خروش کی کمی دہن میں ایک افسردگی پیدا کر دیتی ہے عالبا اسی قسم کی مشکلات کا احساس کرتے ہوئے سرور صاحب نے اپنی کتاب "تنقید کیا ہے" کے دیباچے میں ایک جگہ لکھ دیا ہے کہ "ایک بات مجھے اسلوب کے متعلق کہنی ہے میں نے اپنے مضامین میں جا بجا شاعرانہ اندازیاں یا جذباتی اسلوب کے خلاف آرا ظاہر کی ہے میرے یہاں اشعار کی کثرت یا اقتباسات کی بھرمار نہ ملے گی لیکن اشعار لے والوں کتابوں کے نام، ادبی شخصیتوں کے تذکرے، ادبی تحریکوں کے متعلق اشاروں سے آپ کو تنقید کے دور کا اندازہ ہو سکتا ہے مجھے وہ دور بھی کھلی علامت ہوتی ہے جس میں بیال آئینے کی طرح واضح ہے جس میں علمیت کا رعب ڈالنا مقصد نہیں"

آخر میں اسی کتاب کے دیباچہ سے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ سرور صاحب کے خیالات تنقید کے بارے میں بھی آپ کے سامنے پیش کر دیں کہتے ہیں "میں تنقید کو ایک سنجیدہ، اہم اور مشکل کام سمجھتا ہوں اور اس کا مقصد لطف سخن نہیں بلکہ قدروں کی اشاعت جانتا ہوں اس لئے پڑھنے والوں سے بھی سنجیدگی اور تنقیدی غور و فکر کا مطالبہ کرتا ہوں"

# وقار عظیم

ان کا تاریخی نام سید وقار عظیم ہے سنہ ۱۹۲۷ء میں سرگودھا میں پیدا ہوئے تھے سیرٹھ کے رہنے والے تھے اب پاکستان میں اورینٹل کالج لاہور میں تدریس کے کام کر رہے ہیں۔ ابتدائی تعلیم میرٹھ میں ہوئی پھر آگرہ میں پڑھتے رہے جب اسکول کے پانچویں درجے میں تھے تو انگریزی شروع کی بی اے لکھنؤ یونیورسٹی سے پاس کیا اور ایم اے الہ آباد یونیورسٹی سے ہر امتحان امتیازی حیثیت سے

پاس کرتے رہے۔ بڑے ہونہار طالب علم تھے یہاں تک کہ دوران تعلیم ہی میں کتابیں ہمارے افسانے" اور" افسانہ نگاری" ایسی لکھیں جو بہت کارآمد ثابت ہوئیں

تعلیم حاصل کرنے کے بعد کسب معاش کے لئے مختلف مقامات کا چکر لگاتے رہے مختلف عہدوں پر وقتاً فوقتاً کام کرتے رہے۔ جب حکومت ہند نے سرکاری جریدہ "آج کل" نکالنا چاہا تو سب سے پہلا ایڈیٹر ان کو ہی منتخب کیا وقار عظیم صاحب بڑی قابلیت سے، یہ کا فرض ادا کرتے رہے تقسیم ہند کے بعد کراچی چلے گئے اور وہاں حکومت پاکستان کا رسالہ" ماہ نو" مرتب کرتے رہے گویا ہر سرکاری جریدے کی ابتدا دونوں ملکوں میں ان ہی کے ہاتھوں سے ہوئی۔ کچھ عرصہ کے بعد اورینٹل کالج لاہور میں لکچرار کی حیثیت سے چلے آئے اور اب تک وہیں ہیں

وقار عظیم صاحب کا علمی و ادبی ذوق ہمیشہ اہل علم اور صاحب فن سے ملنے پر مائل کرتا رہا جیسا بچہ وہ برابر پڑھے لکھے لوگوں سے ملتے رہے۔ علم سینہ اور علم سفینہ دونوں سے فیض یاب ہوتے رہے۔ لکھنے پڑھنے کی ہوس شروع ہی سے تھی چنانچہ اب تک ہے بلکہ یوں سمجھنا چاہیے کہ پڑھنا لکھنا ان کا اوڑھنا بچھونا ہے جب لکھنے پر آتے ہیں تو نہ کسی ماحول کی ضرورت محسوس کرتے ہیں اور نہ اس وسکوں کی فکر کرتے ہیں ان کا قلم ہر حال میں چلتا رہتا ہے چاہے شور و غل ہو یا لوگ پاس بیٹھے ہوئے دوسری تفریحات میں مصروف ہوں ان کو اپنے کام سے کام، وہ ایک روزانہ اخبار کے ایڈیٹر کی طرح لکھتے وقت ساری دنیا سے بے خبر ہو کر فوراً سب کچھ لکھ جاتے ہیں ان کی اس عجلت پسندی میں ایک خرابی بھی کبھی کبھی نظر آتی ہے تفکر و تجسس کے عناصر کم ہو جاتے ہیں لیکن ان کے احاطۂ تنقید سے کوئی قابل ذکر بات نہیں رہ جاتی جس موضوع کو لیتے ہیں اس کا پورا جائزہ لیتے ہیں اور بے لوث ہو کر معائب و محاسن پر تبصرہ کرتے ہیں۔

وقار عظیم صاحب کا طرزِ تخیل داستان قدیم سے زیادہ قریب ہے وہ اپنے تنقیدی تصور کو نئے نظریات سے ہم آہنگ نہیں کرنا چاہتے زیادہ تر ان کا خیال الفاظ و زبان کی صحت پر رہتا ہے فن اور مواد پر دھیان کم رہتا ہے لیکن جو بات کہتے ہیں نہایت واضح اور صاف غالباً ان کی طرز تحریر میں ابہام و پیچیدگی کی گنجائش بھی نہیں ان کے خیال میں بھی سادگی ہے بیان میں بھی سادگی اور طرز تحریر میں بھی ان کی تصانیف پڑھتے وقت آپ کو کہیں دہرانا نہ محسوس ہوگا آسانی سے ہر بات سمجھ میں آجائے گی اور آخر میں محسوس ہوگا کہ بہت کچھ معلومات میں اضافہ ہوا وقار عظیم صاحب سے اختلاف رائے پر زیادہ دیر تک بحث نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ اپنی تائید میں اتنے حوالہ جات پیش کر دیتے ہیں کہ اختلاف کرنا بالکل محدود ہو جاتا ہے کہ ان مستند مصنفوں سے بحث کرے جن کا حوالہ دیا گیا ہے اس اتنا لال اور ذوق کے بعد جب وقار صاحب انفرادی حیثیت سے کسی ادبی تصنیف یا مسئلے پر رائے دیتے ہیں تو اس میں پختگی اور تصور کا بڑا حصہ ہوتا ہے ایک اور خوبی ان کے یہاں یہ ملتی ہے کہ نقطۂ نگاہ میں فرسودگی یا بیان میں تکرار نہیں اپنے محدود دائرۂ تخیل میں وہ آزاد ہو کر نئے پہلوؤں کو پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں اگر یہ طریقہ وسیع النظری سے ہم آہنگ ہو جائے تو پھر ہم کو وقار عظیم صاحب کے یہاں کوئی کمی محسوس نہ ہو۔

# ممتاز حسین

ان کی جائے ولادت ضلع غازی پور کا ایک قصبہ "یارہ" ہے۔ ابتدائی تعلیم غازی پور ہی میں ہوئی۔ انٹرنس پاس کرنے کے بعد الہ آباد میں بی اے تک کی تعلیم حاصل کی بعد میں مسلم یونیورسٹی سے بی ٹی اور آگرہ یونیورسٹی سے ایم اے پاس کیا مختلف

مقامات پر ملازمت کرتے رہے۔ مزاج میں ہمیشہ سے سیر و سیاحت کا مادہ تھا چنانچہ تقسیم ہند کے پہلے کوئٹہ اور سندھ کے مختلف تعلیمی اداروں میں نوکری کرتے رہے پھر سب سے دست بردار ہو کر ذوقِ سیاحت کی تشنگی بجھانے کے لئے کبھی مدراس کبھی میسور کبھی مبئی غرضکہ ہندوستان کے ہر گوشے کی سیر کر ڈالی فی الحال وہ کراچی میں قیام پذیر ہیں۔

تمام سیر و سیاحت میں انھوں نے اپنا علمی مشغلہ نہ چھوڑا جہاں کہیں بھی رہے اور جس حال میں رہے کتابوں کا مطالعہ جاری رکھا پڑھنے کو تو اور بہت سے لوگ پڑھتے رہتے ہیں اور ہر حال میں پڑھتے رہتے ہیں لیکن ممتاز حسین کی انفرادیت قابل قدر ہے کہ جو معلومات وہ حاصل کرتے تھے اس پر غور و فکر کرتے رہتے اور عام خیالات یا لکیروں پر اپنی رائے قائم کرتے کورانہ تقلید کی نہ کبھی کوشش کی نہ اپنے ذہن کو بڑے سے بڑے مفکر کے سامنے صرف اس لئے مفلوج کرنے کی عادت ڈالی کہ یہ خیال یا فکر ایک بڑے ادبی مفکر کے ذہن کا نتیجہ ہے مختصر یہ کہ وہ اپنے طور پر سوچنے اور سمجھنے کے عادی ہو گئے

جہاں تک علوم ہے ممتاز حسین کبھی فلسفہ یا تاریخ کے باقاعدہ طالب علم نہیں رہے بلکہ اپنے طور پر ان علوم کا مطالعہ کرتے رہے۔ مگر ان کی تحریروں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فلسفہ اور تاریخ ان کے خاص مضمون تھے مختلف علوم و فنون سے آراستہ ہو کر جب انھوں نے قلم اٹھایا تو ان کی تحریر میں اضافہ ہوا لکھنے کو انھوں نے افسانے بھی لکھے مگر فن تنقید کی طرف زیادہ توجہ کی اس میں ایک عالمانہ انداز اور مخصوص فکری عناصر سے مدد اٹھایا۔ جذباتی طرزِ فکر اردو تنقید میں پرانی چیز تھی۔ اس کے سمجھنے اور چاہنے والے اردو میں بہت کم تھے ممتاز حسین نے اپنی تنقید کو اس عنصر سے مالدار بنانے کی کوشش کی اور ایسی

صلاحیتوں کا ثبوت دیا کہ عام طور سے سمجھا جاتا ہے کہ ان سے بہتر اردو میں ابھی تک کسی کا کارنامہ اس سطح تک نہیں آیا۔ ممتاز حسین کی تنقید ٹھوس اور پُر معنی ہوتی ہے اس میں جذبات سے زیادہ عقل کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ اپنے خیالات کو لاثانی تاریخی واقعات سے مضبوط کرتے ہیں اپنی ہر رائے کے لئے ثبوت پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں مغرب و مشرق کی اہم شخصیتوں کے خیالات و اقوال تائید میں لاتے رہتے ہیں ہر قدم پر محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے بڑے بڑے مفکرین کے لاشعاعی فکر کو سوچ سمجھ کر اپنے ذہن میں جگہ دی ہے ان کی تحریروں میں اتنا اثر ہوتا ہے کہ تھوڑی دیر تک پڑھنے کے بعد کتاب رکھ کر سوچنا پڑتا ہے کہ ہم نے کیا پڑھا اور ممتاز صاحب نے کیا لکھا اس کو ہم نے ذہن میں کہاں تک محفوظ کیا اور آخر میں معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے پڑھا کم لیکن معلومات زیادہ حاصل ہوئیں ذہن میں بہت سی باتیں آگئیں۔

ان کی تحریروں میں سرور و نشاط ہوتا ہے نہ غصہ اور طنز کی لہریں نظر آتی ہیں بلکہ ایک پُر تاثر سنجیدگی اور ذہنی اُبھار کا احساس ہوتا ہے۔ کبھی کبھی معلوم ہوتا ہے کہ طرزِ تحریر میں شگفتگی و دلچسپی ہونی چاہیئے۔ الفاظ کا استعمال اور جملوں کی ساخت کبھی کبھی مانوس معلوم ہوتی ہے جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ انھوں نے لکھنا بہت دیر میں شروع کیا۔ طرزِ تحریر میں بے ساختگی نہیں پیدا ہوسکی عبارت میں آمد سے زیادہ آورد ہے ہوسکتا ہے کہ یہ احساس اس لئے ہو کہ وہ عورتوں اور بچوں کی باتوں کے لانے کی فکر میں استاد پر اری کا لحاظ کم کرتے ہیں یا پھر مانوس باتوں کو نئے سانچے میں دیکھ کر پرانے سانچے میں ڈھلی ہوئی ا۔۔۔ ان کی تحریر میں وہ انبساط نہیں پیدا کرتی ہو جو اسے کرنا چاہیئے۔

# ۶
# ناول

## نذیر احمد

نذیر احمد ۱۲۵۲ھ مطابق ۱۸۳۶ء میں مقام موضع ریہڑ ضلع بجنور پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم اپنے باپ سے حاصل کی بعد میں مولوی نصر اللہ خاں سے عربی کی تعلیم حاصل کی اس کے بعد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے دہلی آئے اور کچھ دنوں تک مکتب میں پڑھتے رہے مگر یہاں کی تعلیم سے سیری نہ ہوئی خوش قسمتی سے دہلی کالج میں داخلہ ہوگیا اور قابلیت کی وجہ سے وظیفہ بھی مقرر ہوگیا اس کالج میں آٹھ برس تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد فراغت حاصل ہوئی تو ملازمت کی فکر ہوئی ضلع گجرات (پنجاب) میں چالیس روپے ماہوار پر مدرس ہوگئے دو برس تک اس ملازمت کو نباہتے رہے پھر اس کے بعد استعفیٰ دے کر کان پور میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہوگئے۔ لیکن وہاں کی بھی ملازمت راس نہ آئی اور استعفیٰ دیا پڑا خوش قسمتی تھی کہ بار بار ملازمت ترک کرتے تھے اور پھر مل جاتی تھی۔

۱۸۵۷ء کے بعد نذیر احمد ڈپٹی انسپکٹر مدارس الہ آباد متعین ہوئے اور یہاں

انگریزی پڑھنے کا شوق ہوا۔ چنانچہ چند دنوں میں اس علم کو بھی حاصل کر لیا جب دل اچھے آتے ہیں تو ترقی کی راہیں خود بخود کھل جاتی ہیں۔ گورنمنٹ کو اس زمانہ میں تعزیرات ہند کا ترجمہ کرانا منظور تھا مولوی عظمت اللہ اور مولوی کریم بخش اس کام پر پہلے سے مامور تھے بعد میں نذیر احمد بھی ترجمہ کے کام میں شریک کئے گئے ان کا کام اتنا پسند آیا کہ لفٹنٹ گورنر سر ولیم میور نے خوش ہو کر کانپور کا تحصیلدار کر دیا جس سے ترقی کر کے نذیر احمد ۱۸۶۳ء میں ڈپٹی کلکٹر ہو گئے۔

ایک ہیئت کی کتاب حیدر آباد کے ریزیڈنٹ نے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے کے لئے بھیجی جس کو انھوں نے اس خوبی سے انجام دیا کہ حیدر آباد والوں نے آٹھ سو روپے ماہوار پر انہیں یہاں بلا لیا یہاں رہ کر انھوں نے اپنی علمی قابلیت سے بہت کچھ ترقی کی لیکن آخر میں سیاسی مصلحت کی وجہ سے پنشن لیکر دہلی واپس چلے آئے پنشن لینے کے بعد نذیر احمد کو یکسوئی حاصل ہو گئی۔ اور لکھنے پڑھنے کا کام زیادہ سرگرمی سے کرنے لگے مگر جسمانی قوت روز بروز زائل ہوتی جاتی تھی اعضا ایک ایک کر کے جواب دیتے جاتے تھے ہاتھوں میں رعشہ آ گیا۔ بینائی بھی کم ہو چلی لیکن علم کا چسکا ایک بری بلا ہے مرتے دم تک لکھنے پڑھنے کا شغل جاری رہا یہاں تک کہ جب خود کام نہ کر سکتے تھے تو دوسروں سے لیتے تھے آخر ۱۹۱۲ء میں انتقال ہوا

یوں تو گورنمنٹ نے نذیر احمد کی علمی خدمات پر اکثر انعامات دئے لیکن ۱۸۹۷ء میں شمس العلماء کے خطاب سے سرفراز فرمایا اور ۱۹۰۲ء میں اڈنبرا یونیورسٹی نے ایل ایل ڈی کی ڈگری عطا کی۔

نذیر احمد کی یادگار حسب ذیل کتابیں ہیں۔

مادل، مراۃ العروس، بنات النعش، توبۃ النصوح، ابن الوقت، محصنات ایامیٰ، رویائے صادقہ، منتخب الحکایات

مدیر احمد

اخلاق و مذہب، ترجمہ قرآن شریف۔ اوعیۃ القرآن۔ دہ سورہ الحقوق والفرائض
مطالب القرآن۔ امہات الامہ، اجتہاد، موعظ حسنہ
قواعد رسم الخط صرف صغیر بالغنیک فی الصرف
تحریرات ہند قانون شہادت (ترجمہ)

مدیر احمد کا بڑا کام اصلاح معاشرت ہے جس کا خیال انھوں نے اپنی ناولوں میں رکھا ہے انھوں نے اسلامی سوسائٹی اور خاص کر مسلمانوں کے خاندانوں کی اندرونی معاشرت کی تصویر ایسی بے لاگ کھینچی ہے کہ آنکھوں کے سامنے نقشہ پھر جاتا ہے۔ روزمرہ کے معمولی واقعات جو صبح و شام ہماری آنکھوں کے سامنے گھروں میں اندر باہر واقع ہوتے رہتے ہیں ان کا جو لی سے بیان کرنا مدیر احمد کا خاص حصہ ہے ان کے اسمات طبقۂ نسواں پر بھی کم نہیں۔ مراۃ العروس وغیرہ میں عورتوں کے خیالات کو جو سوا اس جو لی سے ادا کیا ہے کہ یہ جو لی کسی دوسرے مصنف کو نصیب نہیں ہوئی ان کی تحریر میں تکلف اور بے ساختہ پن بہت ہے وہ تشبیہ اور استعارے سے بہت کم کام لیتے ہیں یہ ضرور ہے کہ بعض وقت مغلق الفاظ لکھتے ہیں جس کی خاص وجہ عالباً ان کی عربی دانی ہے لیکن جہاں موقع ہوتا ہے وہاں عام محاورے کے الفاظ بھی لانے میں دریغ نہیں کرتے۔ گو مناسبت اور سجع کی کا لحاظ عبارت میں رکھتے ہیں لیکن پھر بھی اپنے مفہوم کو پوری طرح ادا کرنے کے لئے بعض وقت رکیک اور مبتذل الفاظ بھی لے لیتے ہیں محاورات کا بھی یہی حال ہے عموماً ہر وقت محاوروں کا خیال رکھتے ہیں لیکن کہیں کہیں بے محل محاورات بھی صرف ہو گئے ہیں (اسی طرح انگریزی الفاظ کی بھی بھرمار ہے) ان کی تحریر میں شوخی و ظرافت بہت کافی ہے۔

**ناول نویسی کے موجد** عام طور پر اردو کی ناول نویسی کا بانی سرشار کو خیال

کیا جاتا ہے لیکن حقیقت میں نذیر احمد اردو کے سب سے پہلے ناول نویس ہیں اس لئے انکی تصانیف مراۃ العروس (۱۸۶۹ء) بنات النعش (۱۸۷۲ء) اور توبۃ النصوح (۱۸۷۴ء) سرشار کے پہلے ناول سے بہت قبل شائع ہو چکی تھیں[1]

نذیر احمد نے قوت گویائی میں بھی خاص ملکہ حاصل کر لیا تھا اکثر بڑے بڑے جلسوں میں پُر زور تقریریں بھی کیں اس طرح شعر گوئی سے بھی آخر میں دلچسپی ہو گئی تھی لیکن اس میدان میں ان کو کوئی خاص امتیاز حاصل نہیں ہوا۔

# سرشار

۱۸۴۶ء یا ۱۸۴۷ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ابھی صرف چار سال کے تھے کہ سایۂ پدری سے محروم ہو گئے اس زمانہ میں عربی و فارسی کی تعلیم تحصیل میں ایک لازمی چیز تھی۔ سرشار نے بھی فارسی پڑھنا شروع کر دیا۔ تھوڑے عرصے میں کافی دستگاہ حاصل کر لی۔ جب انگریزی تعلیم کا رواج ہوا تو کیننگ کالج میں داخل ہو گئے مگر کوئی ڈگری حاصل نہ کر سکے۔

سلسلۂ معاش کے لئے کھیری کے صلع اسکول میں مدرسی کر لی اس وقت ہندوستان اور خاص کر اودھ ایک نئے دور سے گزر رہا تھا ہر طرف اصلاح اختراع اور ایجاد کی دھوم تھی۔ ایسی قومی زندگی درست کرنے کے لئے کشمیریوں نے بھی ایک رسالہ نکالا جس کا نام مراسلۂ کشمیر تھا سرشار کو یہیں ہی سے انشا پردازی کا شوق تھا اس موقع کو غنیمت سمجھ کر انھوں نے بھی اس رسالہ میں اپنے مضامین

---

[1] اس سلسلے میں ایس احمد صاحب ایم اے کی کتاب اردو کا پہلا ناول نگار قابل دید ہے جس پر مصنف کو ہندوستانی اکیڈیمی سے انعام بھی مل چکا ہے ۱۲

دیا شروع کئے اودھ پنچ بھی اپنی خوبیوں کے ساتھ مقبول عام ہو رہا تھا سرشار نے اس میں بھی مضامین بھیجنا شروع کئے ان کے طرز اسلوب نے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا مضمون لکھنے کے علاوہ سرشار کو ترجمہ پر بھی بڑا عبور تھا چنانچہ سررشتۂ تعلیم کی طرف سے ایک رسالہ نکلا کرتا تھا اس میں اخلاقی اور علمی مضامین شائع ہوتے تھے مختلف لوگوں کے مضامین ہوتے تھے مگر سب سے زیادہ دلچسپی سرشار کے ترجمہ میں ہوتی تھی یہ بجا نہ ہوگا اگر اسی سلسلے میں یہ ذکر بھی کر دیا جائے کہ علم طبعی کی ایک کتاب کا ترجمہ انھوں نے اردو میں کیا۔ گو مضمون نہایت مشکل تھا اور اصطلاحات خاص طور پر ترجمہ کے لئے مشکل تھیں۔ مگر سرشار نے اس کتاب کو اس خوبی سے اردو کا جامہ پہنایا کہ معلوم ہوتا ہے کہ ترجمہ نہیں ہے بلکہ تصنیف ہے سرشار نے اس کتاب کا نام شمس الصحی رکھا اب سرشار کی شہرت روز افزوں ترقی کے ساتھ ملک میں پھیلنے لگی یہاں تک کہ منشی نول کشور نے ان کو اودھ اخبار کی ایڈیٹری کے لئے منتخب کیا۔

سرشار کی ایڈیٹری کی وجہ سے اودھ اخبار کو جو عروج نصیب ہوا وہ اس کے لئے معراج کمال تھا۔ سرشار نے "فسانہ آزاد" کی بنیاد اسی اخبار سے شروع کی جو اردو ناول نویسی کے فن میں ایک خاص امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ ابتدا میں "فسانہ آزاد" حصہ حصہ مضامین کی صورت میں نکلتا رہا سال بھر کے بعد کتاب کی صورت میں شائع کیا گیا۔ زبان کی خوبی اور زبان کی لطافت نے پہلے ہی سے لوگوں کو ایسا گرویدہ بنا لیا تھا شائع ہوتے ہی ہاتھوں ہاتھ بک گیا

یوں تو سرشار کی تصنیفات کئی ایک ہیں لیکن جس کتاب نے انھیں بقائے دوام کی خلعت سے سرفراز کیا وہ فسانہ آزاد ہے اس کتاب میں لکھنؤ کی مٹتی ہوئی تہذیب اور گری ہوئی حالت کو دکھا کر اصلاح کی کوشش کی ہے یہ کتاب اردو میں ناول نویسی کے لحاظ سے بہت قابل قدر ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ

فسانۂ آزاد اردو ناول نویسی کا سنگِ بنیاد ہے لیکن ہمارے نزدیک ناول کی ابتدا مولانا نذیر احمد کے ہاتھوں ہو چکی تھی جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا ہے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سرشار نے لوگوں کا رجحان دیکھ کر عین وقت پر ناول نویسی کو اور زیادہ فروغ دیا۔ پرانا طریقہ بعید از کار باتوں اور اشخاص کو چھوڑ کر روزمرہ کے واقعات اور ایسے اشخاص کو لیا جو آئے دن ہمیں نظر آتے ہیں

فسانۂ آزاد کے علاوہ سرشار کی چند اور کتابیں بہت مشہور ہیں مثلاً سیرِ کوہسار، کامنی، پی کہاں۔

بیان میں شگفتگی، زبان میں پاکیزگی۔ طرز ادا میں سلاست، آمد میں جوش، محاورہ میں صفائی، روزمرہ میں لطافت، لکھنؤ کی مٹتی ہوئی حالت تہذیب، طرز معاشرت، زبان، سلیقہ، علوم، شرافت، سوسائٹی کی پوری کیفیت کا نقشہ ان کی تحریر میں اس طرح پایا جاتا ہے جیسے آئینے کے اندر تصویر۔ عیوب کو بھی ایسے طریقہ پر بیان کرتے ہیں کہ سچی تصویر پیشِ نظر ہو جاتی ہے اور برا بھی نہیں معلوم ہوتا۔ مصوری میں مصور کی آنکھ اور شاعر کے دماغ سے کام لیتے ہیں۔ زبان شستہ اور پاکیزہ ہے اللہ علی سک کی جا بجا کمی ہے۔ سرشار کی طبیعت میں اس قدر تبحر تھا کہ جب وہ اصلاح چاہتے ہیں تو ناکامیاب نظر آتے ہیں۔ ان کے طلالی ناولوں میں عام طور سے پلاٹ غیر مربوط ہوتا ہے۔ کردار نگاری میں بھی ان کا قلم ایک سا نہیں چلتا کبھی کسی کردار کی خصوصیت یک رنگی کے ساتھ قائم نہیں رہتی۔ اللہ مکالمے میں ان کو ہر انتہا پر ناریز قیت ہے لول چال میں وہ ایسے ناول کے گوشہ گوشہ کو روشن کر دیتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ موضوع طریقے کا کیر کٹر ہوتا ہے۔ ویسے ہی الفاظ اس کے اظہار خیالات کے لئے لاتے ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں کبھی کبھی سوقیانہ الفاظ بھی استعمال کر جاتے ہیں۔

سرشار کی شہرت ملک میں چاروں طرف پھیل گئی تھی چنانچہ ۱۸۹۵ء میں وہ حیدرآباد تشریف لے گئے جہاں ان کا استقبال بہت گرمجوشی کے ساتھ ہوا۔ لیکن حیدرآباد جانے سے پہلے کچھ دنوں الہ آباد میں بھی قیام رہا جہاں ایکسٹرا میں مترجم بھی ہو گئے تھے۔ حیدرآباد میں مہاراجہ کشن پرشاد نے ایسا کلام اصلاح کے لئے سرشار کو دکھانا شروع کیا جس کے عوض میں دو سو روپے ماہوار ملتے تھے۔ سرشار کچھ عرصے تک حیدرآباد میں دمدمۂ آصفیہ بھی نکالتے رہے افسوس ہے کہ مے نوشی نے اتنے قابل قدر دماغ کو قبل از وقت خراب کر دیا۔ اور ۱۹۰۲ء میں سرشار نے حیدرآباد ہی میں انتقال کیا۔

## شرر

ولادت لکھنؤ میں ۱۸۶۶ء میں ہوئی والدین کا خیال ہوا کہ ابتدائی تعلیم یہیں ہو جائے تو اچھا ہے لیکن مکتب میں تین سال گزر گئے ایک سپارہ سے آگے نہ بڑھ سکے ان کے والد حکیم تفضل حسین نے ان کو کلکتہ منتقل کر لیا یہاں حکیم صاحب واجد علی شاہ کی ملازمت میں تھے۔ اہل علم کا بھی اچھا مجمع تھا چنانچہ شرر کی علمی تربیت یہیں ہوئی۔ عربی فارسی کی کافی قابلیت حاصل کر لی ۱۸۸۷ء میں شرر کو پھر لکھنؤ واپس آنا پڑا۔

لکھنؤ آکر شرر نے ایسا علمی مشغلہ برابر جاری رکھا۔ مختلف اہل کمال سے علم حاصل کرتے رہے ۱۸۷۹ء میں حصول تعلیم کے لئے دہلی گئے۔ راستے میں سرسید سے بھی ملاقات ہوئی دہلی پہونچ کر شرر نے نہ صرف تعلیم ہی حاصل کی بلکہ تصنیف اور تالیف کا سلسلہ شروع کر دیا محمد عبدالوہاب سحری کا رسالہ توحید ترجمہ کر ڈالا

جس کے متعلق صاحب سیر المصنفین لکھتے ہیں کہ اس طریقے سے شرر نے تصنیف و تالیف کی دنیا میں پہلا قدم رکھا

دہلی سے پھر لکھنؤ واپس آئے ۱۸۸۱ء میں اودھ اخبار کی ملازمت کرلی جس میں برابر مضامین لکھتے رہے۔ شہرت میں روز افزوں ترقی ہوتی رہی ۱۸۸۶ء میں شرر نے اپنا خود ایک رسالہ جاری کیا جس کا نام دلگداز رکھا۔ کچھ دنوں کے بعد اس رسالے میں ناول کا بھی جزو شامل ہونے لگا چنانچہ ملک العزیز ورجنا جس انجلیسا، منصور موہنا شائع ہوتے رہے۔ لیکن مالی کشمکش کی وجہ سے اطمینان نصیب نہ تھا۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے حیدر آباد جانا پڑا۔ جہاں رہ کر انھوں نے اپنی تاریخ سندھ لکھنا شروع کی۔ نواب قار الامرا نے کافی قدر دانی کی اور اپنے بیٹے کے ساتھ ۱۸۹۳ء میں شرر کو انگلستان بھیج دیا۔ تین سال تک قیام رہا اور وہیں فراسیسی زبان حاصل کی واپس آکر حیدر آباد گئے اور دلگداز کو اس ماہ میں سے جاری کیا۔ یہاں اور کتابوں کے علاوہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی صاحبزادی حضرت سکینہ کی سوانح عمری لکھنا شروع کی۔ چونکہ ان کے حالات عام خیالات کے خلاف تھے اس لئے مسلمانوں میں برہمی پیدا ہوگئی نتیجہ یہ ہوا کہ شرر کو حیدر آباد سے نکلنا پڑا مگر حیدر آباد کا آنا جانا کچھ دنوں کے بعد پھر شروع ہوگیا لیکن مضامین موافق نہ تھی آخر ۱۹۰۹ء میں نظام کے حکم سے عزیز مرزا طفر علی خاں صوفی ان میں اور شرر چاروں آدمی سلطنت نظام سے ہمیشہ کے لئے باہر کردئے گئے۔ شرر کا انتقال ۱۹۲۶ء میں لکھنؤ میں ہوا۔

**شرر اور ناول نویسی**۔ شرر نے اسلامی تاریخ کی طرف زیادہ توجہ کی اور ناول نگاری کے فن کو اردو میں ترقی دینے کی کامیاب کوشش کی۔ کیرکٹر پلاٹ کو اردو سے زیادہ اچھا سنوارا انھوں نے اس فن میں متانت اور سنجیدگی تاثر کے اندازہ

اور ہر رہ گوئی سے ناول نگاری کو بچایا۔ اسلامی تاریخ عربی اور فارسی میں ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کو بھولی جاتی تھی۔ ستیہ نے اپنے ناولوں کی وجہ سے پھر دیا کے سامنے زندہ کر کے پیش کیا جس کی وجہ سے اسلاف کے کارنامے نظروں کے سامنے آگئے دلوں میں ایک جوش پیدا ہو گیا یہی نہیں بلکہ انھوں نے بوس عقیدت کے ساتھ خاص خاص اسلامی مقام اور اشخاص کو نہایت بلند کر کے دکھایا جس کی وجہ سے ان کا نام اردو کے اور ناول نگاروں سے زیادہ بلند نظر آتا ہے

ان کا طرز بیان شگفتہ اور رواں ہے۔ مگر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ بے سلک بھی ہے تخیل میں بھی گہرائی کم ہے۔ اگر ان کے اشخاص قصہ پر نظر ڈالیے تو حکیم محمد علی جان کی طرح ان کا ہر ناول ایک مختلف المزاج اور اصلی کردار ہمارے پیش کرتا لیکن ہر ایک کردار میں یکسانیت ہوتی ہے ملک العزیز اور منصور میں بہت کم فرق ہے اسی طرح ورجینا اور موہنا میں بھی نام ہی کا فرق نظر آتا ہے۔ منظر نگاری میں ان کا قلم منصور رنگ آمیزی صرف کرتا ہے لیکن شاعرانہ تشبیہات اور استعارے کی بھرمار سے تاثیر میں کمی پیدا ہو جاتی ہے۔

باوجود ان تمام باتوں کے دلچسپی اور دلکشی کی بنا پر جو یہ اردو ناول نویسی میں ستیہ کو حاصل ہے وہ کسی اور کو نصیب نہیں ان کے بعض مشہور ناول مثلاً رودبار ریں ملک العزیز ورجینا ملوراملور بڑا جس کا ڈاکو اتنے دلچسپ ہیں کہ شروع سے آخر تک ملاحظہ کئے ہوئے کتاب ہاتھ سے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔

ناولوں کے علاوہ ستیہ نے کثرت سے مختلف موضوعات پر متعدد مضامین لکھے ہیں جو مختلف مجموعوں کی صورت میں چھپ گئے ہیں ان کے دیکھنے سے ستیہ کی معلومات کی قدر ہوتی ہے اور سوچنا پڑتا ہے کہ ایسے ادیب اس زمانے میں کیوں نہیں پیدا ہوتے

# سجاد حسین

ایک[1] خوشحال اور عالی خاندان سے تھے۔ سجاد حسین کے والد منشی منصور علی عہدہ ڈپٹی کلکٹری پر مامور تھے اور بعد پنشن کے ایک عرصہ تک حیدرآباد میں سول جج رہے سجاد حسین ۱۸۵۶ء میں مقام کاکوری پیدا ہوئے ۱۸۷۳ء میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا اور کچھ دنوں تک کیننگ کالج لکھنؤ میں ایف اے کی تعلیم بھی پائی لیکن طبیعت انگریزی سے ہٹ گئی اور ایف اے کے امتحان میں شریک نہ ہوئے کالج چھوڑ کر تلاش معاش میں میص آباد پہنچے اور وہاں فوج میں اردو پڑھانے پر مستی مقرر ہوئے لیکن طبیعت کو اس شغل سے کیا مناسبت ہو سکتی تھی سال بھر کے اندر ہی اس کو خیرباد کہہ کر اودھ پنچ کے شائع کرنے کا ارادہ کیا ۱۸۷۷ء میں اودھ پنچ کی ساری ٹیم منشی صاحب نے اودھ پنچ کے لئے پہلے ہی سال میں ایسے ایسے سحر البیان جادو قلم نامہ نگار ڈھونڈ نکالے جو اردو علم و ادب کے آسمان پر چاند سورج ہو کر چمکے ان میں سے پنڈت رتن ناتھ سرشار مرزا مچھو بیگ ستم ظریف نواب سید محمد جان آزاد۔ سید اکبر حسین اکبر منشی احمد علی شوق۔ منشی حوالا پرشاد رتن منشی احمد علی کسمنڈوی کے نام نامی خاص طور سے قابل ذکر ہیں پنڈت رتن ناتھ سرشار اس دو سال تک اپنے قلم سے اودھ پنچ کو سرفراز کرتے رہے

سجاد حسین ۱۸۸۷ء میں کانگریس میں شریک ہوئے اور مرتے دم تک اس کے حامی رہے ۱۹۱۰ء میں پہلی مرتبہ فالج گرا لیکن چند ماہ بعد وہ کر اچھے ہو گئے ۱۹۱۴ء میں فالج کا دوسرا دورہ ہوا اور ۲۲ جنوری ۱۹۱۵ء کو انتقال ہو گیا منشی سجاد حسین اردو اخبار نویسی میں طرز مذاق و ظرافت کے موجد لکھنؤ کی

---

[1] ماخوذ از گلدستۂ پنچ

زباں میں اپنے رنگ کے اُستاد تھے۔ اودھ پنچ کے ذریعے سے جو خدمات اردو لٹریچر کی آپ نے کیں اور جو قابلِ قدر اضافہ اس زباں میں ان کی کوششوں کی بدولت ہوا اس قابل نہیں کہ آسانی سے بھلا دیا جائے۔ آپ کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ آپ نے اپنا دامن تہمت، مذہبی تعصب سے خواہ پالیٹکس ہو یا لٹریچر ہمیشہ پاک صاف رکھا اور آزادی و ایمانداری کو کبھی بھولے سے بھی ہاتھ سے نہ جانے دیا۔

ان کی تحریر میں سب سے پہلی چیز جو نمایاں طور پر نظر آتی ہے وہ بے باکی اور آزادیٔ خیال ہے۔ جو کچھ کہا ہوتا ہے نہایت کھلے لفظوں میں بے رو رعایت بیان کر جاتے ہیں۔ ایسا مفہوم واضح کرنے کے لئے کبھی کبھی عامیانہ لفظ استعمال کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ وہ ہر جگہ کوشش کرتے ہیں کہ روزمرہ اور بول چال کا لطف قائم رہ جائے۔ عبارت میں کبھی کبھی مولویانہ انداز بھی پایا جاتا ہے جس کی وجہ سے باوجود ان کی شگفتہ مزاجی کے بھی کسی قدر خشکی پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر طبیعت کی شوخی اور مذاق سخن کی لہر کلام میں عموماً نمایاں رہتی ہے جو مشکل سے اس عیب کو اُبھرنے دیتی ہے۔

مستی سجاد حسین کا ایک خاص جوہر تشبیہ۔ استعارے کے صرف میں نظر آتا ہے اپنی جدت پسند طبیعت سے وہ موقع دیکھ کر نہایت ظرافت آمیز طریقے پر تشبیہ اور استعارے کام میں لاتے ہیں جس سے دلچسپی میں خاطر خواہ اضافہ ہو جاتا ہے اور ان کی ندرت پسندی کا اندازہ کرنے کا ہم کو کافی موقع ملتا ہے۔ اور غالباً ایسے مقامات پر ان کا التہاب طبع مذاق لطیف کی بہترین کارگذاری دکھا سکتا ہے

جس طرح دوق شاعری میں ضرب المثل کے استعمال کرنے میں ضرب المثل ہیں اسی طرح مستی سجاد حسین نثر کے میدان میں ضرب الامثال سے اپنی عبارت کو سجانے میں مشہور ہیں۔ وہ تمثیلات کے برمحل صرف سے معنویت میں بہت کچھ

اضافہ کر لیتے ہیں۔

منشی سجاد حسین نے نہایت قابلیت کے ساتھ اردو ناول نویسی کے نقائص دُور کرنے کی کوشش کی مثلاً اُن سے پہلے اردو کی ناولیں طوائف کی حیاتی سے محروم رکھی جاتی تھیں۔ انھوں نے اس کمی کو نہایت خوبی سے پورا کرنے کی کوشش کی کردار نگاری میں ارتقا بھی اردو ناولوں میں بہت کم نظر آتا تھا انھوں نے اس عیب کو بھی دُور کرنے کی ایک حد تک کامیاب کوشش کی۔ علاوہ اور ناولوں کے ان کا ناول "حاجی بغلول" ایک ایسا کارنامہ ہے جس پر وہ بجا طور پر ناز کر سکتے تھے "حاجی بغلول" ایسا کردار ہے جو سرشار کے سانہ آزاد کی طرح نہایت ہر دلعزیز اور ہمیشہ زندہ رہے۔ الا معلوم ہوتا ہے

# رُسوا

مرزا محمد ہادی نام اور رُسوا تخلص تھا آغا محمد تقی کے بیٹے تھے۔ ان کے اسلاف ماتندران سے دلی آئے اور وہاں سے اودھ میں سکونت اختیار کی۔ ان کی ولادت لکھنؤ میں ۱۸۵۸ء میں ہوئی بچپن میں لاڈ پیار سے پرورش پائی لیکن سولہ برس کی عمر میں والدین کا سایہ ایک ہی سال میں سر سے اُٹھ گیا۔ رشتہ کے ایک ماموں نے ان کی پرورش کی جس کی لالچ پسند طبیعت نے یتیم بھانجے کے ترکہ پر بھی محالفانہ قبضہ جائز سمجھا۔

مرزا کو اپنے والدین سے ترکہ میں علم ریاضی اور نجوم کا شوق ملا تھا جس کی تکمیل انھوں نے آگے چل کر کی۔ فارسی کی تمام درسیات، ریاضی اور اقلیدس جیسا نجوم کے رسائل اپنے والد سے پڑھے پھر مولویوں سے عربی پڑھی بعد میں انگریزی

پڑھنا شروع کیا اور انٹرنس کا پرائیویٹ امتحان پاس کیا پھر رڑکی سے اوورسیری کا امتحان پاس کیا اور کوئٹہ اور بلوچستان کے ریلوے میں ملازم ہو گئے اس علم دوست طبیعت کو ریل کی پٹریوں سے کیا مناسبت، ایک دن اتفاق سے کمسٹری کا ایک عربی رسالہ مل گیا۔ اس کو پڑھتے ہی اس مضمون سے کچھ ایسی محبت پیدا ہو گئی کہ فوراً نوکری سے استعفیٰ دیدیا۔ کوٹھی کا تمام سامان نیلام کر کے اس سے کمسٹری کے آلات ولایت سے منگوا کر بیدھے لکھنؤ چلے آئے دنیا میں علم کے ایسے دلدادہ مشکل سے ملیں گے

علم کے اسی شوق نے ان کی طبیعت کو ہر شے سے بے پروا کر دیا تھا نہ کسی کی مدح گرا دی، نہ روپیہ کی ہوس نہ حاسد متن اسکول میں فارسی کے مدرس ہو گئے تھے اور وہ بھی اس لئے کہ بجاب یونیورسٹی سے منشی عالم کا امتحان پاس کر چکے تھے لیکن کیمیا سازی کے مصارف کے لئے یہ تنخواہ کیونکر کافی ہو سکتی تھی آخر ایک لوہار کے لڑکے کو پڑھانے پر اس شرط سے ٹیوشن کیا کہ کام شروع ہونے کے بعد بھٹی بند ہونے پر مرزا صاحب کے تصرف میں رہے۔

مرزا صاحب نے اعلیٰ تعلیم کے درجے بھی گھر بیٹھے طے کر لئے پہلے پنجاب یونیورسٹی سے بی اے کا پرائیویٹ امتحان دیا۔ پھر امریکہ کی اورنٹیل یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی حاصل کی۔

ان کو علم کا جس قدر شوق تھا طبیعت میں اسی قدر قبول عام کی صلاحیت موجود تھی عربی، عبرانی، یونانی، انگریزی، فارسی، ہندی، سنسکرت زبانوں پر اچھا خاصا عبور تھا۔ مشرقی و مغربی علوم پر حاوی تھے منطق و فلسفہ ریاضی اور مہندسی کے ماہر تھے

مرزا ایک ایسی عیور طبیعت کے مالک تھے جو ورق دروری کے لئے بھی کسی کے سامنے دست سوال پھیلانا گوارا نہ کرتے نہ کسی سے مدد کے طالب ہوتے تھے

نہ عمر بھر کسی کے سر منت احسان ہوئے اسی لئے طبیعت میں استقلال اور خاکستی کی عادات پیدا ہو گئی تھیں انھیں اپنے کام سے کام تھا نہ دنیا اور سامان دنیا سے تعلق نہ زینت و آرائش سے مطلب ان کے بیٹھنے کے کمرے میں ایک چٹائی بچھی رہتی کونے میں کتابوں کا ڈھیر لگا رہتا وہ بھی بے ترتیب کاغذات بکھرے رہتے کہیں پڑا رہتا اور توشک کہیں ایک انگیٹھی رکھی رہتی اور حقہ یہیں اہل دنیا سے بے نیاز مرزا مشاغل علمی میں مصروف رہتے رسوا کا انتقال ۲۱ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو ہوا۔

اگرچہ رسوا شاعر بھی تھے اور ادیب بھی لیکن ان کے منظوم کلام کا شیرازہ ایسا پریشاں ہوا کہ آج ان کی قدر زیادہ تر حیثیت ایک نثر نگار کے ہے حالانکہ مرزا کی شاعری میں بھی وہی سلاست، ندرت اور زبان کا لطف موجود ہے جس کی جھلک ان کی نثر نگاری میں پائی جاتی ہے یہاں وہ بحیثیت ایک نثر نگار کے پیش کئے جاتے ہیں

رسوا کی کامیابی کا راز زیادہ تر ان کی تیس سالہ میں مضمر ہے عبارت کا عام انداز رقم کچھ ایسا ہے کہ تحریر میں بات چیت کا لطف پیدا ہو جاتا ہے پھر لکھنؤ کی ستھری زبان اور وہاں کے مخصوص روزمرہ پر جو قدرت مرزا رسوا کو حاصل تھی وہ آپ اپنی مثال ہے ان کے سادہ طرز تحریر میں وہی دلکشی ہے جو آزاد کے پُرلطف انداز بیان میں لیکن مرزا کے کلام کی خاص خصوصیت اسلوب بیان کی نرمی ہے جو ہر موقعہ کی مناسبت سے کہیں لطف و شیرینی تو کہیں طنزیہ و مزاحیہ ہو کر ایسا کام کر جاتی ہے۔ ان کے طرز تحریر میں کچھ ایسی روانی، شگفتگی اور لوچ ہے کہ ایک خاص مزہ پیدا ہو جاتا ہے زبان کی یہی گھلاوٹ دلوں میں نغمہ سا کر اتر جاتی ہے

مرزا کے مطبوعہ کلام میں زیادہ تر ناولیں ہی ملتی ہیں انھیں میں زور طبع اور زور قلم صرف کیا ہے جو اخلاقی، معاشرتی اور رسمی حیثیت سے قابل قدر ہیں مرزا نے نہ صرف ناول نویسی کو ترقی دی بلکہ اصول فن سے بھی لوگوں کو آگاہ کر دیا۔

اس وقت تک اردو کے ناول نگاروں میں شرر، حکیم محمد علی اور سرشار ہی خاص طور سے مشہور تھے۔ رسوا نے ناول نویسی کو اس قدر ابھارا کہ اپنے ناولوں کو ایسے زمانہ کا مرقع بنا دیا۔ رسوا کا منشا گویا افسانہ نویسی سے نظام معاشرت کی فراہمی تھا جہاں اصلیت کو مدنظر رکھنا فرض تھا۔ وہ اصل حقیقت سے دور ہو جانا ایک غلطی خیال کرتے تھے اور فطرت کی پابندی اس لئے ضروری سمجھتے کہ ان سے بہتر مثالیں ہم کو نہیں مل سکتیں۔ مرزا نے اپنے ناولوں کے متعلق "ذات شریف" کے خاتمہ پر خود لکھا ہے

"ہمارے ناول نہ ٹریجڈی ہیں نہ کامیڈی نہ ہمارے ہیرو تلوار سے قتل ہوتے ہیں اور نہ ان میں سے کسی نے خودکشی کی ہے نہ ہجر ہوا ہے نہ وصل۔ ہمارے ناولوں کو موجودہ زمانے کی تاریخ سمجھنا چاہیئے"

مرزا کے ناولوں کی خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

۱۔ ان کے اکثر ناولوں کا موقع واردات خود ان کا وطن لکھنؤ ہے کیونکہ وہ تخیل کی وسعت سے کام لے کر خیالی شہروں کے نقشے بیٹھ کر نا اصلیت اور حقیقت کے منافی خیال کرتے تھے۔ پیرا گلے پچھلے واقعات میں غلط سحت کر کے ایک نئی چیز پیدا کر دینا جو نہ اس زمانہ کے مطابق ہو، نہ اس زمانہ کے موافق، مرزا کے نزدیک اصول فن کے خلاف تھا

۲۔ ان کے کردار افسانہ در اصل لکھنؤ یا قرب و جوار کے لوگ ہیں یہاں بھی وہی اصول پیش نظر ہے کہ حقیقت سے بعد نہ ہونے پائے یہاں تک کہ وہ ایسا ذاتی کردار، ایسی برائیاں اور اچھائیاں بیان کرنے میں دریغ نہیں کرتے۔

۳۔ مرزا ایسے پلاٹ اکثر زمرہ کی زندگی سے لیتے ہیں جہاں بے بنیاد باتوں کو دخل نہیں۔ اور پھر واقعات کو اس طرح بیان کرتے کہ اصل مقصد بھی حاصل

ہو جائے اور ناول کی دلچسپی بھی قائم رہے۔

۴۔ مرزا رسوا کو فطرتِ انسانی کے گہرے مطالعہ نے ایک ماہرِ فن بنا دیا تھا۔ ایک طرف اصولِ نفسیات سے دلچسپی دوسری جانب روزمرہ کے واقعات کو کسی صحیح روشنی میں دیکھنا ایسی خوبیاں تھیں کہ مرزا کے ناول کو زندگی کے اتفاقات، عروج و زوال، برائی اور بھلائی کا آئینہ بنا دیا۔

۵ مرزا رسوا نے اپنے ہر ناول میں مختلف واقعات کی فراہمی کی ہے نادر شاہی کی زندگی سے لے کر ادنیٰ طوائف کی زندگی کے صحیح نقشے پیش کئے ہیں ایک طرف ان کے یہاں علمی مشاعروں کے مرقعے ہیں تو دوسری طرف میلے ٹھیلے کے حالات، نواب زادوں کی حماقتیں اور اہلِ دربار کی چالاکیاں۔

۶ مرزا رسوا نے اکثر بیرونی مناظر کو بھی اپنے ناولوں میں جگہ دی ہے وہ ہر جگہ کی صحیح تصویر پیش کرتے ہیں اور اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ان جذبات سے جو خود اس ناول میں مرزا نے محسوس کئے تھے پڑھنے والے بھی پوری طرح لطف اندوز ہو سکیں۔

ان ناولوں کے علاوہ مرزا کی نثر کے وہ دیباچے خاص طور سے قابلِ قدر ہیں جو انھوں نے کسی علمی کارنامے کی وضاحت کے لئے لکھ دئے ہیں ان تحریروں سے وسیع النظری اور اصلاحِ فن کی کوششیں ظاہر ہوتی ہیں۔

ان کے ناولوں کو دیکھ کر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ جن چیزوں نے مرزا رسوا کی عظمت میں اضافہ کیا اور ان کی تصانیف میں لطف پیدا کیا ہے وہ دراصل دو چیزیں تھیں

۱۔ حیاتِ انسانی کا صحیح مطالعہ

۲ اور مرزا کا مخصوص طرزِ تحریر

# راشد الخیری

ظفر علی خاں راشد الخیری کی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ "ہم میں سے کسی شخص کے اٹھ جانے سے جو جگہ خالی ہو جاتی ہے وہ اکثر خالی ہی رہتی ہے لیکن یہ کلیہ کم از کم مصنف مرآۃ العروس کی جانشینی کے متعلق مولانا راشد الخیری کے گلریز قلم نے متعدد لطیف و یا کثیرہ تصانیف کے سلسلے سے باطل کر دیا" ڈاکٹر مدیر احمد کی طرح راشد الخیری بھی عورتوں کی اصلاح و ترقی کے حامی ہیں ان کے تمام افسانے اور ناول دیکھنے کے بعد یہی معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے صنفِ نازک کی تمام کمزوریوں اور خوبیوں کا مطالعہ نہایت دلچسپی سے کیا اور اسی کو اپنی تحریر کا موضوع بنا لیا وہ نہایت ہمدردی اور دلسوزی کے ساتھ رسم و رواج پر تنقید کرتے ہیں اور ان کی تمام رائیوں کو ایک مؤثر پیرائے میں طشت از بام کر کے اس سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں۔ مغربی تہذیب کی کورانہ تقلید سے روکنے کے لئے وہ ایسے بہت سے کردار کو خرابیوں میں مبتلا دکھا کر تباہ و ہلاک کر دیتے ہیں اس طرح ایک عبرت انگیز نقشہ نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے جس کو دیکھ کر طبیعت عرصہ تک مطمئن نہیں رہتی۔

وہ ایک بڑی حد تک قدامت پسند واقع ہوئے تھے اور نئی روشنی کی تعلیم و تربیت کو ایک فریب سمجھ کر نہایت بے دردی سے اس کا انکشاف کرتے تھے وہ تعلیم نسواں کے حامی تھے لیکن تربیت کو عورت کی زندگی کا زیور سمجھتے تھے ان کے افسانوں کے کردار کی زندگی ہماری روزانہ زندگی سے ملتی جلتی ہوئی ہے اسی لئے ان کا عروج و زوال ہمارے لئے کافی اثر رکھتا ہے

ایک افسانہ نگار سے زیادہ ان کی وقعت ہماری نظروں میں ایک مصلح کی حیثیت سے ہے عورت کی زندگی کی ہر منزل ایک خار دار راستہ سے ہو کر ملتی ہے انھوں نے

مختلف عنوانات سے یہ بیان کرنے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح اس کی، مدگی کامیاب ہو سکتی ہے اسی سلسلے میں انھوں نے بچوں کی فطرت کا مطالعہ بھی کیا ہے اور نہایت کامیابی کے ساتھ ان کی ذہنی نشو و نما کا اندازہ کر کے قصہ کو غیر فطری ہونے سے بچا لیا ہے انھوں نے جو تاریخی افسانے اور قصے لکھے ہیں ان کا مقصد بھی اصلاح کے سوا کچھ نہیں ہے

چونکہ ان کے پیش نظر اصلاح کا مقصد رہتا ہے اور عورتیں خاص طور پر اس پیغام کی مخاطب ہوتی ہیں۔ وہ نہایت آسان اور غیر مبہم طرز تحریر اختیار کرتے ہیں مختصر جملوں سے بیان کو نہایت دلآویز بنا دیتے ہیں اور اثر پیدا کرنے کے لئے کبھی کبھی مقفیٰ عبارت بھی لکھ جاتے ہیں ان کے یہاں مزاح لطیف اور شوخ نگاری کی بہت کمی ہے لیکن اس کی تلافی ان کے دلکش مکالموں سے ہو جاتی ہے ان کی تحریر میں دلی کی زبان کا پورا لطف حاصل ہو جاتا ہے فسوانی محاورات کے استعمال سے رنگینی پیدا کر دیا ان کے لئے کوئی بات نہیں لیکن کبھی کبھی ان کی زیادتی الجھن کا باعث ہو جاتی ہے

راشد الخیری فطری طور پر حزن و ملال کے دلدادہ تھے ان کا ہر افسانہ بیکسی کا مرقع اور یاس کی تصویر ہے موت اور ہلاکت کے مناظر، بیماری اور تکالیف کے نقشے یوں پیش کرتے ہیں کہ پڑھنے والا (باوجود اس احساس کے کہ صرف قصہ ہے) بے چین ہو جاتا ہے غم و الم کی شدت جس کو بیان کرتے ہوئے زبان رکتی ہے ان کے قلم سے نہایت تفصیل کے ساتھ بیان ہو جاتی ہے اسی رجحان کی وجہ سے راشد الخیری کے نام کے ساتھ "مصور غم" کا لقب بہت زیب دیتا ہے

وہ اردو کے ان چند خوش قسمت مصنفوں میں تھے کہ جن کی کتابیں کثیر التعداد ہونے کے ساتھ ہی قبول عام کی سند حاصل کر چکی ہیں، بار بار چھپتی ہیں اور بک جاتی

ہیں آپ کی تصانیف کی تعداد تیس سے کم نہیں جن میں سے چند مشہور یہ ہیں سمرنا کا چاند، صبح زندگی، شام زندگی، شب زندگی، ماہ عجم، محبوبہ خدا وند وغیرہ

طبقۂ نسواں کی اصلاح اور بہبودی آپ نے ساری عمر مدنظر رکھی۔ اور اسی مقصد کے پیش نظر آپ نے "عصمت" اور "بنات" دو ماہانہ رسالے بھی جاری کئے۔ ۱۹۳۶ء میں ان کے انتقال کے بعد بھی "عصمت" برابر کامیابی سے چل رہا ہے۔

اردو میں ناول نویسی کا سلسلہ برابر بڑھتا رہا متعدد اہل قلم نے ناولیں لکھیں چند مخصوص حضرات جو اس صنف میں نمایاں شہرت حاصل کر سکے ہیں وہ عصمت چغتائی، فیاض علی، رشید اختر ندوی، نسیم رامپوری، رئیس احمد جعفری، عادل رشید، محبوب نظری وغیرہ ہیں ان سب کی تصانیف سیکڑوں کی تعداد تک پہنچتی ہیں لیکن فنی لحاظ سے جو اقتدار پریم چند، کرشن چندر، عزیز احمد، عصمت چغتائی کو حاصل ہے، وہ کسی کو کم نصیب ہوا ان میں سے بعض حضرات کا تذکرہ چونکہ دوسرے عنوانات میں آچکا ہے اس لئے یہاں زیادہ لکھنا بیکار ہے مثلاً پریم چند کا ذکر مختصر افسانہ کے ذیل میں رہے گا ہاں پریم چند کی ناول نویسی کے سلسلے میں اتنا ضرور عرض کرنا ہے کہ انھوں نے فن پر زیادہ زور دیا۔ اردو ناولوں کو اصول فن سے آگاہ کرنے کی فکر کی ان کی ابتدائی ناولوں میں پلاٹ کی خامیاں پائی جاتی ہیں لیکن رفتہ رفتہ یہ خرابی دور ہو گئی اور ان کا آخری ناول "گئودان" فن کا بہترین نمونہ ثابت ہوا

# ۷

# مختصر افسانہ

قریب قریب دُنیا کی ہر زبان میں افسانوں کی ابتدا مافوق الفطرت عنصر سے ہوئی مصر و یونان، انگلستان سبھوں نے ابتدا میں مبالغہ آمیز قصوں سے قوم و ملک کے دلوں کو مسخر کرنے کی تدبیر کی ہندوستان والے بھی اس راستے سے الگ نہ چل سکے ان کے یہاں بھی مہابھارت میں اسی قسم کی باتیں آگئیں ناممکن تھا کہ اردو اس فضا سے الگ رہتی چنانچہ ابتدا میں یہاں بھی داستان امیر حمزہ، بوستان خیال، فسانہ عجائب وغیرہ ایسی کتابیں لکھی گئیں جن میں قصوں کی بنیاد زیادہ تر غیر فطری باتوں پر قائم ہوئی۔

اردو میں افسانوی ادب کا دوسرا دور غدر سے ذرا بعد میں شروع ہوا جس کی ابتدا میں فطری اور غیر فطری عنصر کو ایک جگہ خوبصورتی سے اکٹھا کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس لحاظ سے رتن ناتھ سرشار کا فسانۂ آزاد قابل دید کتاب ہے مگر رفتہ رفتہ غیر فطری عنصر کم ہوتا گیا یہاں تک کہ حقیقتوں کا خیال کر کے ناول لکھے جانے لگے ناول کا دور دورہ کم و بیش پچاس سال تک رہا۔ نذیر احمد

اور رتن ناتھ سرشار نے طبع زاد ناولوں کی ابتدا کی اور رتن ناتھ سے رسوا کے زمانہ تک آتے آتے ناول کی رفتار بڑھ کر دفعتاً کم ہو گئی۔ پریم چند اور فیاض علی کے علاوہ اور بھی کچھ لوگ عمدہ ناولیں اب تک اردو ادب میں پیش کر رہے تھے۔ درمیان میں ایک ایسا دور بھی آیا جس میں ناول نویسی کی اردو میں رفتار بہت سست ہو گئی اس کی جگہ مختصر افسانوں نے لے لی تھی۔ مگر اب ادھر حال میں پھر ناول کی رفتار بہت تیز ہو گئی ہے اچھے بڑے ناولوں کا ایک ذخیرہ ہو گیا ہے

ناول کی طرح مختصر افسانہ کے لئے بھی اردو ادب زیادہ تر انگریزی ادب کا رہین منت ہے گو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو کے قدیم افسانوں میں اور بوڑھی عورتوں کی ان کہانیوں میں جو بچوں کو سوتے وقت سنایا کرتی تھیں بعض اجزا ایسے بھی مل سکتے ہیں جو موجودہ افسانوں کی بنیاد قرار دیا سکیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ موجودہ مجموعی خصوصیات ان افسانوں میں اسی وقت پیدا ہو سکیں جب انگریزی ادب سے آبیاری کی گئی۔ اس سے بیشتر نہ تو کسی افسانے کے اجزا اور نہ کہانیاں خود مختصر افسانے کی صنف میں ملا ترمیم کے شمار کئے جانے کی مستحق تھیں۔ ان افسانوں کا سرچشمہ انگریزی ادب و تذوق کے ساتھ اس لئے بھی ٹھہرایا جا سکتا ہے کہ اردو میں پہلے انگریزی افسانوں کے ترجمے شائع ہوئے اور اب بھی ترجمے یا تلخیص کا محرک انگریزی ادب ہے اور اسی کی دیکھا دیکھی ترکی، روسی اور فرانسیسی زبانوں کے مختصر افسانے اردو میں آ گئے ہیں

اردو میں مختصر افسانوں کی عمر ابھی مشکل سے پچاس سال کی ہو گی مگر جو ہر لعبریری اور خوبیاں اس قلیل مدت میں اس نے حاصل کر لی ہیں وہ ہر طرح قابل ستائش ہیں جو کچھ خامیاں رہ گئی ہیں وہ بھی غالباً بہت جلد دور ہو جائیں گی اس لئے کہ عام افسانہ لکھنے والوں کا رجحان فن افسانہ نویسی کی طرف کافی ہو چلا ہے اس بات

میں ہم نے زیادہ تر مختصر افسانہ نویسوں ہی کو جگہ دی ہے

# پریم چند

جس طرح میر دبستانِ غزل میں اسی طرح پریم چند دبستانِ افسانہ میں ابھی تک یگانۂ روزگار سمجھے جاتے ہیں ان کے افسانوں کی ہر دلعزیزی کا دائرہ صرف اردو ہی کی دنیا تک محدود نہیں بلکہ ہندی والے بھی انہی عظمت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جتنی کہ اردو والے غالباً افسانہ لکھتے وقت پریم چند کہتے ہوں گے ع

ہاتھ چومیں گے مرے گرد مسلماں دونوں

پریم چند کے افسانوں کو پڑھتے ہوئے کبھی ایک لمحہ کے لئے یہ خیال نہیں ہوسکتا کہ ہم ان لوگوں کے حرکات و سکنات کا مطالعہ کر رہے ہیں جو ہم میں سے نہیں ہیں وہی روزمرہ کی زندگی وہی صبح و شام جس سے ہم کو روز دوچار ہونا پڑتا ہے، ان کے افسانوں کے دلچسپ مواد ہیں جس عام زندگی کو ہم جتنک اور اتنی سادی سمجھتے ہیں کہ دلکشی کا شاید کوئی عنصر نہ ہو اسی کو پریم چند اپنے اندازِ بیاں سے بغیر تصنع کے اتنی پرلطف ساکر افسانے میں دکھا دیتے ہیں کہ سرتاپا دلکش ہو جاتی ہے

ان کے افسانوں کا محور دیہات ہیں وہاں کے لوگوں کی سیدھی سادی زندگی سیرت، سچائی اور ایمانداری اور کبھی کبھی نقصوں کی بے ایمانی، چالاکی، فتنہ پردازی کا نقشہ پریم چند کے افسانوں کی جان و مال ہے دیہات والوں کی عام زندگی کا مرقع دیکھنا ہو تو ان افسانوں کو دیکھئے جس میں لوگوں کی سچائی کی تصویر صاف نظر آتی ہے۔ غریب کاشتکاروں کو کبھی پولیس، کبھی زمیندار، کبھی تحصیل کے عملے کبھی قحط سے ایسا سابقہ رہتا ہے کہ آرام سے بیٹھنا بھی نصیب نہیں۔ ان واقعات کو

ایسے دردناک پیرائے میں پریم چند نے بیان کیا ہے کہ پڑھ کر دل بھر آتا ہے پھر اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی دکھایا ہے کہ دیہاتیوں کی جہالت نے انھیں کس قدر پریشاں کر رکھا ہے۔ کہیں جہالت کا زور ہے کہیں توہم پرستی کا جس سے ان کی زندگی اور دوبھر ہو گئی ہے گو وہ لوگ باوجود ان باتوں کے اپنے پرانے خدا پر شاکر ہیں۔

ہر چیز کو جیسا وہ دیکھتے ہیں ویسا ہی اپنے الفاظ میں بیان کرنے کی کامیاب کوشش کرتے ہیں حقیقت و اصلیت۔ واقعات کی سادگی یا رنگینی میں پوشیدہ نہیں ہوتے باقی روئداد قصہ کو پریم چند اسی رو پر چلنے دیتے ہیں جو اس کی واقعیت صحیح طور پر طلب کرتی ہے ایسی طرف سے نہ تو پیچیدہ کر کے اسے دماغی کاوش کا جولانگاہ بناتے ہیں اور نہ کاٹ چھانٹ سے اس کو بے لطف ہونے دیتے ہیں بلکہ ایک ایسی حد کے اندر پلاٹ کو رکھتے ہیں کہ سادگی کی اصلیت کے ساتھ قصہ کی صداقت کا پورا لطف قائم رہے۔

پریم چند کے افسانے انسانی کردار کے روشن آئینے ہیں جس مزاج کا آدمی وہ اپنے افسانے میں لاتے ہیں اس کی افتاد طبیعت کا بالکل صحیح نقشہ رفتہ رفتہ آپ کے سامنے پیش کر دیتے ہیں معاشرتی امور پر موصوف کو زبردست عبور حاصل ہے۔ ان کے افسانوں میں عورت، مرد، بوڑھے، بچے، نیک نفس، بدکردار، عالم جاہل سب کو جگہ ملی ہے۔ لیکن ہر ایک کی امتیازی خصوصیت آئینہ دار بین نظر ہو جاتی ہے۔ اور اس امتیازی خصوصیت کو نمایاں کرنے کے لئے وہ ایسے الفاظ کو نہیں بلکہ واقعات کے تسلسل و فرار کو اس خوبی سے کام میں لاتے ہیں کہ پوری طرح اس جوہر کو نمایاں کر دے آرائشوں کی کسوٹی پر ہر کردار اتنا کسا جاتا ہے کہ اس کا اصلی رنگ صاف نظر آنے لگتا ہے اسی سلسلہ میں یہ بھی بیان کر دینا بیجا نہ ہوگا کہ عام طور پر وہ اپنے افسانے میں ان ہی لوگوں اور باتوں کا

ذکر کرتے ہیں جن کو کبھی انھوں نے دیکھا ہو۔

پریم چند کے افسانوں میں مکالمہ نہایت اہم داستان خصوصیت ہے یہ کبھی نہیں معلوم ہوتا ہے کہ ہم دو آدمیوں کی گفتگو کتاب میں پڑھ رہے ہیں بلکہ اسی ادا سے بیان سے یہ چیز پیش کی جاتی ہے کہ گویا ہم پس پردہ خود لوگوں کی بات چیت اپنے کان سے سن رہے ہیں اور باتوں ہی باتوں میں ہر ایک کا کردار بھی نمایاں ہوتا جاتا ہے واقعات بھی مختصر ہوتے جاتے ہیں اور جذبات کی تصویر بھی سامنے آتی جاتی ہے۔

ان کی زبان نہایت شائستہ اور رواں ہے سادگی اس کا جوہر ہے۔ یوں تو فارسی ہندی کے الفاظ عام طور سے وہ لاتے ہیں مگر ایسا مطلب نکالنے کے لئے بعض وقت ایسے ہی ہندی کے الفاظ استعمال کرجاتے ہیں جو اردو میں رائج نہیں لیکن اس خوبی سے کہ اجنبی اور نامانوس نہیں معلوم ہوتے۔

زبان کے لطف کو قائم رکھنے کے خیال میں انھوں نے عموماً دیہاتیوں کی بولی لکھنے سے احتراز کیا ہے کبھی کبھی تشبیہ و استعارے سے لطف اور زیادہ ہوجاتا ہے مگر جہاں کہیں مزاح کا پہلو پیدا ہوجاتا ہے وہاں شگفتگی بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے اور ایک لطیف ہنسی کا موقع مل جاتا ہے

پریم چند اپنے افسانوں میں ہندو سوسائٹی کے رسوم، جہالت، عقائد وغیرہ کا عموماً ذکر کیا کرتے ہیں چونکہ ان چیزوں سے فطری طور پر ان کو لگاؤ اور واقفیت ہے اس لئے نہایت تردد کے ساتھ ان کے متعلق رائے زنی کرتے ہیں علاوہ اور مقاصد کے پریم چند کا ایک مقصد ہندوؤں کی کھوئی ہوئی عظمت کا دوبارہ کرنا بھی ہے۔

وہ اپنے مختلف افسانوں میں ان کے اسلاف کے کارنامے بیان کرکے بتانا چاہتے ہیں کہ تم پہلے کیا تھے اور اب کیا ہوگئے راجپوتوں کی شجاعت کا آپ اکثر

دکھائیں گے۔ ایسے موقعوں پر بعض وقت حقیقت کے ساتھ تعریف بھی وہ اپنے افسانوں میں شامل کر دیتے ہیں اس طرح پر دلچسپی اور حسن ضرور زیادہ ہو جاتا ہے لیکن اس انداز میں تعریف حقیقت پر غالب نظر آتی ہے

اپنی زندگی کے آخری دور میں پریم چند کے خیالات اور اس کے ساتھ ان کے آرٹ میں ایک واضح تبدیلی نظر آتی ہے افسانوں میں حقیقت نگاری کا عنصر بڑھتا ہے۔ سماج کا مطالعہ زیادہ گہرا اور سنجیدہ ہو جاتا ہے۔ ادب کے ترقی پسند مسلک سے وہ اپنے کو وابستہ کر دیتے ہیں، ہندوستانی پن مسطر کو قائم رکھتے ہوئے ان کے افسانوں اور ناولوں میں ہمہ گیری بڑھ جاتی ہے۔ یہ تمام خصوصیات ان کے افسانوں "گئو دان" میں یہ ایک وقت مرکوز ہو گئی ہیں لہٰذا اس کو ہم پریم چند کا شاہکار کہہ سکتے ہیں اور غالباً اسی لئے یہ اتنا پسند کیا گیا کہ دنیا کے بہترین افسانوں میں شمار ہونے لگا ہے

پریم چند کا انتقال ۱۹۳۶ء میں ہوا۔ حالانکہ موت قبل از وقت تھی لیکن اتنی قلیل مدت میں انھوں نے اتنے اچھے اور زیادہ افسانے ناولیں دنیا کے سامنے پیش کر دئے ہیں کہ اردو ادب میں ان کا نام ہمیشہ باقی رہے گا

# سُدرشن

پنڈت مدری ناتھ سُدرشن اُردو کے ان چند کامیاب مختصر افسانہ نویسوں میں ہیں جو پریم چند کی طرح کامیابی کے ساتھ دنیائے افسانہ میں شہرت دوام حاصل کر رہے تھے۔ اپنے افسانوں کی دلکشی اور طرز بیان کی خوبی کی وجہ سے عرصہ ہوا وہ قبول عام کا شرف حاصل کر کے خاموش ہو گئے۔

سب سے پہلی چیز جو سدرشن کے افسانوں کو طلسم تاثیر سا دیتی ہے۔ وہ روداد قصہ ہے واقعات کو اس طرح ترتیب دیتے ہیں کہ ہر قدم پر اشتیاق بڑھتا جاتا ہے کہ اب اس کے بعد دیکھئے کیا ہوتا ہے اور یہ خصوصیت روداد کی پیچیدگی سے نہیں پیدا ہوتی بلکہ واقعہ یا ماجرا کا انتخاب اتنا دلچسپ ہوتا ہے کہ باوجود سادہ ہونے کے بھی دلوں پر ہر وقت ان کا قبضہ رہتا ہے

سُدرشن کے افسانوں کی دوسری نمایاں خوبی سادگی ہے۔ زباں میں بھی سادگی بیاں میں بھی سادگی اور خیال میں بھی سادگی۔ زباں کی سادگی کبھی خشکی کی وجہ سے بے کیف نہیں ہونے پاتی۔ بلکہ چھوٹے چھوٹے عام فہم الفاظ کو اس حسن سے ترتیب دیتے ہیں کہ نرمی اور اس کے ساتھ تاثیر عبارت میں خود بخود آجاتی ہے اسلوب بیان نہایت سیدھا اور سلیس ہے تشبیہات میں اللہ حات ہے خاص بات یہ ہے کہ تشبیہیں زیادہ تر ہندستانی ہوتی ہیں۔

جذبات کے اثر کو الفاظ میں پوری طرح بیان کر دینا سُدرشن کا ایک خاص کارنامہ ہے جس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو نفسیاتی امور سے خاص دلچسپی ہے غمناک واقعات یا مناظر کو معمولی الفاظ سے دردناک بنا دیتے ہیں شاید وہ کبھی بڑے اور ہیبتناک الفاظ ایسے موقع پر استعمال نہیں کرتے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ "ترحم جگر کے پار نہیں ہوتا بلکہ "ہم کس" ہو کر عرصۂ دراز تک دل میں چٹکیاں لیا کرتا ہے

سدرشن نے ایسے افسانوں کا سرچشمہ ایک ہی جگہ نہیں رکھا۔ وہ کبھی دیہات کی زندگی اور واقعات بیان کرتے ہیں تو کبھی شہر والوں کی حالت کا نقشہ پیش کرتے ہیں عموماً غریبوں اور دولتمندوں کی زندگی کا موازنہ ان کے افسانوں کا حاصل ہوتا ہے جہاں وہ دکھاتے ہیں کہ امیروں کو باوجود دولت کے قناعت و سکون نصیب

نہیں اور غریبوں کو افلاس کی حالت میں بھی طمانیت اور محبت کی لازوال دولت حاصل ہے۔

سدرشن کے افسانوں کی ایک اور نمایاں خصوصیت ان کی کردار نگاری ہے ان کے افسانوں کے اکثر کردار ہماری زندگی کے افراد سے بالکل مطابق ہیں خصوصاً اوسط درجے کی سوسائٹی کے لوگوں کے کرداروں کو وہ بے حد فطری انداز میں پیش کرتے ہیں ان میں جا بجا تبدیلیاں بھی نظر آتی ہیں لیکن پڑھنے والا یہ نہیں محسوس کرتا کہ یہ تبدیلی بغیر کسی خاص وجہ کے پیدا ہو گئی۔

# سجاد حیدر یلدرم

جن لوگوں نے کامیابی کے ساتھ اردو میں دوسری زبان کے افسانوں کو ترجمہ کر کے اس ادب کو گراں بہا بنانے کی کوشش کی ہے، ان کی فہرست میں سجاد حیدر کا نام زریں الفاظ سے لکھے جانے کے قابل ہے غالباً وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس سلسلے کی بنیاد ڈالنے کی کوشش کی ہے انھوں نے سب سے پہلے اردو میں ترکی افسانوں کا ترجمہ کرنا شروع کیا ترکی تخیل کو اردو کے پیرائے میں اس طرح منتقل کیا ہے کہ ترجمہ میں اصل کی شان آگئی ہے ترکی طرز معاشرت و جشن ادا کو اردو کی دنیا میں مانوس ہونے کے لئے آپ نے اکثر اردو کی ترکیبوں میں اجتہاد سے کام لیا ہے اور خوبی کی بات یہ ہے کہ بیشتر مقامات پر ان کی ایسی اتریدیہ کامیابی ہوتی ہے کہ اس خدمت کو اردو ادب میں ایک اضافہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا مگر کبھی کبھی ایسے لطیف جذبات کو بیان کرنے کے لئے ایسی ایسی ترکیبیں اور الفاظ استعمال کر جاتے ہیں جو سننے والے کو غیر مانوس معلوم ہوتے ہیں

ترکی ترجموں کی کثرت کا نتیجہ یہ ہوا کہ سجاد حیدر صاحب کے طبع زاد افسانوں میں بھی ترکی افسانوں کی رومانیت جا بجا نظر آنے لگی۔ آپ کے ترجموں میں وہ رنگینی اور ندرت ہوتی ہے کہ وہ بذاتِ خود ایک تصنیف کا مرتبہ حاصل کر لیتے ہیں پڑھنے والے کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہ ترجمہ ہے یا کسی کے ذاتی تخیل کا نتیجہ۔ ایک تو الفاظ کا انتخاب عمدہ اور پھر ان کو نہایت موزوں جگہ سے ترتیب دینا یہ موصوف کا وہ کرشمہ ہے جو ان کی نثر میں شاعری کا مزا پیدا کر دیتا ہے جہاں جہاں یہ خوبی پیدا ہو گئی ہے اُن کے افسانوں کو جنت نگاہ اور عبارت کو فردوس گوش بنا دیا ہے۔

سجاد حیدر کے طبع زاد افسانوں میں اکثر حیاتِ انسانی کی نفسیاتی تحلیل ہوتی ہے اور ان کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف کو حیات و جذباتِ انسانی کی نفسیاتی کتابوں میں خاص ملکہ ہے جس کو ان کی افسانہ نویسی کا ایک خاص جزو سمجھنا چاہیئے وہ اپنے افسانوں میں نفسیات کی ان خشک بحثوں میں نہیں پڑتے جو ایک فلاسفر کو دُنیا کا خشک ترین انسان بنا دیتا ہے سجاد حیدر کے یہاں کبھی فطرتِ انسانی کا مطالعہ اس لطف طرز پر ہوتا ہے کہ قلب میں ایک انبساطی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے تو کبھی کردار افسانہ سے وہ اٹکھیلیاں ہوتی ہیں کہ تبسم کی لہریں قہقہوں سے مدغم ہو جاتی ہیں

ان کے افسانوں کا مجموعہ خیالستان دنیائے اردو میں کافی ہر دلعزیزی حاصل کر چکا ہے جس میں کچھ افسانے تو ترکی ادب سے آئے ہیں اور کچھ انگریزی سے لیکن زیادہ تعداد طبع زاد افسانوں کی ہے۔ طبع زاد افسانوں کی خوبیوں کے اسار میں ایک خرابی بھی نظر آتی ہے کبھی کبھی افسانہ، افسانہ ہو کر رہ جاتا ہے یعنی اصلیت اور واقعہ دونوں مشکوک نظر آتے ہیں بہر حال خیالستان کے محاسن اتنے ہیں کہ ریویو اور احسار کی رائے ہے کہ "اردو زبان کی ادبیات لطف میں خیالستان سے بہتر کتاب نہیں" اس مجموعے میں ان کا ایک ناول "زہرہ

ہے جو بہت مشہور اور قابل قدر ہے یہ ترکی قصہ کا آزاد ترجمہ ہے اور بہت عمدہ ہے۔

# سُلطان حیدر جوش

سلطان حیدر صاحب جوش عرصہ دراز سے دنیائے اُردو میں ایک خاص حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ کا مقصد اعلیٰ ہندوستانیوں کو مغرب کی کورانہ تقلید سے بچانا ہے جس کے لئے موصوف نے حکیمانہ مضامین بھی لکھے۔ ناولیں بھی لکھیں اور مختصر افسانے بھی تصنیف کئے۔ لوگوں کو طرح سے راہ راست پر لانے کی کوشش کی کبھی اکبر کی طرح مذاق میں سنجیدگی اور دُور اندیشی کی دنیا سے روشناس کرانے کی فکر کی بہر حال ہر وقت اور ہر صورت میں اپنا مقصد پیش نظر رکھا ایسا تعلیمی مقصد ان کو اتنا عزیز ہے کہ افسانوں میں کبھی کبھی ناصحانہ اندازِ بیاں پیدا ہو جاتا ہے یعنی بجائے اس کے کہ کردار کے حرکات و سکنات اقوال سے سبق آموز نتائج نکالے جائیں وہ خود ہی مہتاب ہو کر دنیا کے لیئے وزاریاں کرنے لگتے ہیں ابتدائی دور میں افسانہ کی جو حالت تھی اس کے لحاظ سے قابلِ قدر کہے جا سکتے ہیں مگر اب اردو میں افسانہ نویسی اتنی ترقی کر گئی ہے کہ افسانہ جوش اور "فکرِ جوش" کو فن کی حیثیت سے کوئی خاص مرتبہ نہیں دیا جا سکتا

جوش صاحب کے افسانوں میں کبھی کبھی ایسی تمہید ہوتی ہے جو ناولوں ہی کے لئے موزوں تھی۔ مختصر افسانوں میں یہ لمبی چوڑی تمہیدیں مستحسن نہیں ہو سکتیں اتنا زیادہ حصہ افسانے کا یہ تمہید ہو جاتا ہے کہ اصل قصہ کی روئداد کو اتنا حصہ بھی نہیں ملتا جتنی اسے ضرورت ہوتی ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اصل قصہ دلچسپ نہیں ہونے پاتا اور ختم کر دیا جاتا ہے کبھی کبھی افسانے کو تاب سے پہلے موت آ جاتی ہے۔

زبان میں شگفتگی اور بیان میں کافی بےتکلفی و روانی ہے اسلوبِ بیان کو جوش صاحب

اپنی مدرت پسند طبیعت سے دلکش بنانے کی بہت کوشش کرتے ہیں محاورات تشبیہات بھی نئی لاتے ہیں عالباً زبان کو مالدار بنانے کی فکر رہتی ہے مگر اس جستجو میں کامیابی ناکامیابی دونوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اب کا انتقال علیگڈھ میں ۱۹۵۴ء میں ہوا۔

# مجنوں

مغربی ادبیات سے متاثر ہو کر ایسا الگ رنگ قائم کر لینے والوں میں مجنوں کو ایک خاص مرتبہ حاصل ہے، وہ انگریزی افسانہ نگار ارڈی سے بہت زیادہ متاثر ہوئے ہیں جس کا ان کو خود اعتراف ہے ان کے پیش نظر زندگی کے بہت سے وہ زاویے ہیں جن کا انکشاف اب تک نہ ہو سکا۔ خیر و شر کا تصادم، جبر و اختیار کے حدود، زندگی اور موت یہی وہ سوالات ہیں جن کے جواب کی جستجو نے انھیں ایسی چیزیں لکھنے پر مجبور کیا جو عام لوگوں کے یہاں نہیں پائی جاتیں ان کی نگاہیں ایسے ہی واقعات کا انتخاب کرتی ہیں جہاں حیات کی کشمکش کوئی دلدوز تمثیل پیش کر رہی ہے ان کے افسانوں کے کردار اپنی مظلومیت کی وجہ سے ہمدردی حاصل کر لیتے ہیں ان کے لئے دنیا اور اس کی تمام دلچسپیاں کوئی دلکشی نہیں رکھتیں ان کا غم و الم ان کی تکلیف اور ایذا فضا کو غمناک بنا دیتی ہے اور وہ دنیا سے بیزار ہو کر ایک ایسی زندگی بسر کرتے ہیں جو عبرت نہیں پیدا کرتی بلکہ موجودہ نظام تمدن سے بغاوت اور سرکشی پر آمادہ کر دیتی ہے۔

مجنوں کی ذہنیت انقلاب پسندی کے جراثیم سے پُر ہے وہ تہذیب کی موجودہ روش میں نجات کی راہ نہیں دیکھتے ان کا کردار کسی ایسی دنیا کی تلاش میں مصروف نظر آتا ہے جہاں امن و سکون ہو اور اسی جستجو میں وہ ہلاکت کے دروازہ پر پہنچ جاتا

ہے عام زندگی اور مطالعہ معاشرت میں تصادم ہوتا ہی رہتا ہے لیکن اس کا تماشا محسن کی ہمدردی حاصل کر لیتا ہے اور ان کے افسانے میں ایک مظلوم کی شکل میں پیش ہوتا ہے اخلاق و محبت کے وہ نازک مسائل جن کو چھیڑنا لوگ مناسب نہیں سمجھتے محسن کے خاص موضوع ہیں۔ ان کا ہر افسانہ محبت کے جذبات سے لبریز ہے بعض اوقات محبت کی شدت ہلاکت کا سبب بن جاتی ہے ان کے افسانوں میں محبت کرنے والا کسی اور کام کا نہیں رہتا، وہ محبت کے لطیف سے لطیف جذبے کو بھی پیش کر سکتے ہیں عورت خاموش محبت کرتی ہے اور یہاں تک ضبط سے کام لیتی ہے کہ اس کا انجام دیکھا نہیں جاتا محسن کے قصوں کا خاتمہ عموماً المیہ ہے ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ تیکھا پن اور وہ تلخی جو روح تحکم ہو رہی تھی کم ہو جائے لیکن پھر بھی وہ نرمی اور گھلاوٹ نہیں آسکتی جس سے اس قدر شدید قسم طبیعت کی تلافی ہو سکے

منظر نگاری بہت کم ہے لیکن جہاں کہیں ہے دلچسپ ہے محسن نے کبھی کبھی مزاح لطیف کی بھی کوشش کی ہے لیکن اس میں ایک غیر فطری ایسا ہی معلوم ہوتا ہے جیسے کسی روتے ہوئے شخص کو گدگدا کر ہنسا دیا جائے۔

محسن نے اپنے افسانوں کے لئے ایک مخصوص طرز تحریر بنا لیا ہے جس میں اثر کا عنصر زیادہ موجود ہے رشتہ استعارہ کو وہ اثر بیحد بڑھا دیتے ہیں ان کے کردار آپس میں بہت کم ملتے ہیں لہذا وہ خود ان کے خیال کی ترجمانی کرتے ہیں اسی وجہ سے انھیں جذبات نگاری پر کافی قدرت حاصل ہو گئی ہے۔ وہ محسوسات قلب کو نہایت صاف اور سادہ الفاظ میں بیان کر سکتے ہیں زبان رواں ہے لیکن انشا اس سے بھی زیادہ رواں ہوتا ہے وہ جذبات کی ترجمانی کرتے وقت زبان اور بیان کو اہمیت نہیں دیتے بلکہ قصے کو دلچسپ اور رواں بنانے کے لئے زبان کی بندشوں سے آزاد ہونا چاہتے ہیں۔ ان کے افسانوں کے دو مجموعے "خواب خیال"

اور "سمن پوش" شائع ہو چکے ہیں، جو بہت اچھی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں۔

محمود کے ادبی کارنامہ کا ایک دوسرا پہلو بھی نہایت درخشاں ہے تنقید نگاری میں آپ خاص شہرت کے مالک ہیں نفسیاتی تحلیل کے ساتھ ساتھ زبان کی لطافت اور روحی ارتقا پر روشنی ڈالنا آپ کا خاص حصہ ہے مستقبل کی تاریخ غالباً محمود کو افسانہ نگار سے زیادہ تنقید نگار کی حیثیت سے یاد رکھے گی مغربی تنقید سے انھوں نے اردو کے دامن کو بہت کافی مالا مال کیا ہے لیکن طرز ادا کا انوکھا پن اور اردو کے ماحول کا خیال کبھی نہیں چھوڑتے ان کی تنقیدات ہمیشہ پُر معنی اور دلی اور مرکزی نکات کو بے نقاب کر دیتی ہیں اور شاید یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ محمود کے ساتھ اردو فن تنقید ایک نئے دور میں قدم رکھ رہا ہے۔

"ادب اور زندگی" اور "تنقیدی حاشیے" ان کے مضامین کے مجموعے ہیں جن کے پڑھنے کے بعد آدمی ان کی اس خصوصیت کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جن شاعر یا جن مصنف کی بات وہ لکھتے ہیں اسے ایسا ہیرو بنا لیتے ہیں اور اس کی انتہائی تعریف کرتے ہیں۔

# جلیل قدوائی

ایسے روز روز اچھے افسانوں کی مثال رکھنے کے لئے ہمیں اس کی بھی ضرورت ہے کہ غیر ممالک کے مشہور افسانہ نویسوں سے استفادہ کریں اور پھر اسی روشنی میں اپنی افسانہ نگاری کو بھی فنی حیثیت سے مسلم بنالیں جلیل قدوائی نے اس ضرورت کو محسوس کر کے روسی مصور نگار چیخوف کو اپنا رہنما بنایا۔ اس کے افسانوں کے ترجمے کئے اور پھر جب خود طبع زاد افسانے لکھنے بیٹھے تو چیخوف کا اثر قبول کر چکے تھے کہ اس

رنگ سے علیحدہ نہ ہو سکے۔ وہی سیرت طراری اور حدمات ہر جگہ نمایاں نظر آتے ہیں۔

خلیل دنیا کو ایک بہتا سمندر سمجھتے ہیں جس کے ہر حصے میں لہریں ہی لہریں ہیں اور ہر لہر زندگی کا کوئی رُخ پیش کر سکتی ہے حیاتِ انسانی کے ہزارہا نقوش میں سے وہ کوئی ایک نقش لے کر ایک افسانہ مکمل کر لیتے ہیں اور درحقیقت افسانہ کے لئے یہ بھی ایک ضروری چیز ہے کہ اس کی مدت زیادہ نہ ہو۔ خلیل نے عام افسانہ نویسوں کی طرح صرف عشق و محبت ہی کو اپنا موضوع نہیں بنایا بلکہ حیاتِ انسانی کے ہر رُخ پر نظر ڈالنا چاہتے ہیں اور جس جگہ وہ زندگی کے معمہ کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں یہی ان کا افسانہ ہوتا ہے نہایت پُرخلوص طور پر وہ خود سمجھ کر دنیا کو سمجھانا چاہتے ہیں

خلیل کے افسانوں کے کردار ہمارے سامنے اس طرح آتے ہیں کہ ہم ان میں کوئی اجنبیت محسوس نہیں کرتے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان سے مار ہا مل چکے ہیں خلیل ان میں خود شریک ہو کر اثر انگیزی کو بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنے ہر کردار کی سیرت کی خوبیوں اور کمزوریوں سے اچھی طرح واقف ہونے کا ثبوت دیتے ہیں وہ ان کے احساسات اور حدمات کی ترجمانی اس طرح کرتے ہیں۔ جیسے خود ان پر گزر رہی ہے۔ حدمات نگاری افسانوں کی جان ہوتی ہے۔ خلیل کے یہاں اس کی بھی کمی نہیں

البتہ افسانے بعض اوقات اس قدر تلخ اور سخت ہوتے ہیں کہ پڑھنے والے کو تکلیف سی محسوس ہونے لگتی ہے لیکن خلیل کے یہاں دردناک افسانوں میں حوادث کا تذکرہ اس طرح نہیں کیا گیا ہے کہ پڑھنے والا بے قابو ہو جائے ایک طرح کی نرمی اور گھلاوٹ پائی جاتی ہے۔ جس میں سوز و گداز اور اثر پوری طرح کارفرما نظر آتے ہیں

خلیل کے افسانے منظر نگاری سے بھی خالی نہیں ہیں مختصر ٹکڑے پوری رنگینی اور آب و تاب کے ساتھ نظر آتے ہیں　　لیکن یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس

سلسلے میں انھوں نے کوئی نئی بات پیدا نہیں کی بلکہ قریب قریب پرانے لکھنے والوں کے نقش قدم پر گامزن کی ہے۔

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے جلیل کے اکثر افسانے ترجمہ ہوتے ہیں ترجمہ میں اصل افسانے کی خوبیوں کا برقرار رکھنا ایک مشکل بات ہے لیکن جلیل اس وادی سے بھی نہایت کامیابی کے ساتھ گزر جاتے ہیں۔ بعض اوقات عبارت کے روپ اور روانی میں کمی نظر آتی ہے طرز ادا غیر مانوس ہو جاتا ہے لیکن مترجم اصلی زبان کا لطف موجود ہے۔ زبان اور عبارت کے روپ میں کوئی رکاوٹ نہیں پڑتی ترجمہ کرتے کرتے جلیل نے اپنے لئے خود ایک مخصوص طرز تحریر پیدا کیا جو طبع زاد ہونے کے باوجود افسانوں کو ترجمہ کی شکل دیدیتی ہے

جلیل کی زبان سلیس اور صاف ہے وہ عبارت آرائی اور مشکل الفاظ سے مضمون کو بیکار نہیں بناتے بلکہ ایک نظری انداز میں ہر گتھی کو سلجھاتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ طرز بیان کی شگفتگی مفہوم کو آسان اور زود اثر بنانے میں بہت معاون ہوتی ہے

جلیل قدوائی نے جب سے سرکاری ملازمت کی ہے ان کے ادبی ذوق میں کمی آگئی ہے گو وہ اب بھی لکھتے پڑھتے رہتے ہیں مگر اس سلسلے سے پہلے جہاں تک وہ پہنچ چکے تھے اس میں اب ترقی نہیں نظر آتی جلیل شاعر بھی ہیں حسرت کے رنگ میں اشعار کہتے ہیں جس کا شاہد ان کا مجموعہ کلام "نوائے سینہ تاب" ہے

## علی عباس حسینی

طبع زاد افسانے لکھنے والوں میں علی عباس حسینی ایک خاص انداز کے مالک

ہیں انھوں نے اپنے پلاٹ، کردار اور طرز بیان کے ذریعے سے ایک انفرادیت اختیار کرنے کی کوشش کی ہے اور اگرچہ بقول پروفیسر رشید احمد ہندوستان کے تمام مصنوں نگاروں کا طرز بیان، مضمون کی ابتدا اور انتہا ایک ہی سی ہے لیکن اس کی عام کوشش ہو رہی ہے کہ ہر شخص ایسا ایک مخصوص اسلوب بیان رکھے حسینی صاحب کے یہاں ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے جو چیز سب سے نمایاں نظر آتی ہے وہ ان کی سیرت نگاری ہے ان کے کردار بعض خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں اور یہی قصے کی ارتقائی منزلوں میں، قصے کی تکمیل میں اور ہر جگہ کام کرتی ہوئی نظر آتی ہیں کردار کے سمجھنے اور سمجھانے میں نفسیات اور تحلیل نفسی کا خاصا ماگر پر ہو جاتا ہے۔ علی عباس صاحب اس خیال کو مدنظر رکھ کر افسانہ کے لئے قلم اٹھاتے ہیں۔ ابتدائی افسانوں میں جگہ جگہ یہ نفسیاتی صداقت کی کمی تھی۔ صرف اتر پیدا کرنا مدنظر ہوتا تھا۔ لیکن بعد کے افسانوں میں یہ کمی دور ہو گئی اور تحریر کے ساتھ ہی ساتھ کردار نگاری میں بھی پختگی آگئی۔

حسینی صاحب کے یہاں ایک قصہ گو کی طرح تفصیلات کی بھرمار ہے وہ جزئی باتوں کو بھی چھوڑنا نہیں چاہتے بعض اوقات معمولی باتوں کی تفصیل میں بہت کچھ لکھ جاتے ہیں یہ تفصیل سیرت اور کردار کے سمجھنے میں مدد تو ضرور دیتی ہے لیکن کبھی کبھی ناخاطر ہو جاتی ہے۔ اسی جگہ یہ بھی بتا دیا جائے کہ اسی کے برعکس وہ بعض جگہوں پر اختصار سے کام لیتے ہیں اور دو تین چھوٹے چھوٹے جملوں میں ایک مکمل نقشہ پیش کر دیتے ہیں۔

آج کل کے بہت سے افسانہ نویسوں کی طرح علی عباس حسینی بھی مقامی رنگ کے دلدادہ ہیں انھیں دیہات کی فضاؤں میں سکون ملتا ہے وہیں کے لوگ ان کے افسانوں میں نظر آتے ہیں وہیں کے رسوم و رواج اور اخلاق یہ

وہ روشنی ڈالتے ہیں ایک خاص انہماک کے ساتھ انھیں مناظر میں کھو جانا چاہتے ہیں دیہات کی زندگی پر وہ مختلف زاویوں سے نگاہ ڈالتے ہیں کھیت اور فصلوں کا تذکرہ کرتے ہیں لیکن ان سے افسانے کی پختگی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی ہے

علی عباس کے افسانوں کے پلاٹ نہایت دلکش اور فطری ہوتے ہیں اور اصلاح معاشرت کا کوئی پہلو ایک ہلکے رنگ کی طرح پورے افسانے پر چھایا ہوا ہے ان کے بعد کے افسانوں میں یہ مقصد اور زیادہ واضح ہو گیا ہے محبت کو وہ ایک پاک و مقدس جذبہ سمجھ کر عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں اور ہر جگہ اسے برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ظرافت اور مزاح لطیف کی چاشنی نے طرز تحریر کو بیحد شگفتہ بنا دیا ہے یوں تو ان کے یہاں ایک درد کی کسک اور تڑپ نظر آتی ہے۔ لیکن یہ ہلکا سا مزاح اسے فطری بنا دیتا ہے

زبان کی سادگی اور روانی افسانے کے لئے بیحد ضروری ہے حسینی صاحب بامحاورہ اور عام فہم زبان میں فلسفہ اور نفسیات کے مشکل مسائل حل کر دیتے ہیں الفاظ کے انتخاب، تشبیہہ اور استعارہ کی مدد سے عبارت میں بے انتہا اثر اور گداز پیدا کر دیتے ہیں انھوں نے فارسی اور عربی کے مانوس الفاظ سے کنارہ کشی کر کے ہندی کے خوبصورت اور سادے الفاظ لیے ہیں لیکن دلی زبان سے یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس کوشش میں اکثر انھوں نے ہندی کے نامانوس الفاظ سے کام لیا ہے جس کی جگہ پر مروجہ اردو کے الفاظ آسانی سے استعمال کئے جا سکتے تھے۔

آپ کے افسانوں کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں پہلے کا عنوان "—

"آئی سی ایس اور دوسرے افسانے" دوسرے کا "باسی پھول اور دوسرے افسانے" اور تیسرے کا نام "کچھ ہنسی نہیں ہے"۔

حسینی صاحب کے کردار عموماً متوسط طبقہ سے آتے ہیں اور اسی طبقے سے رسوم و عادات و حالات کو وہ ایسے خیالات کا محرک بنائے ہوئے ہیں سرکاری ملازمت اب عالباً ادبی کاوشوں میں سد راہ ہے۔ چنانچہ اب بہت کم لکھتے ہیں

# اعظم کریوی

اعظم کریوی شاعر بھی ہیں افسانہ نگار بھی۔ ان کے پہلو میں ایک حساس دل ہے اس لئے وہ زندگی کے تلخ واقعات اور لطیف احساسات کا ایک لطیف میں حاوی کر سکتے ہیں۔ کوئی واقعہ جس میں اثر کا عنصر موجود ہے ان کے افسانے کا موضوع بن سکتا ہے اکثر سچے واقعات کو رنگین اور دلکش بنا کر افسانے کے رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ جن واقعات سے متاثر ہوتے ہیں انھیں کو افسانہ بنا لکھ دیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے پڑھتے وقت ہم ایک حقیقی دنیا میں ہوتے ہیں

مقامی رنگ کو ایک انوکھے انداز میں پیش کرنے کا فخر اعظم کریوی کو حاصل ہے۔ پریم چند، علی عباس حسینی اور سدرشن نے بھی اسی راہ پر گامزن کی ہے لیکن خود دلکش طریقہ اعظم کریوی نے اختیار کیا وہ سب سے الگ ہے، وہ دیہاتی مناظر کے حسین نقشے معاشرت کے طریقے۔ بیوائوں اور مارواڑیوں کی گفتگو کے مناظر آپس کے تعلقات اور ان کا اثر سب کچھ اس طرح لکھتے ہیں کہ ہم کو کوئی اجنبیت محسوس نہیں ہوتی۔ وہ تمام جزئیات سے واقف معلوم ہوتے ہیں لیکن انھیں کو

سامنے لاتے ہیں جو افسانے کو ایک خوبصورت تصویر سا دیں ان کے گرد اعموماً نیچے طبقے کے لوگ ہوتے ہیں لیکن اعظم کریوی کو ان سے بڑی ہمدردی ہے ہارڈی کی طرح انھوں نے بھی ان کی آپس کی بے تکلفی اور گفتگو کے لطیفے کھینچے ہیں جس میں صداقت کے سوا اور کچھ بھی نہیں بوڑھوں کا طریقۂ تکلم، ان کی نقل و حرکت اپنے فطری انداز میں جلوہ گر ہے۔ عورتوں کی بات چیت اور ان کے اشغال ان کی سیرت کی خصوصیتیں سب مکمل طور پر بیان ہوتی ہیں۔ اس سے اعظم کریوی کی قوت مشاہدہ پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

زمیندار اور رعایا کے تعلقات، حکام اور ان کا عام لوگوں سے برتاؤ ایک دلچسپ موضوع ہے اعظم کریوی نے ان مظالم کا احساس کیا ہے جو غریب لوگوں پر ہوتے ہیں اور بعض اوقات موجودہ رسم و رواج کے تار و پود بکھیرنے کی کوشش کی ہے انھیں دیہات کے معمولی لوگوں سے بہت محبت ہے اور وہ ان کی صحیح حالت دکھا کر لوگوں کو ان کی طرف سے ہمدردی رکھنے پر مجبور کرنا چاہتے ہیں

محبت ایک پاک و مقدس جذبہ ہے اور ہر حال میں وہ کسی نیک کام کی تلقین کرتا ہے عشق کرنے والا ہمیشہ ایثار اور بنی نوع انسان کی ہمدردی سے معمور نظر آتا ہے اور جب محبت ہلاکت کی جانب لے جاتی ہے اس وقت ان کے کردار محبت کی عظمت سے سرشار نظر آتے ہیں اور کوئی بھی گھر کر محبت کو برا بھلا نہیں کہتا

دیہات کے مناظر یوں ہی خوشنما ہوتے ہیں لیکن اعظم کریوی کے قلم سے نکلنے کے بعد ان میں جان آجاتی ہے۔ کھیتوں اور دریا کی تصویریں برسات اور جھولے کے پُرلطف مناظر ان کے افسانوں کی رنگینی اور جاذبیت کو بہت بڑھا دیتے ہیں واقعہ نگاری کے سلسلے میں خارجی اور داخلی دونوں پہلوؤں پر ان کا قلم ایک ہی انداز

میں چلتا ہے۔ وہ حدیاتِ انسانی کے اچھے ترجمان ہیں اور اصلیت کو کسی حال میں ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔

ان کی زبان کا لوچ، مکالمے کا فطری انداز، جملوں کی تیزی اور گھلاوٹ سارے افسانے میں ایک خاص گداز کی کیفیت ان کی کامیابی کا راز ہے۔ دیہاتوں کی زبان لکھتے وقت انھیں کے منھ سے نکلے ہوئے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اس وقت ہم کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم کسی دیہات میں ایک تماشائی کی حیثیت سے سب کچھ دیکھ رہے ہیں۔ فارسی اور ہندی کی لطیف آمیزش جو اعظم کے یہاں نظر آتی ہے اردو کے اور افسانہ نگاروں کے یہاں کم پائی جاتی ہے

اعظم کریوی عرصہ سے خاموش ہیں۔ اب نہ ان کے افسانے نظر آتے ہیں نہ کوئی اور تحریر۔ غالباً لکھا پڑھا سب کر چکے ہیں۔ موجودہ افسانہ نگاری اتنی تیزی سے ترقی کر رہی ہے کہ اکثر پہلے کے لکھنے والے خاموش رہنا ہی پسند کرتے ہیں

اس ایڈیشن کے چھپتے چھپتے وہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے ۱۹۵۵ء میں وہ کراچی میں قتل کر دیئے گئے جس کا سبب اب تک نہیں معلوم ہو سکا۔

## اختر

اختر رائے پوری ملک کے اُن چند افسانہ نگاروں میں سے ہیں جنھوں نے مغرب کی فنکاری کو بڑی کامیابی سے اردو ہندی ادبیات میں منتقل کیا اور اردو میں افسانہ نگاری کے معیار کو بلند کر کے ہمارے ادب میں بعض قابلِ قدر خوبیوں کا اضافہ کیا

اختر صاحب کے آرٹ میں موجودہ نظام کی خرابیوں اور کمزوریوں کو محسوس

کرنے کے لئے یہ رد اور ماتر اندازِ بیان موجود ہے ان کی سطریں ہماری دل، سیکیوں
تصویروں اور ہر اس چیز پر پڑتی ہیں جن کو آپ ہمارے سماج کا ماحول سمجھ سکتے ہیں
وہ ان مقامات کو بڑی پرکاری کے ساتھ بیان کر جاتے ہیں بیان میں ایک خاص متانت
و دلکشی ہے ان کے انداز بیان میں ضبط و اثر اور احتفاظ و معنی آفرینی خاص طور پر کارفرما
ہوتی ہے ان کے افسانے پڑھنے کے بعد ہمیں ان کی ذہنی باریک بینی اور ان کے جذبات
و خیالات کے مخصوص تیور کا احساس ہوتا ہے

ایک خاص بات جو ان کو رومانی قسم کے ترقی پسند ادیبوں کی صف میں ممتاز
کرتی ہے یہ ہے کہ وہ عام ادیبوں اور شعراء کی طرح ہماری روح میں تسکین اور
خواب کا عنصر نہیں آنے دیتے بلکہ اس کو مضطرب، بے چین اور تڑپتا ہوا چھوڑ دیتے
ہیں جس سے ہمارے دلوں میں موجودہ نظام کی خرابیوں کا صحیح احساس پیدا ہو جاتا
ہے ان کی مفکرانہ طرز تخیل افسانہ پڑھنے والوں کو خاص طور پر متاثر و مرعوب
کرتی ہے جس کے سبب سے بعض وقت روانی کا فقدان معلوم ہونے لگتا ہے
ان کے افسانوں کے مجموعہ "محبت اور نفرت" کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ
بعض اوقات افسانوں کی طرز نگارش مضمون اور مقالہ نگاری سے متصل ہو جاتی
ہے اور ان کے افسانے اصول افسانہ نگاری سے دامن کشی کئے ہوئے نظر آتے ہیں
مشکل الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں لیکن موقع و محل کا خیال کر کے اس وجہ سے
عبارت میں دلکشی مجروح نہیں ہونے پاتی

اختر صاحب ایسے پڑھنے والوں کو ایک ایسی سرل پر لا کر چھوڑ دیتے ہیں جہاں
سے امید یا ناامیدی کا کوئی راستہ نہیں نکلتا بلکہ ایک عجیب قسم کی کسک ذہن
کو محسوس ہوتی ہے انھوں نے محبت و نفرت کو علیحدہ حیثیتیں دی ہیں اور ان کو علیحدہ
طور پر اپنے آرٹ میں شامل کیا ہے۔ جو بجائے خود ایک کمزوری ہے ایک اعلیٰ فنکار

کا فرض ہے کہ وہ ان دونوں انسانی جذبات کو ایک ساتھ پیش کرے۔ اگر کوئی ادب ہمارے دلوں میں صرف محبت یا صرف نفرت کے رجحانات پیدا کرتا ہے تو یقیناً یہ اس کے لحاظ سے ایک نقص ہے۔

اختر رائے پوری اپنی تنقیدوں سے اردو ادب میں ایک ممتاز جگہ حاصل کر چکے ہیں۔ آج کل وہ کراچی یونیورسٹی میں ملازم ہیں۔

# کرشن چندر

مغربی طرز تنقید کی بنا پر ہندوستان کے بھی فن تنقید نے دو اسکول مصنفین کے قائم کر دیئے ہیں۔ ایک ترقی پسند اور دوسرا رجعت پسند لیکن یہ تقسیم کچھ مناسب معلوم نہیں ہوتی کسی مصنف کو قطعی رجعت پسند یا ترقی پسند کہنا آسان نہیں۔ کیونکہ خود یہ دونوں قسمیں اپنی جگہوں پر اتنی الگ نہیں ہیں کہ اطمینان کے ساتھ کسی تخصیص کا فیصلہ کیا جا سکے دونوں کی حدیں ابھی ملتی جلتی ہیں پھر ممکن ہے کہ مغرب میں کسی طرح سے حد فاصل قائم بھی ہو سکے مگر ہندوستان میں ناممکن سا معلوم ہوتا ہے مغرب میں سرمایہ داری، تہذیبی ہیت یا اشتراکیت کا پہلو اختیار کر چکی ہے حقیقت میں ابھی ہندوستان نے سماجی یا معاشی حالات کی سا پر کوئی مخصوص اور مستقل حد فاصل نہیں قائم کی ہے اس کے علاوہ اور بھی دقتیں ہیں جن کو دیکھتے ہوئے رجعت پسند یا ترقی پسند قطعی طور پر کسی کو کہنا آسان نہیں لیکن جید ظاہری خصوصیات کی سا پر ہم کرشن چندر کو ترقی پسند مصنفین کی صف میں پاتے ہیں۔

ان کا فن مجموعی حیثیت سے پُر اثر اور دلچسپ ہے جو ان کے تمام افسانوں

میں نمایاں نظر آتا ہے۔ مناظر قدرت کے مقامی رنگ و بو سے وہ عموماً ایسے افسانوں کا پس منظر تعمیر کرتے ہیں۔ ان میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے افسانہ پڑھنے والوں کو چاہے تھوڑی دیر کے لئے شہر کے کاروباری مناظر میں دلکشی پیدا کر دیں یا دیہات کی اونچی نیچی زمین، دریا یا جنگل کے مناظر سے دل بہلا دیں مگر بالآخر دنیا کی تلخ حقیقتوں سے دوچار کرا دینا اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں اس کی ایک نمایاں مثال "گل فروش" ہے ان کا نظریہ عام نوجوان ستمرار و ادبا کی طرح صرف مزدوروں ہی تک محدود نہیں رہ جاتا وہ متوسط درجے کی المناک زندگی کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ ایسے افسانوں میں پیش کرتے ہیں۔

کرشن چندر حقیقت پسند اور زبردست حقیقت پسند ہیں اگر وہ تنگ و تاریک گلیوں کا ذکر کرتے ہیں تو ساتھ ہی ساتھ تیرہ و تار مناظر سے نکال کر روشن اور کشادہ سڑکوں کی بھی سیر کرا دیتے ہیں اب یہ پڑھنے والے کی صلاحیت پر ہے کہ وہ مصنف سے کام لے اور مصنف کی حقیقی ہمدردی کا اندازہ کرے وہ زندگی کو کس نظر سے دیکھتے ہیں اور کیونکر سنوارنا چاہتے ہیں اس سلسلے میں ان کا افسانہ "زندگی کے موڑ پر" بہت خوب ہے وہ عام نوجوان ادیبوں کی طرح موجودہ سماج کی کاروباری زندگی کے لئے تکے میں پر شدید حملہ کرتے ہیں اور ایک بہتر و بہتر مستقبل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں لیکن شدت احساس سے کبھی کبھی جذباتی طور پر چیخ اٹھتے ہیں جو بعض لحاظ سے نامناسب معلوم ہوتا ہے

مجموعی طور پر کرشن چندر کے افسانوں کی خصوصیات یہ ہیں زمان و حقیقت کا ایک دلکش امتزاج۔ مطالعہ کی باریکی اور فراوانی موجودہ سماج اور نظام معاشی سے انتہائی اور دلی نفرت کا جذبہ، طنز اور مزاح کی ایک خوشگوار آمیزش الکش

رمزیہ نگاری اور انسانی نفسیات کا عمیق ترین مطالعہ۔

کرشن چندر موجودہ افسانہ نویسی میں ہر افسانہ لکھنے والے سے بہتر سمجھے جاتے ہیں۔ اردو کی اس صنف کو جس خوبصورتی اور فنی کمالات سے انھوں نے آگے بڑھایا ہے وہ رہاں دہیاں کے لحاظ سے پریم چند کے کارناموں پر اضافہ خیال کیا جاتا ہے۔

ان کے افسانوں کے متعدد مجموعے ہیں لیکن وہ مجموعے جن کے افسانے کرشن چندر کے ذہنی ارتقا کا پتہ دیتے ہیں حسب ذیل ہیں۔ "زندگی کے موڑ پر" "ٹوٹے ہوئے تارے" ان افسانوں میں رومانی طرز تخیل و اندازِ بیان کا مطالعہ ہے۔

دوسرا دور جب اشتراکیت سے وہ قریب تر ہو گئے ہیں اس وقت کے افسانوں کے مجموعہ میں "نظارے" خاص طور پر قابلِ قدر ہیں۔ تیسرا دور تقسیم ہند کے بعد سے شروع ہوتا ہے جس میں ان کا بہترین شاہکار "ہم وحشی ہیں" ہے جس کی تقلید آج تک ہو رہی ہے۔

# سعادت حسن منٹو

ان کی سوچی تحریر سے ایک دنیا نقشِ فریادی ہے۔ ان کے کردار ان کا ہیرو ہیں کا عدی نہیں بلکہ گوشت پوست کا ہے وہ فرشتے نہیں حقیقی ہیں ہماری طرح انسان و دنیا دار ہیں۔ سماج کی خود غرضی اور سطام حکومت کی اتری نے ان کو اس حالت میں پہنچا دیا ہے کہ وہ اپنے جسم بیچنے پر مجبور ہیں اور اپنی انسانیت و خودداری کو دوسروں کی تفریح و ہوس کے لئے ذلیل کر کے پیش کرتے ہیں یہ طبقہ ہمیشہ سے موجود تھا۔ لوٹنے والے اور لٹنے والے تاریخ کے ہر دور میں یہاں سے تھے۔

چنانچہ آج بھی ہیں مگر لٹنے والوں کی خستہ حالی اور مجبوری پر کسی نے اقتصادی راویہ اور معاشرتی ارتقا کے خیال سے نظر نہ ڈالی۔ بھیانک اور گندی دنیا سمجھ کر گناہوں کا مجسمہ تصور کر کے ارباب حل و عقد نے ہمیشہ اس طبقے سے ستم پوشی بہتر سمجھی حالانکہ روزمرہ کی زندگی میں اس طبقہ کو بھی غیر ضروری سمجھا گیا۔ منٹو نے ایسے احاطوں میں ایسے ہی لوگوں کے پوست کندہ حالات بیان کئے ہیں ان کی زندگی کے مختلف ناقابل برداشت مصائب کا ذکر کیا ہے ان کی گندی طرز معاشرت اور ذلیل ماحول پیش کیا ہے خیال ہوتا ہے کہ ان کا منشا اس گناہگار اور بدنام طبقہ کی زندگی کو دکھا کر عالماً زمانے کو یہ سمجھانا تھا کہ اس دیار کے رہنے والے بے بس ہیں اور ایسا کرنے پر مجبور ہیں وہ لذت کے لئے یہ پیشہ نہیں کرتے اس قصا میں وہ اس لئے سانس لے رہے ہیں کہ دنیا نے ان کو اس گڑھے میں ڈھکیل دیا ہے۔

طوائفوں یا اسی طبقے کے دوسرے کرداروں کو وہ اس انداز سے پیش کرتے ہیں کہ جیسے ان کی زندگی ان ہی لوگوں میں گزری ہو جیسی کیفیت اور نفسانی خواہشات کے مظاہرے بڑی تفصیل دہیاکی سے بیان کرتے ہیں کبھی کبھی تو ان تفصیلات میں اتنا ڈوب جاتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ منٹو کے پیش نظر اصلاح نہیں بلکہ لطف اندوزی ہے ایسے ہی مقامات پر استذال و تکلیف دہ تشویش پیدا ہو جاتی ہے۔ جو کسی لحاظ سے قابل برداشت نہیں۔

منٹو کے دل و دماغ پر جنسیات کا غلبہ ہے وہ بہت کچھ فرائڈ کے فلسفہ سے متاثر ہیں اور دنیا کو یا کم سے کم ایک خاص طبقہ کو جنسی خواہشات کا شکار بتاتے ہیں مگر نہ اصلاح کا کوئی طریقہ بتاتے ہیں اور نہ اتنی کو گمراہات کے سمجھنے کا موقع دیتے ہیں بلکہ ذہن کو مشتعل و گمراہ کر دیتے ہیں حالات سے تنفر کے بجائے

ایک لذت انگیز اُلجھن پیدا کر دیتے ہیں جو اس مقصد کے برعکس ہے۔ جو ہم نے اوپر کی سطروں میں بیان کیا ہے ان کی طرح تخیل پر حسی غلبہ ہے ایسے ہی افسانہ نویسوں کے لئے غالباً اقبال نے کہا تھا۔ "آہ بیچاروں کے اعصاب پر عورت ہے سوار"

منٹو کی بیباکی اور عریانیت کو دیکھ کر ایک رائے کو خیال ہوا کہ وہ ترقی پسند تحریک کے تحت یہ معرکہ سر کر رہے ہیں مگر یہ سراسر غلط فہمی تھی۔ ترقی پسند تحریک کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے یہ ان کا ذاتی فعل ہے اور ان کی دہنی اپج کا نمونہ ہے ترقی پسند تحریک ادب کو حیات سے قریب تر کرنا چاہتی ہے۔ وہ زندگی کے بھیانک پہلوؤں کو اس لئے پیش کرنا چاہتی ہے کہ ان کی اصلاح ہو جائے وہ بھی معاشرت کے صحت مند اجزا میں تبدیل ہو سکیں وہ طوائف یا اس قبیل کے دوسرے کرداروں کو تعیش اور رہی استعمال کے لئے نہیں قلم بند کرتی اس کا منشا گرے ہوئے طبقہ کو اُبھارنے کا ہے منٹو کے یہاں یہ مقصد ہم کو بہت کم ملتا ہے۔

منٹو کے اسلوب بیان میں روانی کافی ہے سادگی بہت ہے مگر عمق بالکل نہیں۔ موضوع میں تنوع بھی کم ہے ایک ہی طرح کی بات زیادہ تر کہتے ہیں البتہ نفسیات کا مطالعہ وسیع ہے۔ متحرک کرنے والے جذبات یا متحرک ہونا والے اثرات کو بڑی اچھی طرح میں کرتے ہیں۔ نفسانی خواہشات کے دام میں پھنسے اور پھنسانے والوں کی ذہنیت کی ترجمانی یہ وہ بورتی طرح قادر ہیں ان کی زندگی کا نقشہ اور ان کی گلی کا خاکہ پوری وضاحت کے ساتھ اثر پذیر انداز میں بیان کرتے ہیں۔

منٹو کا انتقال ۱۸ جنوری ۱۹۵۵ء کو پاکستان میں ہوا۔

۸

# مزاحیہ افسانے

گذشتہ صفحات میں اکثر اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ بعض اہلِ قلم نے افسانوں اور مضامین کو اپنے اصلاحی مقاصد کا آلۂ کار بنا دیا۔ انھوں نے وہ عبرت انگیز راستا میں پیش کیں جو پڑھنے اور سننے والوں کے لئے سبق آموز رہیں۔ جس کا درد ناک اثر ہماری کمزوریوں اور برائیوں کی یاد دلاتا ہے۔ موجودہ باب میں ان ارباب قلم کا تذکرہ ہوگا جن کے یہاں اصلاح کا رنگ بدلا تبدیل ہو گیا ہے۔

اودھ پنچ اور اس کے مضامین لکھنے والوں نے اکثر سیاسی معاشرتی اور اخلاقی کمزوریوں کا مذاق اڑایا۔ خود ہنسے اور دوسروں کو ہنساتے رہے لیکن اس ہنسی ہی ہنسی میں وہ کام کی باتیں بھی بتا جاتے تھے۔ جب اردو ادب میں مزاح نگاری کا رواج ہو گیا تو انھیں لوگوں نے ناول اور مضامین کی طرف توجہ کی اور ایک تفریحی سرمایۂ ادب ایسے بعد چھوڑتے گئے۔ اودھ پنچ کے تتبع ہونے سے ملک میں ظرافت نگاری کا ایک رواج سا ہو گیا اور کچھ لوگوں نے اس میدان میں بھی

قدم بڑھائے۔ لیکن ان سب میں ایک مخصوص رنگ کی جھلک تھی۔

مغربی علوم کے اثرات سے ظرافت کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ جس میں طنز اور مزاح لطیف کا رواج ہوا۔ افسانے اور مضامین اکثر پلاٹ کے ذریعہ سے عمدہ آفریں سائے جاتے ہیں۔ اور کبھی کبھی صرف زبان اور الفاظ کی نکتی سے، یہ ضرور ہوا کہ بہت سے لکھنے والوں نے صرف ہنسانے کو ایسا مقصد سمجھ کر ادب اور زبان پر بھیری چلادی ان کے یہاں نہ صرف مزاح مقصود ہے بلکہ ہنسی ان کی ہنسانے کی ناکام کوششوں پر آتی ہے

تھوڑے ہی دنوں کے بعد مزاح نگاری میں ایک نمایاں تبدیلی واقع ہوئی اور مغربی ادبیات کے اثر سے مزاح کا رنگ تبدیل ہوگیا۔ لکھنے والوں میں کسی نے سیرت نگاری کا کمال دکھا کر وہ کردار پیدا کئے جو ہمیں سبق دے جائیں کسی نے اپنے اسلوب بیان اور زبان کی لطافتوں سے ہنسا کر ایسا کام نکالا۔ کسی نے پلاٹ میں وہ واقعات بیان کئے جو ہمیں ہنسنے پر مجبور کردیں۔ اس طرح مزاح لطیف کا عام رواج ہوگیا جس نے ادب اردو میں ایک گراں بہا اضافہ کرکے اس کمی کو پورا کردیا جس کے بغیر ہمارے یہاں رعایت اور مزاح کی کمی تھی۔

## پطرس

انگریزی ادب کے ایک اچھے ادیب ہونے کے ساتھ ہی ساتھ آپ کو اپنے ملک اور زبان سے بھی دلچسپی ہے مغربی ادبیات سے پوری طرح مستفیض ہونے کے سبب سے آپ نے اپنے مضامین میں ان تمام لطافتوں کا اظہار کیا ہے جو ہمیں مغرب میں نظر آتی ہیں۔ پطرس نے اردو مزاح نگاری کو ایک ایسے

راستے پر لگانے کی کوشش کی ہے جہاں فطری امداد موجود ہے وہ ہمارے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ واقعات کا تسلسل اور کرداروں کے حرکات و سکنات فطری طور پر اس طرح دکھاتے ہیں کہ خواہ مخواہ مزاح کا پہلو نکل آتا ہے۔ ان کے افسانوں کا مقصد محض ہنسنا اور ہنسانا نہیں ہوتا بلکہ ان کے ذریعے سے وہ اصلاح کا کوئی نکتہ مدنظر رکھتے ہوئے علمی اور ادبی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔

پطرس کو اس کا احساس ہوتا ہے کہ ہر شخص میں کچھ نہ کچھ کمزوریاں ہوتی ہیں اس لئے وہ کسی کی کمزوری پر اپنے افسانوں کی بنیاد رکھنا نہیں چاہتے بلکہ نہایت بے باکی اور بندہ دلی سے اس کمزوری کا اظہار کر کے ایک ہمدردانہ لہجے میں واقعات کے نشیب و فراز کا لطف اٹھاتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں پڑھنے والوں کی ہنسی میں محبت اور ہمدردی کا عنصر بھی موجود ہوتا ہے۔

پطرس نے کردار نگاری اور سیرت طرازی میں ایک ماہر نفسیات کا کمال دکھایا ہے ان کے کردار ایسے فطری امداد میں سب کچھ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور ان کو خبر نہیں ہوتی کہ ان کی حرکتوں کا اثر دوسروں پر کیا پڑ رہا ہے پطرس کا مشاہدہ بہت خوب ہے وہ سیرت انسانی اور اس کی خرابی باتوں کو بھی غور سے دیکھتے ہیں، وہ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جب انسان تنہا ہوتا ہے تو کیا کیا کرتا رہتا ہے انھیں یہ بھی خبر ہے کہ اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے میں کیا امداد پیدا ہوتے ہیں حرکات و سکنات رفتار و گفتار ہر ایک بات کے بیان میں نفسیاتی مشاہدہ کا ثبوت دیتے ہیں اسی لئے ان کے مضامین پڑھتے وقت ہم ان باتوں پر بھی ہنس لیتے ہیں

جو ہم میں نہ موجود ہیں۔ لیکن اس وقت ہم نے انھیں کبھی غور سے دیکھا ہی نہ تھا۔ پطرس کے کردار ارتقار کے اُصول کی پابندی پر کاربند نظر آتے ہیں

پطرس نہایت دکی الحس اور ذہین صاحب قلم ہیں ان کا پلاٹ کوئی گورکھ دھندا یا بھول بھلیاں کا منظر نہیں پیش کرتا بلکہ اس کا فطری اتار چڑھاؤ، مکالمہ اور روانی سب ایک جگہ ہو کر معمولی سے خیال کو بھی بلند کر دیتے ہیں۔ ان کا پلاٹ خاموشی کے ساتھ اپنے گرد و پیش کے مناظر سے ہم رنگ ہوتا ارتقا کی منزلیں طے کرتا جاتا ہے ہم ہنستے ہیں اور خود اسی میں گم ہو جاتے ہیں کبھی کبھی وہ جملوں کی ترکیب اور الفاظ کی ترتیب سے مزاح پیدا کر دیتے ہیں سرخستگی اور ندرت ایک سیدھی سی بات کو بھی سادہ آسان بنا دیتی ہے

منظر نگاری کا موقع پطرس کو زیادہ نہیں ملا لیکن جس جگہ انھوں نے اس کی کوشش کی ہے وہاں تصویر کو اپنے اصلی رنگ میں پیش کیا ہے۔ معاشرت اور عام گفتگو کے سلسلے ان کے قلم سے حقیقت کا رنگ لئے نکلتے ہیں مختصر یہ کہ پلاٹ اور کردار، سیرت اور منظر نگاری میں ہر جگہ اصلیت کو پیش نظر رکھا ہے

پطرس کی زبان کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے بعض جگہ ان محاورات سے قطع نظر کرنے کے بعد ان کی زبان سادہ اور دلچسپ ہے روانی اور زور کے ساتھ ہی ساتھ ایک لوچ اور دلکشی ایسی بھی موجود ہے جو انھیں صاحب طرز بنانے میں مدد دیتی ہے ان کا اسلوب بیان زبان کی تمام لطافتوں سے بھرا ہوا ہے شگفتگی سے معمولی باتوں میں بھی جان ڈال دی

ہے وہ ایسے بیان کو اس قدر خوش گوار اور پُر لطف بنا لیتے ہیں کہ جیسے پڑھنے والا ان کا رازداں ہے اور وہ اس سے ہمکلام ہیں۔

پطرس بہت کم لکھتے ہیں اب تک ان کا ایک مختصر سا مجموعۂ مضامین شائع ہوا ہے اور کچھ مضامین رسالوں میں نکلتے رہے لیکن اس کمی کے باوجود بھی انھوں نے ملک کے اچھے لکھنے والوں میں اپنے لئے ایک مقتدر جگہ پیدا کر لی ہے

# عظیم بیگ چغتائی

مزاحیہ افسانہ نگاری کے ذریعے سے اصلاح رسوم کا مقصد پیش نظر رکھنے والوں میں عظیم بیگ چغتائی کو ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے آپ کو طالب علمی ہی کے زمانے سے مضامین لکھنے کا شوق تھا۔ چغتائی کے افسانوں کی تمام تر دلکشی ان کے پلاٹ میں پائی جاتی ہے افسانہ پڑھتے وقت یہ بات واقع ہو جاتی ہے جس کی ہم کو امید نہ تھی بعض اوقات ان کے افسانوں کے کردار وہ حرکتیں کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جو ہماری روزمرہ زندگی میں نظر نہیں آتیں بوڑھا، رنجیہ عورت اور مرد ہر ایک متعدل نظر آتا ہے کوئی خاموش بیٹھا چاہتا ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر افسانوں کی ہیروئن وہاں ضائع ہو جاتی ہیں اور ہم ایسی موجودہ دنیا میں نہیں بلکہ چغتائی کی بنائی ہوئی دنیا میں پھرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

طالب علمی کی شرارتیں ان کے افسانے کے سرورق میں پائی جاتی ہیں شادی، بیاہ، نکاح و طلاق، پردہ وغیرہ کے متعلق وہ موجودہ صورتوں

میں کچھ اصلاح چاہتے ہیں اور ان کے بہت سے افسانوں کی بنیاد انھیں خیالات پر ہے۔ ان کا اثر ان پر اس قدر زیادہ ہے کہ افسانوں کے علاوہ انھوں نے "قرآں اور پردہ" جیسی سنجیدہ کتاب بھی لکھ کر اپنے مقصد کو واضح کیا ہے ان کی تصویریں ہماری موجودہ سوسائٹی سے تعلق نہیں رکھتیں بلکہ چغتائی کی ذہنی سوسائٹی کا مرقع ہیں۔ انھوں نے دردناک افسانے بھی لکھنے کی کوشش کی ہے لیکن ان کی شہرت "ترپیویی" اور "کولتار" پر قائم ہے۔ دوسرے افسانوں میں روانی اور وہ لطافت نہیں ہے جو "ترپیویی" وغیرہ میں پائی جاتی ہے زبان اور محاورے کا انھیں کوئی خاص خیال نہیں تھا ان کے یہاں جملوں کی ایسی ترکیبیں بھی نظر آتی ہیں جو اہلِ ذوق پسند نہ کریں گے۔ اگر زبان دانی اور قواعد سے ہٹ کر ہم ان کے افسانوں پر ان کی کردار نگاری یا پلاٹ کی خوبیوں پر نظر ڈالیں تو ہمیں اس سلسلہ پر عظیم بیگ ہی نظر آئیں گے اردو کے اور مزاح نگار ایسے مکالمہ اور طنز سے مزاح پیدا کرتے ہیں لیکن چغتائی کا پلاٹ ہی ہمیں ہنسنے پر مجبور کر دیتا ہے ان کی تصانیف کی فہرست طویل ہے، جس میں افسانوں کے علاوہ اور کتابیں بھی شامل ہیں۔

چغتائی تپ دق کے مریض تھے اور اسی سے رفتہ رفتہ اُن کی تمام صلاحیتوں پر پانی پھیر دیا اور بالآخر اگست ۱۹۴۱ء میں حسب ریاست حیدرآباد کے چیف جسٹس تھے۔ انتقال کیا۔

# فرحت اللہ بیگ

ہنسنے اور ہنسانے کا کوئی اصول مقرر نہیں ہو سکتا تمام مزاح نگار ایسا اندازِ جداگانہ رکھتے ہیں مرزا فرحت اللہ بیگ (آپ کا فرحت یا مرزا الم نشرح) کا بھی ایک مخصوص رنگ ہے جسے عظمت اللہ بیگ نے "خوش مذاقی" کہہ کر یاد کیا ہے خوش مذاقی یا مزاحِ لطیف میں قہقہہ کا موقع کم ملتا ہے، ہاں تبسم کے مواقع بہت ملتے رہتے ہیں، ان سب سے زیادہ ان کے یہاں ایک طرح کا انبساط حاصل ہوتا ہے خود یہ کہا جا سکتا ہے۔ مرزا صاحب کی علمی اور ادبی رنگ کی شوخی سے انھیں مزاح نگاروں میں ایک خاص جگہ حاصل ہے۔ خاص مزاحیہ مضامین کے علاوہ انھوں نے ادبی مباحث پر بھی قلم اٹھایا ہے لیکن طبیعت کی شگفتگی اور مزاح کی شوخی نے وہاں بھی گل کھلائے ہیں فرحت اللہ بیگ کے یہاں سوقیانہ پن نام کو بھی نہیں ہے ان کے مضامین پڑھتے وقت ایک طرح کی دماغی ورزش ہو جاتی ہے جس کے بعد فرحت حاصل ہوتی ہے۔

مولانا مدیر احمد کی طرح قوتِ بیان کافی موجود ہے تفصیلات سے مضمون بے حد دلچسپ ہو جاتا ہے۔ مرزا صاحب کی لطیف اور پرمعنی تحریر تفصیل کے موقع پر بھی اپنی لطافت کا ساتھ نہیں چھوڑتی ان کی لطیفہ پسند طبیعت" اور ان کی رنگین بیانی مضمون کے بیچ میں وہ واقعات لاتی ہے جو لطف پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ مضمون کو واضح سانچے میں مدد دیتی ہیں کبھی کبھی خفیف سا طنز بھی نظر آتا ہے جو سمجھنے والوں کے لئے

کافی اثر رکھتا ہے

مرزا مرحت اللہ بیگ کے یہاں دلچسپی کے کئی سامان ہیں ان کی مزاح نگاری سے قطع نظر کرنے کے بعد بھی دلی کی زبان اور محاورات کا کیف باقی رہ جاتا ہے وہ اکثر ایسے الفاظ اور محاورے ایسی عبارت میں لاتے ہیں جو دلی کے لوگ صرف گفتگو میں استعمال کرتے ہیں لیکن مرزا صاحب انھیں سے بلا تکلف ایسے مضمون کو سجاتے ہیں اور تو ان میں کوئی فرق نہیں ہوتے پاتا بلکہ مکالمے کا پورا لطف پیدا ہو جاتا ہے۔ روانی، الفاظ کی خوبصورت نشست مضمون اور خیال کا دست و گریباں ہونا، مرحت اللہ بیگ کی خصوصیات ہیں۔ پڑھنے والا ان کے مضمون سے کبھی اکتا نہیں سکتا

# رشید احمد صدیقی

رشید احمد جون پور کے ایک دیہات مڑیاہو کے رہنے والے ہیں ۱۹۰۶ء سال ولادت ہے انٹرنس پاس کرنے کے بعد وہ علی گڑھ آئے مگر تعلیم جاری رکھنے کے لئے ان کو تعطیل میں کچہری کی کلرکی کرنے پر بھی مجبور ہونا پڑا اس لئے کہ مالی مشکلات بیاہ نہیں لینے دیتی تھیں علی گڑھ سے انھوں نے ایم اے کیا ۱۹۲۲ء میں وہیں ملازم بھی ہو گئے انھوں نے طالب علمی ہی کے زمانے میں اپنی استاد پرداری کا سکہ بٹھا دیا تھا ان کی مخصوص استاد پرداری ان کی انفرادیت کی ضامن ہو گئی تھی

وہ اب علی گڑھ یونیورسٹی میں اردو ادب کے پروفیسر ہیں اور شعبۂ اردو کے صدر ہیں پروفیسر دو طرح کے ہوتے ہیں ایک تو وہ جو محض ادیب

سناتے ہیں اور دوسرے وہ جو اس سے زیادہ ادب کی خدمت کرنے کا خیال رکھ کر خود بھی مضامین لکھتے رہتے ہیں، رشید احمد صدیقی آخرالذکر طبقہ میں ایک ممتاز اور بلند مقام پر ہیں۔

طنز ایک مشکل صنف ادب ہے اور اسی لغزش بھی مضمون کو تباہ کرنے کے لئے کافی ہوگی رشید احمد طنز کے واحد لکھنے والے ہیں اور نہایت کامیابی کے ساتھ ایسا رنگ سب سے جداگانہ قائم کئے ہوئے ہیں۔ ان کے یہاں ایک طرح کی شستہ ظرافت ہے۔ رمز کنایہ میں تنقید کے دشوار گذار مراحل کو طے کر لینا رشید احمد کا ہی کام ہے ان کے ذاتی جذبات اور احساسات جو کسی واقعہ کے متعلق ہوتے ہیں ایک ظریفانہ انداز میں اس طرح ظاہر کئے جاتے ہیں کہ پڑھنے والا انھیں مذاق سمجھ کر ٹال نہیں سکتا وہ کانٹوں کی طرح اس سے الجھ کر ایسا اثر پیدا کر ہی لیتے ہیں۔

رشید احمد کے مضامین عام فہم نہیں ہوتے، ہر قدم پر وہ واقعات کی طرف لطیف اشارے کرتے ہیں۔ صرف وہی لوگ لطف اندوز ہو سکتے ہیں جو تاریخ اور سیاسیات سے اچھی طرح واقف ہیں وہ ایک بات کہہ کر گذر جاتے ہیں اور وہاں اس کے اجزا کو جمع کر کے کوئی نتیجہ نکالنے میں مصروف ہو جاتا ہے، ان کے خیالات کی دور رسی، گہرائی اور براکت عام مذاق سے بالکل علیحدہ ہوتی ہے رشید احمد کے یہاں ذہانت کا ثبوت ہر جگہ نمایاں ہے ان کی مثالیں ان کے مضامین کی جان ہیں "ابھر کا کھیت ہی کیوں نہ ہو، لیکن وہ اس کو اسمبلی اور پارلیمنٹ کے دشت بدوش دکھا سکتے ہیں طائر خیال کی یہ پرواز مثال کے موقع پر وہ چیز پیش لاتی ہے جس سے وہاں کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے

ان کی زبان مشکل عربی و فارسی الفاظ سے مقفیٰ و نگار حاصل کرتی ہے ان کی عبارت اپنے خیال کی بلندی اور الفاظ کی ترتیب کی وجہ سے عام فہم نہیں ہے لیکن ایک طرح کی روانی ہر جگہ پائی جاتی ہے۔ شگفتگی مضمون کے ہر حصے میں نظر آتی ہے فلسفیانہ مباحث بھی اسی شگفتہ اندوزی میں بیان ہو جاتے ہیں

افسوس یہ ہے کہ رشید احمد صاحب ہمیں بہت کم ایسے مضامین سے لطف اندوز ہونے کا موقع دیتے ہیں۔ عرصہ سے وہ خاموش ہیں ہم منتظر ہیں کہ وہ پھر جلد ہی کچھ کہتے ہوئے نظر آئیں۔ مضامین رشید اور حداں، ان کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں

۱۹۴۲ء میں ان کے مضامین کا ایک مجموعہ "گنج ہائے گراں مایہ" کے نام سے شائع ہوا۔ ادھر ایک مجموعہ "حداں" کے نام سے بھی شائع کر چکے ہیں۔ ان میں رشید احمد صاحب نے بعض اہم شخصیتوں کا ذکر کیا ہے اور اپنے طرزِ تحریر کے زور سے انھیں اس طرح بیان کیا ہے کہ وہ ہمارے سامنے ہنستے بولتے نظر آتے ہیں موضوع غیر دلچسپ ہونے کے باوجود عبارت میں وہ شگفتگی اور رواں ہے کہ جی بالکل نہیں گھبراتا ہے اس مجموعہ کی اشاعت سے ان کی بعض ایسی صلاحیتوں کا مظاہرہ ہوا ہے جو کہ ہر لحاظ سے قابلِ قدر ہیں۔

## ملّا رموزی

ملّا رموزی گلابی اردو اور بکاتی اردو کے موجد خیال کئے جاتے

ہیں اس بیان کو خود بھی بڑا فخر ہے اور ہر جگہ اس کا تذکرہ کر دینا بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ ایک جگہ کہتے ہیں۔ "ہماری اردو جملوں میں الفاظ کو بے ترتیب بنا دینے سے گلالی ہو جاتی ہے۔" اس طرح مفعول فعل فاعل اور مفعول کے قبل آجاتا ہے، اور اس کی شان ان تراجم کی ہو جاتی ہے جو اردو کے ابتدائی زمانے میں عربی سے کئے جاتے تھے۔ اس میں ایک طرح کی ندرت تو ضرور ہے لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد سارا اثر زائل ہو جاتا ہے اور عجیب و غریب الفاظ کا مسلسل کلیت وہ محسوس ہونے لگتا ہے۔ جب وہ سادگی کے ساتھ لکھتے ہیں تو ان کے یہاں حاسن زبانی نظر آتی ہے اور مزاح سے فطری لگاؤ ہونے کی وجہ سے عبارت کافی دلچسپ ہو جاتی ہے۔

مُلّا رموزی کے یہاں عام طور پر سیاسی واقعات کی طرف اشارے ہوتے ہیں وہ کبھی کبھی طریاتی انداز میں ان پر تبصرہ بھی کر جاتے ہیں ان کے دل میں مذہب اور قوم کا درد ہے اور وہ ان کی اصلاح چاہتے ہیں۔ اسلامی ممالک کا تذکرہ کرتے وقت ایک جوش اور رو رسا یاں ہو جاتا ہے، وہاں میں کسی طرح کی اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی کمزوری نہیں دیکھنا چاہتے ایک جگہ وہ خود لکھتے ہیں کہ ان کی مضمون نگاری کا راز ان کی تنقید نگاری میں ہے اور اسی وجہ سے ان کو ہر سچی اور بے لاگ بات کہنے والے کی طرح نقصان بھی اٹھانے پڑے لیکن انھوں نے مسلک تنقید کا دامن کبھی نہیں چھوڑا اور اپنے لطیف اشاروں میں ایک مزاحیہ انداز میں معاشی، معاشرتی اور اخلاقی حالات پر زبردست تبصرہ کرتے ہیں۔

مُلّا رموزی کا انتقال جنوری ۱۹۵۲ء میں ہوا۔

# شوکت تھانوی

اگرچہ غزلوں کا ایک مجموعہ "گھر ستاں" شائع کر کے شوکت نے اپنے آپ کو ایک شاعر کی حیثیت سے بھی پیش کیا ہے لیکن ان کی شہرت مزاح نگاری اور "تبسمات" کی رہین منت ہے۔ شوکت کا شمار ان لکھنے والوں میں ہے جن کو فطری طور پر مزاح نگاری کی صلاحیت ودیعت ہوئی ہے ان کے یہاں پلاٹ کی پیچیدگیاں نہیں ہوتیں۔ کیونکہ وہ افسانے کم لکھتے ہیں بلکہ روزمرہ کی زندگی اور اس کی معمولی باتوں پر تنقید ہوتی ہے جس میں موجودہ رسم و رواج پر تبصرہ ہوتا ہے۔ ان کے انداز بیان کی دلکشی کا راز ان کا میانہ پن ہے سادہ سادہ الفاظ میں وہ ایسی تصویر پیش کرتے ہیں کہ سنجیدہ سے سنجیدہ پڑھنے والوں کے لب پر بھی تبسم آہی جاتا ہے "سودیشی ریل" ان کی شہرت کا سنگ بنیاد ہے یہ اگرچہ افسانویت اور پلاٹ کی خوبیوں سے معرا ہے، لیکن مکالمہ اور انداز تحریر نے مناسب شگفتگی پیدا کر دی ہے۔ متعدد زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔

ان کی پانچ مشہور کتابیں جن کے نام بجائے خود ان کی افتاد طبیعت کا پتہ دیتے ہیں۔ "دنیائے تبسم"، "موج تبسم"، "بحر تبسم"، "لاب تبسم" اور "طوفان تبسم" ہیں۔ یہ نام ایسے ہیں کہ ایک جگہ خود شگفتگی اور تبسم کے مدعا معلوم ہوتے ہیں۔

اس محل میں ان حضرات کی مختلف مصوصیات ہیں جن سے شوکت بداتر واقف ہیں اس کتاب میں سیرت نگاری کی صلاحیت کافی نمایاں ہے

اپنے خاص انداز میں انھوں نے لوگوں کی اچھی اور بُری صورت و سیرت کو پُرلطف طریقے سے بیان کیا ہے

اس کے علاوہ ان کی لکھی ہوئی دس پندرہ اور کتابیں بھی ہیں

# کنھیا لال کپور

اردو کے مشہور طنز نگار ہیں۔ ان کی دُور بیں نگاہ زندگی کے ہر شعبے پر پڑتی ہے۔ سیاسی، معاشرتی، علمی، ادبی خرابیوں کو نہایت حسین اور مزاحیہ انداز میں منظر عام پر لاتے ہیں۔ ان کی تحریر تخیل میں فلسفیانہ عمق نہیں وہ کسی خاص نظریے سے متاثر ہو کر نہیں لکھتے اور وہ ایسے طور پر سوچتے ہیں اور سماج یا فرد کی خرابیوں کو بے جھجک کہنے کی باتوں کی طرح پیش کر دیتے ہیں۔ ادیب ہو یا کوئی لیڈر، عورت ہو یا سینما کا ڈائرکٹر۔ ہر ایک کی بے راہ روی پر کنھیا لال کپور کی نظر پڑتی ہے۔ ان کی حماقتوں کو بڑی سنجیدگی سے متعارف کرا دیتے ہیں باوجود متانت کے واقعات اور حالات کچھ ایسے سلیقہ سے سامنے لاتے ہیں کہ پڑھنے والا دیر لیب مسکراہٹ پر مجبور ہوتا ہے اور اجسام سے ماحر ہو کر ایسے کرداروں سے گریز کرنے لگتا ہے یہ کردار نگاری اور بھی موثر ہو جاتی ہے جب ایسے زعیم باطل میں لیڈر یا ڈائرکٹر وغیرہ ایسی، ماں سے ایسی حماقت آمیز خصوصیات پر تبصرہ کرتا ہے۔

کنھیا لال کپور ایسے افسانوں میں خود بہتے ہوئے نظر نہیں آتے بلکہ ایک طرح سے اشخاص یا رجحانات کی کمزوریوں کا ماتم کرتے ہوئے

دکھائی دیتے ہیں مگر اسلوب بیان کی شوخی اور بے باکی فضا میں ایک ایسی لہر دوڑا دیتی ہے جو سمجھنے والوں کو بار بار گدگداتی اور چھیڑتی چلی جاتی ہے۔ ان کی سیح النظری نے ان کے افسانوں کو یکسانیت کا شکار نہیں ہونے دیا بلکہ ان میں اچھا خاصہ تنوع پیدا ہو گیا ہے معمولی باتوں میں بھی انھوں نے نکات پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور اکثر کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان میں گہرائی نہیں پیدا ہو سکی مگر دلآویزی سے یہ مقامات خالی نہیں۔

ان کی تحریر میں بڑی شگفتگی اور سادگی ہے ان کے افسانے ایسے ہیں جیسے کوئی بے تکلف باتیں کر رہا ہو۔ عورت سے بچھڑے ہوا افسانوں کے بجائے وہ مضامین معلوم ہوتے ہیں وظاہر ہیں تحریر کی سادگی سے متصف ہیں لیکن باطن میں تشتر و مزاح اسا کام کر رہے ہیں ان میں ایک مقصد ہے وہ محض ہنسانے یا کھیلنے کھانے کے لئے نہیں لکھے گئے غلط میلانات اور مہلک جراثیم کو آپ کے سامنے بغیر فلسفیانہ انداز اختیار کئے ہوئے روزمرہ کی باتوں میں پیش کر کے کنھیالال ان کی اصلاح پر آپ کو متوجہ کر دیتے ہیں

کنھیالال کی زبان ٹکسالی اردو کا نمونہ ہے۔ ان کی تحریر کی سب سے نمایاں خصوصیت اس کی ادبیت ہے۔ جملوں میں جامعیت و روانی جہاں کہیں ہم آہنگ ہو گئی ہیں وہ مقام ادب کا بہترین حصہ ہو گیا ہے چونکہ ان کے یہاں ابہام کی کمی نہیں ہے اس لئے نہ تحریر میں الجھن پیدا ہوتی ہے نہ مفہوم سمجھنے میں دقت ہوتی ہے وہ اپنا مقصد واضح کرنے کے لئے تشبیہ و استعارے کا سہارا نہیں لیتے بلکہ جو کچھ کہنا ہوتا ہے صاف اور

رجستہ کہہ جاتے ہیں اپنے کرداروں کی جزوی تفصیلات سے پوری طرح واقف ہونے کی وجہ سے وہ ان باتوں کو بھی نمایاں کر دیتے ہیں جنھیں ہم روزمرہ دیکھنے کے معمولی بات سمجھ کر نظر انداز کر جاتے ہیں، لیکن اسی کو کپور اس رنگ سے ہمارے سامنے لاتے ہیں، کہ وہی دیکھی بھالی، سوچی سمجھی بات بڑی عجیب سی معلوم ہونے لگتی ہے اور ہم دل سے قائل ہو جاتے ہیں، ان کے یہاں ایسے مضامین بھی ملتے ہیں جو ضرورت سے زیادہ تیکھے اور مختصر ہیں۔

اب تک ان کے یہ مجموعے شائع ہو چکے ہیں رنگ، وحشت، چنگ، رباب، نوک نشتر، ستیہ، دیتیہ اور رسال دیر۔

---

# اختتام

ہر زندہ زباں کی طرح اردو کا بھی یہ نمایاں جوہر روزِ اول سے رہا ہے کہ اپنے سماج اور ماحول کی ترجمانی کرے یہ اور بات ہے کہ سماج اور ماحول اچھا نہ رہا ہو، لیکن زباں نے ان حالات کی عکاسی بڑی صداقت سے کی کوئی دَور ایسا مشکل ہی سے ملے گا جس میں اردو نے اپنا یہ فرض ادا نہ کیا ہو یہاں تک کہ آخر میں جب انگریزی حکومت کے بیجا غصب سے ملک کو آزاد ہونے کا احساس ہوا اور بڑی سے بڑی قربانی کی ضرورت پڑی تب بھی اردو نے آگے بڑھ کر حسب حیثیت مردانہ وار قوم و ملک کی مدد کی۔ آزادی کی تحریک کی ابتدا سے انتہا تک سیاسی رہنماؤں کے ہمدوش چلتی رہی کوئی جلسہ ایسا نہ ہوتا جہاں اردو کی سطریں دلوں کو گرمانے کے لئے نہ پڑھی جاتی رہی ہوں۔ جیل سے بھی متواتر ایسا پیام بھیجتے رہتے۔ چکی کی مشقت کے ساتھ مشق سخن بھی جاری رہی غالباً ہندوستان کی کسی زباں نے قوم و ملک کا اس معرکہ میں اتنا ساتھ نہ دیا ہوگا جتنا اردو نے وہ اپنی پوری رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی کہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان

کو آزادی نصیب ہوگئی خیال ہوا کہ جس زمانے نے اتنا ساتھ دیکر اتنی محنت کے بعد ہندوستان کو اس منزل مقصود پر پہنچایا ہے اس کو ہندوستان بھی، دوروں کے ساتھ آگے بڑھانے کی کوشش کرے گا یا کم سے کم ایسی خدمت گذار و وفاشعار اور قابل قدر زبان کو آزاد ملک اگر کچھ دے گا نہیں تو اس سے کچھ چھینے گا بھی نہیں، مگر یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا۔

جس آزادی کا صدیوں سے انتظار تھا اس کی شروعات عجب انداز سے ہوئی عظیم صغیر کے تقسیم ہونے پر مسلم لیگ اور کانگریس دونوں حد تھیں۔ ان کی رضامندی سے ہندوستان دو حصوں میں تقسیم ہوا خیال یہ تھا کہ فریقین کی رضامندی امن و سکون کی ضمانت ہے، مگر نتیجہ بالکل برعکس ہوا جشن آزادی کا سیر مقدم کشت و خون سے ہوا جس کو جہاں موقع ملا مار کاٹ سے باز نہ آیا اور فرقہ وارانہ فساد کی آگ ہر طرف لگ گئی۔ بربریت پوری فضا میں چھا گئی، وہ دن پڑا کہ دل سہم گئی۔ گویا سکون دنیا سے اٹھ گیا سیاسی رہنما بھی اپنے کو بے بس پانے لگے ایسی حالت میں ادبی رہنماؤں نے زبان و قلم سے وہ کام لیا جو زبان تیغ سے نہ ہو سکا تھا۔ فوج اور پولیس جب جوابی سکون قائم نہ کر سکیں اردو کے ادیبوں نے مظلوم و ترسے لوگوں کو خانہ جنگی کے مضمرات اور صلح و سکون کے فوائد فنکارانہ انداز میں اس طرح سمجھائے کہ ذہنیتیں بدلنے لگیں، فسادات اور مظلوموں کے ذریعے دلکش طریقے پر عوام کو متاثر کیا انسانیت کی عظمت اور کشت و خون کی بھیانک شکلیں نظروں کے سامنے آگئیں۔ غرضکہ لوگ ہوش میں آئے بربریت سے ہاتھ کھینچا۔ ہمارا یہ مطلب نہیں کہ فرقہ وارانہ فساد تمام تر ادب سے ختم ہوا بلکہ کہنا یہ ہے کہ سماج کو راہ راست پر لانے میں اردو شعراء و سرنگاروں کا بڑا ہاتھ تھا۔ ادیبوں نے سمجھ لیا تھا کہ ادب کے

ذریعے سے ملک و قوم کی خدمت فرض اولیں ہے لیکن اس خدمت کا صلہ اردو زبان کو جو ملا وہ ایک تاریخی حادثہ ہے

آزادی نصیب ہوتے ہی اردو کی عالمت ہندوستان میں شروع ہوگئی کبھی اس کو بیرونی بتایا گیا کبھی غیر آریائی کہہ کر حملہ ور کرنے کی کوشش کی گئی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دوستی کے پردے میں اس کو کمزور کرنے کی کوشش کی گئی دعویٰ یہ کیا گیا کہ ہندی اور اردو الگ چیزیں ہیں گرامر کے لحاظ سے ایک ہی چیزیں ہیں صرف رسم الخط کا فرق ہے اور چونکہ رسم الخط ناگری کا مکمل اور رفتار زمانہ سے بھی ہم آہنگ ہے اس لئے اردو رسم الخط کو چھوڑ کر ہندی رسم الخط اختیار کر لیا جائے اور جو الفاظ عربی کے اردو میں آگئے ہیں، ان کو نکال دیا جائے اس لئے کہ وہ غیر آریائی ہیں غرضکہ اس طرح سے اردو کی بیخ کنی ہونے لگی۔ یہ تو سب زبانی گفتگو تھی ان خیالات کو عمل میں اس طرح لایا گیا کہ دفتروں، عدالتوں سے یک جنبش قلم اس کو نکال دیا گیا اسکول اور کالج میں جہاں جہاں اردو رائج تھی قینچیں سے موقع پاکر اردو ختم کر دی پڑھانے والے بیکار ہو گئے۔ ابتدائی مدرسوں میں اردو پڑھانے کا وہ انتظام رہا جو کہ آزادی سے پہلے تھا نتیجہ یہ ہوا کہ لڑکوں کی تعداد بڑی تیزی سے گھٹ گئی۔ اس کے علاوہ نصاب تعلیم میں بھی کچھ ایسا التزام کیا گیا کہ جو لڑکے اردو لینے پر آمادہ ہوتے تھے ان کو آسانی سے اردو نہ مل سکی۔ مثلاً یہ شرط کہ اگر کوئی لڑکا اردو لے تو انگریزی نہیں لے سکتا اور مختلف موضوعات کے ساتھ اردو کی تعلیم اسکول اور کالجوں میں ناممکن ہو گئی غرضکہ کچھ ایسی قیدیں لگا دی گئیں کہ بہت کم طلبا اردو لے سکے چنانچہ اسکول اور کالجوں میں اردو پڑھنے والے طلبا کی تعداد ناگفتہ بہ ہو گئی۔

ہندوستان کے دستور العمل میں ۱۴ زبانوں کو ہندوستان کی زبان تسلیم کیا گیا ہے
مجملہ ان کے اردو بھی ایک زبان مانی گئی لیکن حیرت و افسوس یہ ہے کہ اس زبان
کو نہ عملاً علاقائی زبان کا درجہ دیا گیا اور نہ اس کا کوئی علاقہ بتایا گیا دستور العمل
کی کاغذی کارروائی اتنک شوئی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی اس کو علاقائی
درجہ دلانے کے لئے اردو والوں نے رات دن ایک کر کے اکیس لاکھ سے
زیادہ ایسے لوگوں کے دستخط معہ سکومت وغیرہ کے فراہم کئے جن کی مادری زبان
اردو تھی ایسے دستخط کرنے والوں میں ہندو مسلمان سبھی تھے۔ سب کاغذات
لیکر ایک وفد باقاعدہ صدر حکومت جمہوریہ ہند کی خدمت میں حاضر ہوا ان
کو واقعات سمجھائے اپنے حقوق کا مطالبہ کیا مگر سال بھر سے زیادہ ہوا ابھی
تک حکومت نے کوئی جواب نہیں دیا اس طویل خاموشی کے درمیان اس
کمیٹی کی بھی رپورٹ شائع ہوئی جو سالی میاد پر صوبوں کو ازسر نو ترتیب دینے
کے لئے حکومت ہند نے مقرر کیا تھا۔ اس کمیٹی نے بعض صوبوں میں دو دو زبانیں
بھی رکھنے کی سفارش کی ہے مگر اردو کے لئے اس نے بھی کوئی جگہ متعین نہیں
کی۔ گویا اردو ہندوستان میں نہ کہیں بولی جاتی ہے اور نہ کسی علاقہ کی مادری
زبان ہے۔ یہ سب قید و بند اس زبان پر ہے جس نے آزادی کی جنگ میں
اپنا تن من دھن سب کچھ لگا دیا تھا۔ ان تمام تشدد اور حق تلفیوں کا اصل
یہ ہے کہ ہندوستان میں اردو حکومت کی سرپرستی سے محروم ہے ملک کے اعتنا یوں
کا شکار ہے حکومت کا یہ رویہ اردو کے لئے تکلیف دہ ہے یہ اور بات ہے
کہ اردو کے لکھنے پڑھنے والے اس سے بے اعتنائی کرتے ہیں اس کے حقوق
کا مطالبہ برابر کئے جا رہے ہیں۔ اس کی اشاعت کے لئے ہمیشہ سے زیادہ مستعد
ہیں۔ اس میں آج بھی ہونہار شعرا و نثر نگار پیدا ہو رہے ہیں لیکن مستقل خطرے

سے خالی نہیں جب ابتدائی و ثانوی تعلیمات سے وہ محروم رہیں گے تو انفرادی حیثیت سے کب تک اس کا وقار قائم رہے گا اس کی جڑ پر کلہاڑی رکھ دی گئی ہے تو اس کی سرسبزی کا خدا حافظ

باوجود اس کے عوامیوں کے اردو اب بھی فرض شناسی سے کام لے رہی ہے۔ اس کے ادیب ملک کی بیکاری و مکاری سے حکومت اور سماج کو آگاہ کئے جا رہے ہیں ملک کی بہتری کے لئے راستے بنائے جا رہے ہیں نثر و نظم دونوں کے ذریعے سے مختلف خرابیوں کو ارباب حل و عقد کے سامنے سیاسی سے پیش کئے جا رہے ہیں انسانیت کی ہمدردی کی رار فکریں کئے جا رہے ہیں بلکہ اب تو اس کا ایک نمایاں رجحان یہ بھی ہو چلا ہے کہ جس کو اس طرح سمجھا یا جا سکتا ہے کہ۔

"سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے"

حقیقی ادیب اور سچے شاعر کی طرح دنیا کے کسی گوشے میں تباہی یا ہلاکت کے آثار دیکھ کر چیخ اٹھتے ہیں ظالم کی مذمت اور مظلوم کی حمایت میں رار کچھ نہ کچھ کہتے رہے ہیں کوریا، مراقش، ایران، مصر، جہاں کہیں بھی جنگ یا جارحانہ کارروائی دیکھتے ہیں اپنے طور پر اظہار خیال کرتے ہیں۔ گویا ان کی محنت کا شعور بلند ہو رہا ہے۔ ہمیشہ سے زیادہ وسیع النظری بڑھ رہی ہے ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم کی تیاری میں وہ ساری دنیا کو خطرہ میں تصور کر کے اس کی تلفیں اور جنگ کی خرابیوں اور تباہ کاریوں کی روک تھام کی رار فکر کر رہے ہیں بے شمار نظمیں اور افسانے اس بات کی تائید ہیں

پاکستان میں بھی اردو کو وہ سرپرستی نہ حاصل ہو سکی جس کی امید تھی انفرادی و ذاتی حیثیت سے جو کچھ اس سلسلے میں ہو رہا ہے وہ قابل اطمینان تو نہیں ضمیمت ہے وہاں کے بھی شعراء اور نثر نگار اپنے طور پر اردو ادب کی اشاعت کی فکر کرتے

ہیں مختلف ادارے اس کو آگے بڑھانے کی فکر میں رہتے ہیں ادب کو دولتمند
و ہمہ گیر بنانے کا خیال ان کو بھی ہے اس سلسلے میں ڈاکٹر عبدالحق صاحب کی خدمات
بڑی وقیع و قابل قدر ہیں وہ اپنی دھن میں رات دن ایک کئے ہوئے ہیں تن
من دھن سب کچھ اردو کی نذر کر چکے ہیں لیکن حکومت حسب خواہش امداد سے دریغ
کرتی ہے اس نے کبھی کوئی سرکاری کمیٹی ایسا مقرر نہیں کیا جو تمام ملک میں دورہ
کر کے مختلف زبانوں کا جائزہ لے اردو کو مالدار بنانے کی فکر کرے کوئی انجمن
ابھی تک ایسی نہیں ہی جو غیر زبانوں کی اصطلاحات کا مترادف بنائے یا ترجمہ
کرے، نہ طریقہ تعلیم کو اردو زبان رائج کرنے کا خیال ہوا، کاش یہ سب باتیں اور
ان کے علاوہ بہت سی اور باتیں حکومت کے سامنے آتیں اردو کو ترقی دینے کے
لئے مختلف انجمنیں بنائی جاتیں جو غور کرتیں کہ اردو کو مکمل زبان کے مراتب عطا کرنے
کے لئے کن مسائل کا حل کرنا ضروری ہے

پاکستان ایک نئی حکومت ہے اس کے مختلف حصوں میں مختلف زبانوں
کے بولنے والے بستے ہیں اب وہ نئی حکومت میں ایک کئے جا رہے ہیں لیکن تمدن
اور زبان کا فرق اختیاری حیثیت رکھتا ہے اپنی مادری زبان کے محاورے
کہاوتیں لوگ اردو میں شامل کرتے جاتے ہیں گو اردو ابتدائے آفرینش سے
ان باتوں کی عادی ہے اس کا خمیر ایسے ہی اجزا سے بنا ہے لیکن اب چونکہ
صدیوں کے بعد اردو ادب کا سانچہ مکمل ہو چکا ہے وہ آنے والے اجزا کو ایسے
طور پر تراش خراش کر ادب میں جگہ دے گا۔ ایسے معیار سے آنیوالے ذخیرے
کو دیکھے گا لیکن پھر بھی امید یہ ہے۔ کچھ دن تک معیاری ادب کو بے راہ روی
محسوس ہوگی نئے الفاظ، نئے اندازِ بیاں کو ایک عرصہ لگے گا کہ وہ مانوس ہو سکیں
اور ان کو ادب میں جگہ مل سکے

دہلی اسکول اور لکھنؤ اسکول نے ایسے وقت میں محکمہ احتساب کا بھی کام کیا۔ زبان کو ایک راستے پر لگانے میں ان دونوں اسکولوں نے بڑی بالغانہ اور دوراندیشی سے کام کیا تھا مستند ادیبوں کی رائے اور کلام کی سند کے بغیر الفاظ و محاورات کا ادب میں جگہ پانا ناممکن تھا اس کا ایک نتیجہ یہ بھی بہت عمدہ ہوا کہ ایسی ڈھلی ایسا راگ نہ ہونے پایا۔ ادب کے لئے ایک شاہراہ ہوگئی قلیل عرصہ میں اردو کی ایک ایسی صورت نکل آئی جس کو ہمہ گیری حاصل ہوئی ادبی اختلافات باعث رفع نہ ہوسکے لیکن اب پاکستان میں کوئی اس قسم کا اسکول نظر نہیں آتا اردو کے مزاج کے لحاظ سے حکومت کو چاہیئے کہ مستند ادیبوں کا ایک ایسا بورڈ بنائے جو آنے والے الفاظ و محاورات کی جانچ پڑتال کرکے ادب میں ان کو داخل کرے لسانی اصل و عوامی پسندیدگی کا خاص خیال رکھے۔ ابھی تک حکومت نے اس طرف بھی توجہ نہیں کی اور نہ دفتروں میں اردو کو وہ جگہ ملی جو ہندوستان میں ہندی کو مل گئی ہے خدا کرے دستور العمل بن جانے کے بعد ارباب حل و عقد کو اردو زبان کی ترقی و ترویج بھی قومی ترقی کے لئے ضروری محسوس ہو